# ''چہارسُو''

## ..... نئے نقاد کے نام خطوط .....

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نثر کی معروف اصناف: انشائیہ، افسانہ، سفرنامہ، ناول، روزنامچہ کو اظہار کا ذریعہ بناتے آرہے ہیں لیکن ان کی شخصیت اپنی مرکزی شناخت کے لیے تنقید ہی کو نشان زد کرتی ہے- واضح رہے اس ضمن میں ترجیح کی مناسبت سے ان کا وقیع تنقیدی سرمایا خود متکلم ہے- گویا یہ تعین کسی بیرونی تجزیے کا مرہون منت نہیں- ڈاکٹر صاحب کی حال ہی میں طبع ہونے والی تصنیف ''نئے نقاد کے نام خطوط'' ی ادبی حلقوں میں اس لیے بھی موضوع گفتگو بن رہی ہے کہ انھوں نے تنقیدی مباحث کو مکتوب نگاری کی تکنیک میں بیان کیا ہے- اگرچہ فکری جہات پہلے بھی مشاہیر کے ہاں مکاتیب کا نفس مضمون بنتی رہی ہیں لیکن ناصر عباس نیر صاحب نے عہد موجود میں یہ اختصاص اپنے نام کیا ہے کہ ان تمام (تینتیس) خطوط میں خالص علم تنقید کی فکری روح کو ''افکار تازہ'' سے مشروط کر کے پیش کیا ہے- یہ صورت حال اس لیے بھی انفراد کی ترجمان ہو جاتی ہے کہ رواں زمانہ مکتوب نگاری کو تیزی کے ساتھ ماضی بنا رہا ہے- سو، وہ سے دور نہیں جب لوگ باگ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے مابین تعلق کی مہک کو یکسر اجنبی گمان کرنے لگیں گے- یہ درست ہے کہ ڈاکٹر ناصر عباس نے بھی ان مکاتیب میں اپنے مخاطبین کو 'اسم معرفہ' میں محدود نہیں کیا- یوں اس طرف کو کھلا رکھ کر کے ہر قاری کی خاطر ایک گنجایش پیدا کر دی گئی ہے کہ وہ خود کو خط کا مخاطب فرض کر سکتا ہے- فی الاصل یہی وہ رخ ہے جو مذکورہ کتاب کو ممتاز کرتا ہے کہ دو افراد کے بیچ موثر ہمدردی بلکہ محبت کا عنصر افہام و تفہیم کی نئی فضا تخلیق کر سکتا ہے- نج میں ملفوف اس زاویے کو وسیلہ بناتے ہوئے ہی رسمی علمی کثافت کو منہا کر کے لطافت میں منقلب کیا جا سکتا تھا- اس کتاب نے یہ مضبوط bond تشکیل دے کر پڑھت کو آسانی کی بجائے کشادگی فراہم کی ہے-

''نئے نقاد کے نام خطوط'' کا مطالعہ کرتے ہوئے محولہ تجسس چند صفحات تک برقرار رہا کہ مصنف اس مسئلے سے کیسے عہدہ برآ ہوتے ہیں؟ لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ان کی ذہانت نے اسے الجھاؤ نہیں بننے دیا- ایک تو انھوں نے موعظت کی مقدار عمداً" بہت کم رکھی ہے- دوسرے یہ کہ وہ اپنے بنیادی مقدمے سے کہیں دستبردار نہیں ہوئے، جس کے مطابق سوچ کے سچ کو اصولی تفوق حاصل رہے گا- مطلب یہ کہ انھوں نے جذبات کی یورش سے کمک پا کر مخاطب کے گرد محاصرہ تنگ نہیں کیا- اسے آزادی کے حق سے محروم نہیں کیا- اس طرح اپنا عندیہ بیان کرتے ہوئے حقانیت کو آسانی کہہ کر نفسیاتی دباؤ نہیں ڈالا بلکہ اسے سوچنے/سوچتے رہنے کی دعوت دی ہے-

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی کتاب کا سرنامہ شاہد ہے کہ اس میں نقاد کے منصب کا دفاع ناگزیر خیال کیا گیا ہے- اس لیے کہ ان کی نگاہ میں تنقید عصبیت کے باعث فگار ہو رہی ہے- انھوں نے یہ جانا کہ تنقید سے متعلق طنز و تضحیک کے تیر برسائے جا رہے ہیں- یہ عمل تنقید سے وابستہ بصیرت کی راہ روکنے کے مترادف ہے- تنقید تو علمی تازگی کی ضامن ہے- اگر اس نوع کا پروپیگنڈا جاری رہا تو متشددانہ رویوں کو بڑھاوا ملے گا- یوں سوقیانہ اسلوب میں تنقید کو ہدف بنانا غاصب اور طاقت کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہوگا:

''تنقید کو بہ طور صنف ادب پسپا کرنا، ایک معمولی بات نہیں کہ جسے نظر انداز کرنے کے ہم سب متحمل ہو سکیں۔۔۔ کسی سماج سے تنقیدی فکر کے خاتمے کا خواب، اس سماج میں سیاسی ہی نہیں، سماجی آمریت قائم کرنے والا ہی دیکھ سکتا ہے''

ڈاکٹر صاحب کے ان لفظوں میں کھرا لہجہ ضرور ہے مگر تنقید کی معنویت کا اثبات کرتے ہوئے انھوں نے جارحیت سے اپنا دامن بچایا ہے وگرنہ ڈیفینس میں اوفینس چھپ کر وار کرنے کا پرانا عادی ہے- انھوں نے غیر جذباتی ہو کر یہ ذہن نشین کرانا چاہا ہے کہ تخلیق اور تنقید/ نقاد اور تخلیق کار کے درمیان عداوت/ رقابت کا رشتہ نہیں، یہ ایک دوسرے کے حریف نہیں حلیف ہیں-

جناب ناصر عباس نیر نے اپنی اس کتاب میں اردو تنقید کو نامانوس اور مختلف بحثوں کی وساطت سے وہ منہاج دینے کی آرزو کی ہے جس کی روایت کو مدرسانہ انتقاد تو کیا رائج الوقت تنقیدی دبستانوں میں بھی نہیں ڈھونڈا جا سکتا- ہاں! اگر کچھ دستیاب ہے تو اشارات کی صورت میں-

صاحبو! خطوط کے اس مجموعے میں جذب ہونے والے مندرجات نے اپنے لیے جس دلآویز سبک کا اہتمام کیا ہے، وہ وقت کو اضافی کر کے محویت اپنے نام کر لیتا ہے- سو، جسے یہ 'خسارا' قبول ہے، وہ اس کتاب کی خواندگی کا ''رسک'' لے سکتا ہے!!!

..... اسلم ملک

زندگی کے ساتھ ساتھ

# چہارسُو

جلد۳۲،شمارہ:جولائی،اگست۲۰۲۳ء

بانی مدیرِاعلیٰ

سیدضمیرجعفری

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِسالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیرمسؤل

گلزارجاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بیناجاوید

فاری شا

محمدانعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

رابطہ:537/D-1،گلی نمبر18،ویسٹریج-III،راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:8730433-8730633-51-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

# ۔ متاعِ چہارسو ۔


سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد عبداللہ

**قرطاسِ اعزاز**

شفاف آئینہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔احمد علی برقی اعظمی ۵
جگنوؤں کی تلاش میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلمیٰ صنم ۶
بیاں اپنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۷
عکس (افسانہ)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نگار عظیم ۱۰
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۲
نگار خانۂ دل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۲۳
محبتوں کا پیکر (خاکہ)۔۔۔ڈاکٹر شمع افروز زیدی ۲۶
نگار عظیم کے چند افسانے۔۔۔پروفیسر علی احمد فاطمی ۲۸
ممتا کی مورت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نورالحسنین ۳۳
مادری زبان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر مولا بخش ۳۸
معجزہ یہ بھی دکھایا میں نے۔۔۔۔۔۔۔۔۔نسیم سحر ۴۲
گئی رُتوں کا فسانہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔معین شاداب ۴۵
زندگی کیا ہے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شاہد انوار ۴۸
حادثے یونہی نہیں ہوتے (افسانہ)۔۔۔۔نگار عظیم ۵۰
میرا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نگار عظیم ۵۳

**بولتے چہرے**

عکسی منظر نامہ ۵۵

**جمالِ مدینہ**

نسیمِ سحر، افق فریدی ۵۷

**افسانے**

غم گسار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آغا گل ۵۸
اپاہج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صادقہ نواب سحر ۶۲
بچے ہمارے عہد کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رینو بہل ۶۴
تھکن کا سفر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ناصر علی سید ۶۶
بے گھری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسرار گاندھی ۶۷

**شوق وصال**

پروین شاکر، ولی عالم شاہین، نسیم سحر، قیصر نجفی، ناصرہ زبیری، اشرف جاوید، خورشید طلب، طارق نعیم، ڈاکٹر ریاض احمد، نوید سروش ۶۹

**افسانے**

کالی اندھی، مصنف اور نجومی۔۔۔ڈاکٹر اختر آزاد ۷۴
بند گلی کا مسافر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آصف عمران ۷۹
بندے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۸۳
مٹی کی دیوار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مشتاق احمد مشتاق ۸۴
منزلِ حیات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔معین عثمانی ۹۰

**خوشی کے قصیدے**

ارشد سعید، تصور اقبال، شاہد کمال، مشتاق عاجز، ثروت رضوی، شاہد رضوان، طارق تاسی، نور افشاں، مادھو کوشک، شازیہ اکبر، وشال کھلر، شاداب انجم، ذکی طارق بارہ بنکوی، محبوب اصغر۔ ۹۱

**ناول**

خاکِ شفا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پیرزادہ آلِ انوار ۹۶

**حدیثِ شوق**

شورش کاشمیری، فریدی صدیقی مصباحی، فرخندہ شمیم، جاناں ملک، انور ظہیر، حافظ محمد احمد۔ ۱۰۵

**نشانِ راہ**

اردو ادب، ماحولیاتی تناظر۔۔۔۔جمیل احمد عدیل ۱۱۰

**بساطِ بشاشت**

گرینڈ مدر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رضیہ اسماعیل ۱۱۲

**ایک صدی کا قصہ**

نسیم بانو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۵

**رس رابطے**

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہ الوقار ۱۱۹

قرطاسِ اعزاز

نگار عظیم

کے نام

## شفاف آئینہ

نگار عظیم کی تخلیق خود ہے اُن کی شناخت
ہے مثل آئینہ شفاف اُن کی اپنی ذات

نگارشات سے ظاہر ہے کرب اُن کا
ہیں اُن کے شعروادب میں نمایاں سب پہ جہات

حقیقتوں کا ہیں اظہار اُن کے افسانے
خواص کی نہیں کرتی ہیں وہ عوام کی بات

وہ گردو پیش کا کرتی ہیں تجزیہ اپنے
وہ چاہتی ہیں ملے رنج وغم سے سب کو نجات

بلند کرتی ہیں اپنے ضمیر کی آواز
یہی ہیں طرز نگارش کی ان کے اپنے صفات

ہے افتخار مجھے میں نے ان کو دیکھا ہے
سنی ہے ان کی زبانی خود ان کی اپنی بات

ہے نظم و نثر پہ یکساں عبور اُنہیں برقیؔ
نصیب سب کو ہوں اُن سے فیوض اور برکات

احمد علی برقیؔ اعظمی
(دہلی)

# جگنوؤں کی تلاش میں

سلمیٰ صنم
(بنگلور)

اصلی نام: ملکہ مہر نگار
تعلیمی نام: مہر نگار
قلمی نام: نگار۔عظیم صاحب سے شادی کے بعد نگار عظیم کہلائیں۔
پیدائش: ۲۳۔ستمبر ۱۹۵۱ء، میرٹھ اتر پردیش۔
والد: مشہور شاعر ماہر عروض ثروت حسین ثروت
والدہ محترمہ: یاسمین بیگم۔
شوہر مرحوم: عبدالعظیم صدیقی
(آرٹسٹ، تکنیکی قلمکار، صحافی اور ایڈیٹر، کئی کتابوں کے مصنف)

ابتدائی تعلیم میرٹھ کے اسکول سے حاصل کی بعد میں ایم اے۔فائن آرٹس، ایم اے اردو، پی ایچ ڈی ان اردو (منٹو کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ) کی ڈگریاں حاصل کیں۔

## شاعری کی ابتدا

طالب علمی کے زمانے سے کی پھر افسانہ نویسی کا رخ کیا اور پہلا افسانہ ۱۹۷۴ء میں شانِ ہند دہلی میں شایع ہوا۔اس کے بعد کئی لازوال افسانے تحریر کئے۔

## تصانیف

۱۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''عکس''
۲۔ دوسرا افسانوی مجموعہ ''کہن''
۳۔ تیسرا افسانوی مجموعہ ''عمارت''
۴۔ سفرنامۂ تاشقند ''گردآواردگی''
۵۔ تنقید۔۔۔''منٹو کا سرمایۂ فکر وفن''۔پی ایچ ڈی مقالہ سے الگ ہے
۶۔ ''بہادر شاہ ظفر شخصیت وشاعری'' مونوگراف
۷۔ ''ہرچرن چاولہ فن اور شخصیت'' (مرتبہ)
۸۔ انتخاب کلام ثروت میرٹھی (والد، کا کلام مرتب کیا ہے)
۹۔ ''وہ جو کہہ گئے'' (مرتبہ) مضامین عبدالعظیم صدیقی
۱۰۔ ''علم البیان'' (مرتبہ) والد ثروت میرٹھی کے مضامین
۱۱۔ ''یادوں کے جھروکے'' (مرتبہ) ''بنات'' کی پہلی کتاب
۱۲۔ شعری مجموعہ ''موسم'' زیر طباعت ہے
۱۳۔ عبدالعظیم صدیقی ''عکس زندگی کے'' مرتب زیر طباعت ہے۔

ایک عرصہ دہلی ایڈمنسٹریشن کے سکول میں ڈرائینگ ٹیچر رہنے کے بعد اب ملازمت سے سبکدوش ہوکر اپنے پانچ بیٹوں کامران عظیم، سبحان عظیم، تیمور عظیم، عدنان عظیم، حسن عظیم کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کررہی ہیں۔کامران پینٹر ہیں، سبحان ایکٹر، تیمور ریئل اسٹیٹ ڈیولپر، عدنان آرٹسٹ اینڈ ویڈیو گرافر، حسن آرٹ ڈائریکٹر۔تاہم نگار عظیم صاحبہ اب بھی اردو ادب کی خدمت پر مامور ہیں۔

کئی ادبی تحریکوں سے جڑی ہیں بنات نام کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی صدر ہیں جس کے ذریعہ اردو کو ہر جگہ پھیلانے اور خواتین اہل قلم کو جوڑے رکھنے کا عزم رکھتی ہیں۔ہر لحہ فعال شخصیت ہیں۔دن رات شاہین باغ کا حال احوال ایک جرنلسٹ کی طرح فیس بک پر اور ٹوئیٹر پر وائرل کرنے کا کارنامہ بھی انہی کے سر جاتا ہے۔ان پر اب تک متعدد مضامین لکھے گئے ہیں جن میں سے فکشن نگار نورالحسنین، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر احتشام الدین، انجم عثمانی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر مولا بخش، شمع افروز زیدی، نسیم سحر اور معین شاداب وغیرہم ۔

کئی افسانوں کا ہندی، انگریزی پنجابی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ان کے علمی وادبی کام پر دو یونیورسٹیوں سے ایم فل کی ڈگریاں عطا ہو چکی ہیں۔

ایک طالبہ نے حیدرآباد سے ان کی افسانہ نگاری پر ایم فل کیا ہے۔

دوسرا ایم فل چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی سے ہوا ہے۔

## اس رزق سے موت اچھی

ہندوستان میں لوگوں نے سرکس کمپنی والوں کے خلاف ایک مہم چلائی کہ یہ جانوروں پر بہت ظلم وتشدد کرتے ہیں اور انہوں نے احتجاجاً سرکس جانا چھوڑ دیا اور یوں سرکس انتظامیہ کو نقصان ہونا شروع ہوا تو ان کے سدھائے جانوروں کو مجبوراً سرکس سے نکالنا پڑا کیونکہ انہیں گوشت اور چارہ بھی کھلانا پڑتا تھا۔

کلکتہ کے ایک سرکس کمپنی نے اپنے دس شیر اور تین ہاتھی ٹرک پر چڑھا کر بنگال کے جنگل میں چھوڑ دیئے چند دن بعد معلوم ہوا کہ ان دس شیروں میں سے سات شیروں کو جنگلی کتے کھا گئے۔

آپ حیران ہو رہے ہونگے مگر یہ حقیقت ہے کہ ان شیروں کو بنا بنایا تیار گوشت کھانے کی عادت تھی، وہ اپنا اصل کرتب یعنی شکار کرنا بھول گئے تھے، دوسری طرف وہ کتے جنہیں معلوم تھا کہ ہم بھوک سے مر جائیں گے مرنا تو ہے ہی کیوں نہ اکھٹے ہوکر شیروں کا شکار کرلیں اور یوں انہوں نے سات شیروں کا شکار کرلیا۔

# بیاں اپنا

## عطیہ سکندر علی
(سکھر)

۲۶۔جنوری۱۹۹۷ء

کراچی

نگارصاحبہ،تسلیمات۔

آپ کا تجزیاتی مطالعہ ہر پہلو سے مثالی تنقید کا کارنامہ ہے جس میں آپ نہ صرف منٹو پر لکھے گئے مقالات کا خلاصہ پیش کیا ہے بلکہ جچا تلامحاکمہ کیا ہے اور منٹو کے اپنے تنقیدی افکار کو بھی زیر بحث لائی ہیں جس سے اس کے تخلیقی ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اوراس کے اہم افسانوں کا ژرف بینی سے تجزیہ کیا ہے۔

آپ کے سامنے تو متنوع تاریخ وتنقیدی مواد تھاوہ آپ کو بھٹکا بھی سکتا تھا اور ذہنی پراگندگی میں مبتلا بھی کرسکتا تھالیکن سب سے زیادہ مجھے جس بات نے متاثر کیاوہ آپ کے فکرونظر کی پختہ کاری ہے کہ آپ موضوع کے پہلواور ہر نقطے کو جانچتی اوراس پر بڑے اعتماد سے حکم لگاتی ہیں۔یہ تنقیدی مطالعہ محض متعلمانہ کاوش نہیں عالمانہ تصنیف ہے۔اوراس کامقام افسانوی ادب کی تاریخ میں محکم اور محفوظ ہے۔

شان الحق حقی

۲۲۔اگست ۲۰۰۶ء

دہلی

عزیزہ نگار عظیم،خوش رہیے!

میں کوئی دو ڈھائی ماہ ملک سے باہر رہا اب لوٹا ہوں تو آپ کی کتاب ''عکس'' ملی۔ بہت شکریہ۔ میں نے آپ کی بیشتر کہانیاں پڑھ لی ہیں۔آپ اتنی فراواں اور بے دھڑک ہیں کہ آپ کے مستقبل سے بہت سی امیدیں بندھنے لگتی ہیں۔کبھی ملنا ہو پایا تو آپ کے فن کے تعلق سے تفصیلی باتیں ہوگی۔

جوگندر پال

یکم جولائی ۲۰۰۶ء

احمد آباد

عزیزی نگار عظیم،دعائیں۔

سفرنامہ ملا۔ ایک ہی نشست میں پڑھ گیا۔ بڑی پیاری رواں زبان لکھی ہے۔ بہت باتیں بڑی کھری اور سچی لکھی ہیں۔کاش ترقی پسند بھی وہ چیزیں دیکھ سکتے جو آپ نے دیکھی ہیں۔کھانے البتہ آپ نے بہت لذیذ نہیں کھلائے۔ میز پر بھی مجھے موٹے موٹے نان ہی نظر آئے۔شیر مال لیجیے یا باقر خانی یا پراٹھا۔ لیکن ان میں وہ بات کہاں جو ہماری روٹیوں میں ہوتی ہے۔

تصویریں سب اچھی آئی ہیں لیکن کچھ ہندوستانیوں کی تصویروں کی کمی کھٹکتی ہے۔ ہوتیں تو پتہ چلتا کون کون ،کیا کیا کرتے ہیں۔ بہرحال ناگفتہ بہ حالات میں گفتنی درج گزٹ کیا۔

وارث علوی

۱۵۔جون۱۹۹۹ء

تاشقند

محترمہ نگار عظیم صاحبہ،سلام ورحمت۔

آپ جب کہانیاں لکھتی ہیں تو انسانی سماج اورانسانی سیرت دونوں کے ناسوراورنہاں خانے آپ کے تخیل میں روشن ہوتے ہیں۔متوسط طبقہ کی شائستہ،معنی خیزلیکن فشارآلود زندگی آپ کا خاص موضوع ہے۔آپ عصمت چغتائی کی طرح اپنے ماحول اورزندگی کی سچائیوں کواس طرح ڈوب کر تیکھے شفاف اور بیباک لہجہ میں بیان کرتی ہیں کہ بعض لوگ سوچتے ہیں ''وہ کہانی نہیں لکھتیں خود کہانی انہیں لکھتی ہے'' اس میں جزوی سچائی ہوسکتی ہے کہ ہر مصنف اپنی تخلیق میں کہیں نہ کہیں ضرور چھپا ہوتا ہے۔آپ کا بیانیہ اتنارواں، جانداراور پرکار ہےاورآپ زندگی کی لہروں کوالفاظ اور سب جملوں کے آہنگ میں اس طرح رچاتی ہیں کہ قاری بے خود ہوکر بہہ جاتا ہے۔ زبان اورفنِ اظہار پرایسی قدرت شاید آپ کواپنے خاندان سے ورثہ میں ملی جہاں بچپن سے ہی آپ نے شعروادب کے لہکتے گاتے ماحول میں سانس لی اور پھراسی شگفتہ ماحول نے آپ کے شعور وجدان کوایک حرکی اور تخلیقی توانائی عطا کی۔امید ہے کہ آپ کی تمنا کادوسرا قدم اردو کہانی کو بھی ایک نئے منظر سے روشناس کرائے گا۔

قمر رئیس

۱۳۔نومبر۲۰۰۷ء

لکھنؤ

عزیزہ نگار عظیم،سلام مسنون۔

سیمینار کی ملاقات تو رواروی میں رہی مگر تفصیلی ملاقات آپ کی کتاب ''گردآوارگی'' میں ہوئی۔میرے نزدیک اچھی نثر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قاری سے اپنے آپ کو پڑھوالے۔آج صبح شتابدی ایکسپریس سے روانہ ہوا اور ساڑھے بارہ بجے جب لکھنؤ پہنچا تو کتاب تو ختم ہو چکی تھی مگر مزید پڑھنے کی خواہش باقی رہ گئی تھی۔آپ نے صرف معلومات ہی فراہم نہیں کی ہیں بلکہ اپنے اسلوب نگارش سے بہت سے دیکھے بھالے اور''ان دیکھے'' کرداروں کو زندہ جاوید بھی کردیا ہے۔آپ کے بہت سے افسانوں سے ملاقات پہلے ہوئی تھی اور آپ سے بعد میں۔ جے پور کی ملاقات اور عرفان صدیقی مرحوم کے ایک شعر پرآپ کے توصیفی ردعمل کی یادیں بھی تازہ ہیں۔

ملک زادہ منظور احمد

۱۳۔جون۲۰۰۶ء

الٰہ آباد

بہت اچھی بہن نگار عظیم صاحبہ،السلام علیکم۔

میں یقیناً خطاوار ہوں، سزا کا مستحق ہوں۔ آپ جو بھی سزا دیں گی قبول و منظور۔۔۔ صرف جواب نہ دینے کی سزا مت دیجیے گا!

کچھ تو کام کی مصروفیت اور کچھ رمضان، یوں کہیے کاہل ہو کر رہ گیا ہوں۔ روز ارادہ کرتا ہوں، روز رات کے گہری ہونے کا انتظار کرتا ہوں اور کام کاج سب بھول جاتا ہوں۔ آپ سوچ رہی ہوں گی کہ صاف دل سے یہ کیوں نہیں قبول کر لیتا کہ بڑھاپا طاری ہو رہا ہے۔۔۔ مگر آپ نے یہ بھی تو پڑھا ہوگا کہ ''فنکار کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔۔۔ ہاں سست اور کاہل ضرور ہو جاتا ہے۔''

آپ کی صحت کیسی ہے؟ خود سے لاپرواہی مت برتیے، ورنہ اب تو دہلی اکادمی کے لوگ بھی پریشان ہو جائیں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔۔۔ ارے ارے میں سمجھ گیا آپ کا جواب۔۔۔ ارے نہیں بھئی میں نے جو بھی لکھا ایسے نہیں لکھا، ارادے اور خلوص کے ساتھ لکھا۔۔۔ چاہو تو حلفیہ بیان دینے کو تیار ہوں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی

۹۔ ستمبر ۲۰۰۶ء
دہلی

محترمہ نگار عظیم صاحبہ، سلام و رحمت۔

آپ کی کہانیوں کے واقعات اپنے اندر ایک طوفانی زور رکھتے ہیں اور گزرنے کے بعد قاری کے ذہن میں اپنے زور کا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ پڑھتے وقت وہ ہلکا سا چونکاتے ہیں اور پڑھ لینے کے بعد رفتہ رفتہ اپنے کو ذہن پر نقش کر دیتے ہیں۔ یہ اثر آپ کم بیانی کے ذریعہ قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ بہت خوبصورتی سے یہ کہانیاں معاشرتی سوالات لے کر اس لمحے کے بعد ابھر آتی ہیں جب وہ ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔

جنسی موضوعات پر لکھتے وقت آپ نے اس جرأت سے کام لیا ہے جو ہر سچی بصیرت کا حصہ ہوتا ہے اور انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں سے خود اخلاق، قدر اور شعور کے چشمے جاری ہوتے ہیں۔

پیغام آفاقی

۱۲۔ جون ۲۰۰۶ء
تاشقند

محترمہ نگار عظیم صاحبہ، آداب و احترام۔

چند سال قبل خزاں کے دن تھے جب آپ تاشقند میں تشریف لائیں تھیں۔ آپ نے غزلیہ کلام سنایا جن میں دو غزلوں کا میں نے ازبکی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔

آپ کا سفر نامہ ''گردِ آوارگی'' بذاتِ خود ایک عمدہ تحریر ہے جس میں دلچسپی کے ساتھ معلومات بھی بھرپور ہیں۔ ازبکستان اور ہندوستان کے درمیان بڑھتے ہوئے تعلقات میں ادیبوں کے باہمی روابط ایک اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ اور آپ کی تخلیقات اس دوستی کو بڑھانے، مضبوط بنانے میں مفید ثابت ہوگی۔

ہم سب کو مبارک ہو!

انصار الدین ابراہیم

۵۔ مئی ۲۰۰۶ء
دہلی

نگار عظیم صاحبہ، دعائیں۔

''آپ کی نظر اتنی تیز ہے کہ آپ سماج کی اُن حقیقتوں تک پہنچ جاتی ہیں جہاں آپ کے بہت سے ہم عصر افسانہ نگار نہیں پہنچ پاتے۔ آپ نے انسانی خصوصاً خواتین کی نفسیات کا بہت گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہے، آپ کے افسانوں میں اسی مطالعہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ آپ انتہائی سادہ اور سلجھے ہوئے انداز میں بہت اہم اور نازک مسئلے کو اپنے افسانوں میں بیان کر جاتی ہیں۔ آپ نے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ایک الگ راہ اختیار کی ہے جو مستقبل میں آپ کی شناخت قائم کرے گی۔''

پروفیسر ابن کنول

۳۔ جنوری ۲۰۰۷ء
فتح پور

محترمہ نگار عظیم صاحبہ، سلام مسنون۔

''گردِ سفر'' کی کاپی ملی۔ بعد از عشاء کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو نصف کتاب پڑھ کر ہی سو سکا۔ عام طور پر جو سفر نامے ہوتے ہیں یہ سفر نامہ ان معنوں میں مختلف ہے کہ آپ نے اسے افسانوی انداز میں لکھا ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی منظر کشی بڑے خوبصورت پیرائے میں کی گئی ہے۔ نہایت ہی محتاط انداز میں دونوں ملکوں کی تہذیبوں کا موازانہ کیا گیا ہے جہاں آپ نے ملک عزیز کا ذکر کیا ہے وہاں جذبات غالب آ گئے ہیں۔ حب الوطنی ہمارے ایمان کا حصہ ہے:

نہ کچھ ایران ملتا ہے، نہ ترکستان ملتا ہے
نہ بنگلہ دیش ملتا ہے، نہ پاکستان ملتا ہے
وفاؤں کا ہماری تم بھلا کیا امتحاں لو گے
ہمارے خون کے قطروں میں ہندوستان ملتا ہے

نذیر فتح پوری

۱۴۔ جون ۲۰۰۶ء
اورنگ آباد

بہت اچھی بہن نگار عظیم، السلام علیکم۔

''گردِ آوارگی'' ملا یقین جانیے ازبکستان دیکھنے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگیں۔ آپ نے اس قدر رواں اور باریکی سے ایک ایک بات لکھی ہے کہ لطف آ گیا بلکہ آپ جو دیکھ رہی تھیں لگتا تھا آپ کی آنکھوں سے میں بھی وہی سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ یہ سفر نامہ محض سفر نامہ نہ ہوتے ہوئے ازبکستان کی تاریخ،

# ''چہارسُو''

جغرافیہ، حالات، معاش اور معاشرتی زندگی بھی آئینہ بن گئے۔

نورالحسنین

۱۷۔ستمبر ۲۰۰۷

دہلی

محترمہ نگار عظیم صاحبہ، السلام علیکم۔

ستمبر کے ''ایوانِ اردو'' میں آپ نے بزرگ افسانہ نگار جناب جوگندر پال کا جو عجیب وغریب تعارف کرایا ہے وہ بہت اچھا لگا اور میرے دل کو چھو گیا۔ ایسا انوکھا تعارف میں نے آج تک نہیں پڑھا۔ اس سے پہلے جولائی کے ''ایوانِ اردو'' میں آپ کا افسانہ ''طنابیں'' پڑھا تھا آپ کو میں ''ایوانِ اردو'' سے ہی جانتی ہوں۔ ویسے میں ''شمع''، ''بانو'' کی خریدار رہی ہوں اور ''بیسویں صدی'' کی بھی۔ یہ رسالے بند ہو گئے خاص کر ''بیسویں صدی'' کے بند ہونے کا بہت افسوس ہے۔ آپ ہمیشہ ایسے ہی لکھا کیجیے۔ آپ کے دو لفظ بھی میرے لیے قیمتی تحفہ ہوں گے۔

نسیم اختر

۱۹۔اپریل ۲۰۰۴ء

دہلی

نگار بہن، السلام علیکم۔

آپ کے افسانے ''آج کل'' اور دوسرے موقر رسالوں میں پڑھنے کے بعد بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حالات وواقعات پر آپ کی گہری نظر ہے۔ ایک لحاظ سے آپ کے افسانوں کو عصری آگہی کا آئینہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ آپ کا ہر افسانہ کسی نہ کسی واقعہ یا مخصوص حالات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے جو قاری پر تاثر کا ایک گہرا نقش قائم کر جاتا ہے۔ آپ کے افسانوں کے عنوان اور ان کی تھیم سیدھے سادے مگر معنی خیز مکالمے اور نشتر کی طرح چبھتا ہوا ان کی اختتامیہ ایک لمحے کے لیے قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہی افسانہ اور افسانہ نگار کی بڑی کامیابی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود ہاشمی

۷۔جولائی ۲۰۰۷ء

مالیر کوٹلہ

محترمہ نگار باجی، سلام ورحمت۔

آپ کی کتابیں ''گہن'' اور ''گردِ آوارگی'' مل گئیں۔ بہت مشکور ہوں کہ آپ نے اس لائق جانا۔ افسانہ ''فرض'' پڑھا۔ آپ کا اپنا رنگ قاری پر گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ عرض مصنف مختصر مگر بہت ہی خوب ہے۔ آپ کا یہ لکھنا ''عورت عورت کے کرب کو زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہے'' حقیقت کے عین قریب ہے۔ یہ کس نے لکھا کہ آپ جنسی کہانیاں لکھتی ہیں۔ تبھی آپ ایک سنجیدہ اور سلجھی ہوئی افسانہ نگار ہیں۔ ایک ایک جملے سے آپ کی ذہانت ٹپک رہی ہے۔ پوری کتاب پڑھ کر اپنا تاثر ارسالِ خدمت کروں گا۔

بشیر مالیر کوٹلی

۲۶۔اکتوبر ۲۰۰۶ء

کٹک

نگار عظیم صاحبہ، سلام ورحمت۔

''گردِ آوارگی'' کے مطالعہ میں، میں آپ اور عظیم صاحب کے سفرِ ازبکستان میں ساتھ ساتھ رہا اور کیف وسرور کی جمالیاتی منزلیں طے کیں۔ بصارت کے تصامح کے باوجود بصیرت کے زینے طے کیے۔ پروفیسر قمر رئیس پر اللہ ہمیشہ مہربان رہا۔ انہیں انتہائی جاذب شخصیت سے نواز کر جمالیاتی ذوق کے ساتھ ساتھ وسائل کی ایسی فراوانی بخشی کہ کئی صاحبانِ جمال کا کوٹا ان کے حصے میں آیا۔

آپ نے نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنا سفرنامہ رقم کیا ہے۔ اس سفرنامے میں ایک طرف جہاں ازبکستان کے قدرتی حسن کی دلکشی کا بیان ہے دوسری طرف وہاں کے لوگوں کی تاریخی مہمان نوازی بھی بے مثال ہے۔ آپ کا بیانیہ اسلوب اس قدر دلکش اور ہر سطر ایسی منظر تراش ہے کہ کتاب ختم ہونے سے قبل ہاتھ سے چھوٹتی ہی نہیں!!

حفیظ اللہ نیولپوری

## پس ورق

نگار نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایک قدیم مذہبی ماحول تھا جس کے اقدار کی جڑیں سترہویں اور اٹھارویں صدی میں تھیں۔ وراثت میں ادب اور مصوری کے ذوق ملے۔ گو کہ قدامت پسندی نے ان میدانِ کارزار میں دوڑنے کی اجازت نہ دی مگر لفظوں اور خطوط سے شناسائی ضرور ہوگئی۔ اس شناسائی نے تخیلات کی دنیا میں بمبئی آرٹ، اجاریہ گریڈ ڈپلوما آرٹ کیا۔ ڈرائنگ میں ایم اے کیا اور مختلف کورسز اور ڈپلومے بطور شغل کیے۔ الفاظ نے زور پکڑا تو افسانے بھی لکھے۔ ماحول بدلا تو میدان عمل کو بیکراں پایا۔ فن اور ادب سے شناسائیاں، دوستی اور پھر عشق میں بدل گئیں۔ خطوط کے عشق کو فوٹو گرافک اسٹوڈیو کھول کر تسلی دی بعد میں ڈرائنگ ٹیچر بن کر اپنے فن کو جاری رکھنا چاہا لیکن الفاظ کی شناسائی نے چین نہ لینے دیا۔ افسانے بھی لکھے اور امورِ خانہ داری بھی سنبھال لی۔ اردو میں ایم اے کیا اور منہ پھٹ منٹو کے فن سے متاثر ہو کر نہ صرف تحقیق میں غوطہ لگایا بلکہ افسانہ نگاری میں ''عکس''، ''مرد''، ''فرق'' اور ''کسک'' جیسے افسانوں کو جنم دیا۔ جن کو نئی نسل کے قارئین نے ادبی، فنی ونفسیاتی گہرائی کا آئینہ دار ٹھہرایا اور قدما نے اردو ادب پر سیاہ دھبہ۔ یہ افسانے اگر آپ کے احساس کے تاروں کو جھنجھوڑتے ہیں اور آپ جوان افسانوں کے قاری ہیں یہ محسوس کرتے ہیں کہ ''ارے'' یہ تو میرا اپنا ہی تاثر ہے تو صحیح ورنہ غلط، فیصلہ آپ پر ہے۔

عظیم صدیقی

- افسانہ -

# ''عکس''

نگار عظیم

اف میرے خدا۔ یہ میں نے کیا دیکھ لیا۔۔۔ میرا وجود پارہ پارہ ہوکر لرزنے لگا ہے۔ دل کی گھٹن بڑھتی ہی جارہی ہے۔۔۔ کاش میں نے یہ سب کچھ نہ دیکھا ہوتا۔ بچپن سے لے کر جوانی کے آخری لمحوں تک کی یادیں میرے ذہن کو جھنجھوڑنے لگیں۔ اس وقت میں کوئی چھ برس کی تھی۔ ایک صبح سوتے میں میری ران پر اتنی زور سے چانٹا پڑا کہ میں بلبلا کر اٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف دیکھا کوئی نہ تھا۔ ابا جان کیاری کے پاس بیٹھے تازہ گلاب دیکھ رہے تھے اور حسب عادت قرآن پاک کی کوئی سورت بآواز بلند پڑھ رہے تھے۔ پوچھنے کی ہمت نہیں کہ کیا ہوا؟ خود ہی خیال کیا کہ غرارہ پہن کر سو رہی تھی شاید سوتے میں اوپر اٹھ گیا ہوگا۔ یہی ابا جان کے غصہ کی وجہ ہوسکتی ہے۔ کتنا غصہ تھا ابا جان کو۔ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ امی جان کو ذرا ذرا سی باتوں پر کس بری طرح سے لتاڑتے تھے اور دوسرے ہی لمحہ ان کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔ جب ابا جان اسکول سے پڑھا کر آتے تھے تو کیا مجال گھر میں ذرا سی بھی کسی کی آواز نکل جائے۔ بقول امی کے ''تمہارے باپ تھکے ہوئے آئے ہیں آرام کی ضرورت ہے'' یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ بچے بھی اسکول سے تھکے ہوئے آئے ہیں کھیلے اور چہکنے کی ضرورت ہے۔

بس رات کو ابا جان کسی نہ کسی نشست میں ضرور جاتے۔ یہ نام میں بچپن سے سنتی چلی آئی ہوں۔ تب ہم سب بہن بھائی مل کر خوب دھما چوکڑی مچایا کرتے تھے۔

بچپن کی وہی شرارتیں۔ دوسروں کے ساتھ ساتھ ابا جان کی چیزیں بھی چپکے چپکے چھیڑنا شروع کیں۔ نہ معلوم ابا کو کیسے پتہ چل جاتا تھا۔ صرف غصہ سے آواز لگتی تو خون خشک ہونے لگتا۔ اور ڈانٹ پڑتی تو ڈر کے مارے پیشاب نکل جاتا کچھ پوچھا جاتا تو آواز ہی نہ نکلتی۔

جوں جوں بچپن جانے لگا توں توں سمجھ آنے لگی۔ ابا جان کی عادتیں کتنی عجیب ہیں یا تو تمام کام خود کریں گے۔ ریڈیو خود ٹھیک کرلیں گے، بجلی کا کام بھی خود ہی کرلیں گے، پریس خود کھول کر بیٹھ جائیں گے، کتنی خوبصورت تصویریں بناتے تھے۔ کتنا خوبصورت ابری کاغذ بنایا کرتے تھے۔ کیا کیا کام کرتے تھے کہ بس۔۔۔ اور دوسری طرف گھڑے سے پانی لے کر بھی خود نہیں پی سکتے۔ ہم بچوں سے کبھی کھیلتے بھی نہیں۔ ہنسی مذاق بھی نہیں۔ اتنی سخت مزاجی کہ ہر بات کا آرڈر۔۔۔ کسی بات میں ناسننے کی عادت تو جیسے تھی ہی نہیں۔

پانچ منٹ بھی کبھی انہیں اپنے اسکول پہنچنے میں دیر نہیں ہوتی تھی اور اگر کبھی پانچ منٹ ہمیں اسکول جانے میں دیر ہوجائے تو سارا محلّہ سر پر اٹھالیں گے۔ سالن میں نمک مرچ تیز ہوجائے تو سالن کا پیالہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر آنگن میں بکھر جائے۔ ہر وقت ہر کام قاعدے کا۔ نپا تلا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ہر وقت رعب ہی رعب۔ پاس بلاتے آرڈر ملتا بیٹھو۔ ہم بیٹھ جاتے۔ کہتے کہو بیس بار جھوٹ بولنا گناہ ہے، زبان میں گندگی پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر کہتے کہو بیس بار دل کی بات نہیں مانتے دل غلط کام کرواتا ہے۔ کس قدر اکتا دینے والا بچپن تھا وہ۔ خدا کی پناہ۔۔۔ آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ ابا جان شاعر ہیں۔ دل چاہا چوری چھپے پڑھیں ابا جان کیا لکھتے ہیں۔۔۔ یقین نہیں آتا کہ اتنے سخت مزاج ابا جان شاعر ہوسکتے ہیں۔ شاعری بھی ایسی کہ آہ۔۔۔ دل تڑپ اٹھے۔۔۔ کیا ابا جان اندر سے اتنے نرم ہیں۔۔۔؟؟ کیا ابا جان کے دل میں بھی اتنے نرم گرم احساسات ہیں۔ بالکل یقین نہیں ہوتا۔۔۔ باہر سے اتنے سخت دکھائی دینے والے ہمارے ابا جان اتنے حساس ہوں گے اور اتنا جذباتی کلام کہتے ہوں گے۔

تو پھر یہ غصہ؟؟ شاید خاندانی چلن۔۔۔

اب پوری طرح ہمارا شعور جاگ اٹھا تھا، اور ابا جان کی پوری شخصیت ہمارے سامنے واضح ہوچکی تھی۔ ابا ہمیں آہستہ آہستہ بہت اچھے لگنے لگے۔ ہر بات میں مردانگی، حسن و وقار، نفاست پسندی، علمیت، اولاد کی پرورش کا ڈھنگ، سبھی کچھ ابا جان میں بڑے نرالے انداز میں موجود تھا۔ ابا کا سارا کام میں خود کرتی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ ابا بھی بہت خوش ہوتے۔ کہتے۔ واہ بیٹا شاباش۔۔۔ بہت اچھا جوتا چمکایا ہے میرا۔۔۔

آہستہ آہستہ ابا کا مزاج بدلتا جارہا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح غصہ نہیں ہوتے تھے۔ اب ابا جان کو کسی بات میں ہماری دخل اندازی بری نہیں لگتی تھی۔ ابا جان یہ کپڑے پہنئے۔۔۔ یہ والا جوتا۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ یہ والا سوئٹر۔۔۔ اور یہ کالا سوٹ اور فلاں خوشبو لگا کر نشست میں جایئے گا آج۔۔۔ لایئے ابا جان۔۔۔ میں کاٹ دوں آپ کے ناخن۔۔۔ بالکل گول کاٹوں گی۔ ذرا بھی کہیں نوک نہیں بچے گی۔ ابا مسکرا کر قینچی تھما دیتے۔

ایک دن ابا کے دوست جنہیں ہم چاچا کہتے تھے، موجود تھے انہوں نے فرمائش کی کہ کوئی تازہ غزل ہوجائے۔ ابا جان شروع ہوئے۔۔۔ آخر میں جب مقطع کہہ رہے تھے تو آخری لائن بے ساختہ میرے منہ سے نکل گئی۔۔۔ بڑے تعجب سے مجھے دیکھا۔ جب چاچا چلے گئے تو پاس بلایا۔۔۔ بولے ذرا دہرانا اس وقت کیا سنایا تھا۔۔۔ مارے ڈر کے کھڑے کھڑے پاؤں کپکپانے لگے۔ ہمت جواب دے گئی۔۔۔ سمجھا کر بولے ''یہ تمہارے پڑھائی کے دن ہیں، فضول کاموں کی طرف توجہ نہ دیا کرو۔''

وقت گزرتا گیا۔ نہ جانے کس جذبہ کے تحت میں نے افسانے لکھنا شروع کیے۔ چپ چاپ طبع آزمائی کرتے کرتے ایک دن وہ آیا کہ چھوٹے

معمولی پرچوں میں وہ افسانے چھپنے لگے۔شوق بڑھتا گیا۔۔۔لیکن ابھی تک اتنی ہمت نہ تھی کہ ابا جان کو دکھا سکوں کہ کیسا لکھا ہے۔ڈر تھا کہیں برسوں کا گیا طوفان پھر واپس نہ آجائے۔اور پھر ایک دن امی نے تذکرہ کر ہی دیا۔۔۔قیامت آگئی۔۔۔سارے پرچے طلب کیے۔۔۔ڈرتے ڈرتے ہم نے وہ تمام پرچے لاکر دے دیئے جن میں ہمارے افسانے چھپے تھے۔

کئی دن بعد بلایا۔۔۔افسانہ لکھنے کی تمام باریکیاں سمجھائیں۔۔۔ اور کہا آئندہ کسی پرچے میں بھیجنے سے پہلے کسی کو دکھا دیا کرو۔۔۔ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔۔۔یہ کیا بات ہوئی۔۔۔؟؟

جیسے جیسے ہمارے قدم جوانی کی دہلیز پر بڑھتے رہے وہی ابا ہمارے آئیڈیل بنتے گئے۔ان کی ہر بات میں آن اور ہر ادا میں شان اور وقار نظر آنے لگا۔ مجھے ابا جان سے اس قدر محبت ہوئی کہ جس کو ظاہر کرنا میرے بس میں نہیں۔۔۔تمام عزیزوں کی مرضی کے خلاف ابا جان نے مجھے سب اولادوں سے زیادہ پڑھنے کا موقع دیا۔ان کی نظر عنایت سب سے زیادہ مجھ پر رہتی تھی۔ابا مجھ سے ہر طرح کی باتیں بے تکان کیا کرتے تھے۔امی ٹوکا کرتیں تو کہتے تھے۔''یہ بیٹی نہیں بیٹا ہے۔ زمانے کی اونچ نیچ اور اپنا تجربہ بتاتا رہتا ہوں۔۔۔تم ٹوکا مت کرو۔

کاش میں بھی ابا کو بتا سکتی کہ میں آپ کو کتنا چاہتی ہوں۔آپ مجھے اپنا آئیڈیل اور میرے تصورات کا مکمل شاہکار نظر آتے ہیں۔آپ ہر فن میں استاد ہیں۔میرا جی چاہتا ہے میں آپ کی تمام خوبیوں کی تعریف کروں۔

عمر کے تیس سال کیسے پر لگا کر اڑ گئے۔سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔وقت اور ماحول بدلتا جا رہا تھا۔ابا کا خاندان طویل ہوتا جا رہا تھا اور امی خوش وخرم ومطمئن نظر آتی تھیں۔ابا کا غصہ اولاد نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں نے ختم کر دیا تھا۔سب ابا کے کندھوں پر چڑھے رہتے تھے۔میری شادی کے بعد ابا بہت غمگین رہنے لگے تھے۔ان کی والہانہ محبت کا ثبوت وہ خطوط ہیں جو وہ مجھے لکھتے رہے ہیں۔اب ابا کمزور ہو چلے تھے۔چوڑا چکلا سینہ نرم پڑنے لگا تھا خود کہا کرتے تھے۔''اب ہم چراغ سحری ہیں'' اور ایک دن ابا کا یہ کہنا درست ثابت ہوا۔ایک ہی ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ابا کی اچانک طبیعت خراب ہوئی۔ پروسٹریٹ کا آپریشن ہونے والا تھا۔سارا گھر مہمانوں سے بھر گیا،ابا مسکرا مسکرا کر سب سے باتیں کر رہے تھے۔گھر میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔جس کو جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گیا۔صرف میں ہی تو رہ گئی تھی۔ابا بھی سو چکے تھے۔ہر بستر پر دو دو تین تین پڑے تھے۔امی کو بھی بچوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔صرف ابا کا بستر خالی تھا۔میں چپکے سے ابا کے لحاف میں گھس گئی اور ان کی پیٹھ سے چپک کر ایسی سوئی کہ ہوش ہی نہ رہا۔۔۔سویرے ابا کلبلائے۔ارے بھئی''یہ میرے پاس کون لیٹ گیا؟''''میں ہوں ابا جی۔''ابا نے چھوٹے سے بچے کی طرح مجھے سینہ سے چمٹا لیا۔میری آنکھیں محبت کے اس لمس سے بھر آئی تھیں۔

آپریشن ہوا— تیسرے دن ابا ہم کو چھوڑ کر چل دیئے۔جس کے تصور سے ہی کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔پاگل ہونے کا گمان ہوتا تھا۔وہ ہو چکا تھا۔

آہ ابا۔۔۔اب میں کس کے لیے لکھوں گی؟ کیسے لکھوں گی؟ کون خوش ہوگا؟ میرے اس ادبی ذوق کے جنم داتا مجھ کو۔۔۔تنہا چھوڑ کر۔۔۔

کئی دن گزر گئے۔ہر پل ابا کی باتیں ہوتی رہتیں۔ابا سب کو خواب میں نظر آتے کسی کو کسی طرح کسی کو کسی طرح۔۔۔میرے دل کی خلش دل میں ہی رہی۔۔۔ابا مجھے نظر کیوں نہیں آتے؟؟ کیا مجھ سے ناراض ہیں۔۔۔؟؟ زیادہ سے زیادہ تلاوت کرتی،درود و دعائیں پڑھتی۔ثواب پہنچاتی۔تصور کر کے لیٹتی۔ابا نظر نہیں آتے۔۔۔کاش میں بھی ابا کو دیکھتی۔۔۔میں تو ابا کے سب سے زیادہ قریب تھی۔بیماری میں بھی،زندگی میں بھی،خوشی میں بھی،غم میں بھی۔ابا نے ایک دن کہا تھا مجھے صرف مہر میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ابا نے ایک خط میں مجھے غزل لکھا تھا۔ابا سب سے زیادہ مجھے چاہتے تھے۔کیسا خوش ہوتے جب ابا کے پاؤں دھلاتی،سر دھلاتی،پھر کیا وجہ ہے؟ وقت گزرتا گیا۔۔۔میری بے چینی بڑھتی گئی۔۔۔ابا۔۔۔کاش۔۔۔ایک بار مجھے بھی نظر آیئے۔۔۔کیسے ہیں؟ کہاں ہیں؟ آپ کی ایک ایک یاد میرے ذہن کے ٹکڑے ٹکڑے کیے دے رہی ہے۔۔۔ابا نظر آئے۔۔۔اف میرے خدا۔۔۔یہ میں نے کیا دیکھ لیا۔۔۔؟؟ میرا وجود بکھر رہا ہے۔۔۔یہ سب کیا ہے۔۔۔؟؟ ابا کی پاکیزگی اور میری والہانہ محبت کا یہ انداز۔۔۔؟؟ ابا اور میں اتنے قریب۔۔۔؟؟

## پہلی بغاوت

"میری سب سے پہلی بغاوت کچن سے شروع ہوئی تھی! دیکھتی تھی کہ باورچی خانہ کی ایک پڑچھتی پر تین گلاس، باقی برتنوں سے الگ تھلگ، ہمیشہ ایک کونے میں پڑے رہتے تھے۔یہ گلاس صرف اس موقعہ پر زیریں چھت سے اتارے جاتے تھے جب والد کے مسلمان دوست آتے تھے اور ان کو لسی چائے پلانا ہوتی اور اس کے بعد مانجھ دھو کر پھر وہیں رکھ دیئے جاتے تھے۔سوتین گلاسوں کے ساتھ میں بھی چوتھے گلاس کی طرح شامل ہو گئی اور ہم چاروں نانی کے ساتھ لڑ پڑے۔وہ گلاس بھی باقی برتنوں کو نہیں چھو سکتے تھے۔ میں نے بھی ضد پکڑ لی کہ میں کسی دوسرے برتن میں نہ پانی پیوں گی، نہ دودھ، نہ چائے۔نانی ان گلاسوں کو الگ رکھ سکتی تھی مگر مجھ کو چھوکا پیدا نہ رکھ سکتی تھی، اس لیے بات والد تک پہنچ گئی۔والد کو اس سے قبل معلوم نہ تھا کہ کوئی گلاس اس طرح علیحدہ رکھے جاتے ہیں۔ان کو پتہ چلا تو میری بغاوت کامیاب ہوئی! پھر نہ کوئی برتن ہندو رہا نہ مسلم! اس گھڑی نہ نانی کو معلوم تھا نہ مجھ کو، کہ بڑی ہو کر زندگی کے کئی سال جن سے عشق کروں گی، وہ اسی مذہب کا ہوگا جس مذہب کے لوگوں کے لیے گھر کے برتن بھی اچھوت بنا دیئے جاتے تھے!"

## براہِ راست

ڈاکٹر نگار عظیم صاحبہ کے نامِ نامی کی مناسبت سے عظیم، نامور، بلند جیسے بھاری بھرکم الفاظ ڈاکٹر صاحبہ کی شخصیت اور شناخت کو ایک طرح سے مجروح کرنے کا موجب بن سکتے ہیں البتہ ڈاکٹر نگار عظیم صاحبہ کے حوالے سے عزم و ہمت، محنت و لگن اور ارادے کی مضبوطی کو نتھی کر دیا جائے تو اس طرح کی پیکر تراشی ڈاکٹر صاحبہ کی شخصیت سے مبنی بر انصاف ہوگی!

آج کی محفل ڈاکٹر صاحبہ کی علمی، ادبی، شعری، تنقیدی، تربیتی اور تنظیمی صلاحیتوں کے اعتراف میں برپا کی گئی ہے جس میں ہر موسم، مزاج، ماحول اور برتاؤ کو شامل اشاعت اس خواہش کے ساتھ کیا گیا ہے کہ آپ نہ صرف نگار عظیم صاحبہ کی شخصیت کو جانچے، پرکھیں اور بے لاگ و بے باک رائے سے کچھ اس طور سرفراز کریں کہ حضرت آتش کی یاد آجائے۔۔۔!!

مصرع سرو سے لاکھوں ہی نکالوں شاخیں
باندھوں مضموں جو قدِ یار کی رعنائی کا

..... گلزار جاوید

☆ پیڑوں والا گھر آج کس حال میں ہے۔اس گھر سے جڑے لوگ اور ان کی یادیں آپ کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتی ہیں؟

☆☆ آاااہ۔۔۔ بات شروع بھی کی تو پیڑوں والے گھر سے۔ جہاں اب میرا کچھ بھی نہیں سوائے یادوں کے۔کیں بدل گئے ہیں اب نہ پیڑ پودے ہیں نہ دیواروں پر لدی اور سائبان بنی پھولوں کی بیلیں، نہ بیلا چمیلی نہ ہارسنگار، نہ جوہی نہ چمیلی۔نہ گلاب کی کیاریاں اور نہ ہی سفید پھولوں سے لدا چاندنی کا گھنا پیڑ۔آنگن کے بیچ امرود کا پیڑ بھی اب نہیں۔البتہ چار دیواری وہی ہے چھوٹی اینٹ کا یہ مکان اب اپنی ہیئت بدل چکا ہے جہاں ہم چھ بہن بھائی پیدا ہوئے تھے۔جس کی مٹی کے ذروں سے ہمارے جسم کے مسام کھلے تھے۔جہاں ہمارا ہنستا کھیلتا بچپن گزرا تھا۔بڑا سا آنگن، تاروں بھرا آسمان، چاندنی راتیں اور نانی کی کہانیاں یہ سب ایک خواب بن گیا ہے ایک ایسا خواب جو آج بھی سوتی جاگتی آنکھوں میں بسا ہے۔پیڑ پودے پھلواریاں اور خوشبوئیں میرے والد سبحان الہند ثروت حسین ثروت ثروت میرٹھی کا عشق تھا۔ماہر عروض شاعر اور ادیب تھے انتہائی نفاست پسند، خوش لباس، خوش شکل خوشبوؤں کے شوقین کئی کئی عطر دان مختلف قسم کے عطر سے بھرے رہتے تھے۔دور دراز سے طرح طرح کے عطر منگاتے تھے ان کے نام بھی کس قدر خوبصورت ہوتے تھے مثلاً مخروط آصفیہ، شمامت العنبر۔یہ دو نام تو مجھے آج بھی یاد ہیں۔والد درس وتدریس سے وابستہ تھے لیکن یہ دونوں شوق کب اور کہاں سے پیدا ہوئے معلوم نہیں۔زمینداری چلی گئی لیکن ٹھاٹ باٹ سے زندگی گزارنے کا قرینہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔یہ گھر کب اور کیسے آباد ہوا اللہ ہی جانے لیکن جو سنا اس کی ابتدا کچھ اس طرح تھی کہ ہمارے اجداد سید مظفر حسین نائب صوبہ روہیل کھنڈ عہد شاہی میں سلطان شہاب الدین غازی ہمراہ نواب رستم خاں امیر دکنی 1046 ہجری جو صوبہ وقت مقرر ہوا مراد آباد تشریف لائے اور محلّہ مغل پورہ میں قیام پذیر ہوئے۔ہمارے دادا سید نثار حسین انگریزوں کے زمانے میں محکمہ پولیس میں ملازم (داروغہ) تھے اور میرٹھ میں تعینات تھے لہذا آپکی سکونت میرٹھ میں ہی رہی۔بس اس طرح میرٹھ آباد ہو گیا جبکہ باقی خاندان اور عزیز واقارب مراد آباد ہی رہے۔ہم چار بہن اور دو بھائیوں نے میرٹھ کے اسی مہکتے لہکتے گھر میں آنکھیں کھولیں جو پیڑوں والے گھر کے نام سے مشہور تھا اس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ اسٹیشن سے رکشہ کیجئے کہ ٹھٹھیر واڑہ میں ماسٹر صاحب کے گھر جانا ہے تو رکشہ والا کہتا اچھا پیڑوں والے گھر۔

☆ کچھ نقشہ اپنے دارالفکر یعنی باورچی خانے کا کھینچئے۔کب کب کیا کچھ پکاتے اور بناتے تخیل میں آیا اور قرطاس وقلم نے اسے کیا رنگ وروپ عطا کیا؟

☆☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ باورچی خانہ عورت کا بہترین دارالفکر ہے میں بھی اس سے بھلا کیونکر بچ سکتی ہوں زندگی کے کسی بھی مسئلہ پر غور وفکر کرنے کی یہ جگہ شاید عورت کے لیے قدرتی عطیہ ہے۔یوں نہیں تو یوں ایسے نہیں تو ویسے کی ادھیڑ بن جو ذہن میں چلتی رہتی ہے کبھی کبھی بڑی تقویت بخشتی ہے۔یہ سلسلہ کسی پلان کا حصہ نہیں ہوتا بلکہ یہ خود بہ خود جاری ہو جاتا ہے۔باورچی خانے کا ایکدا اس فین ہمیشہ میرے ذہن کو منتشر کرتا ہے جسے میں کم استعمال کرتی ہوں۔میرے کئی افسانے اور کئی افسانوں کے کلائمکس اسی دارالفکر کی عطاء ہیں۔میرا ایک افسانہ ''حطی کلمن سعفص'' باورچی خانے کی دین ہے جس کی ابتدا روٹی پکاتے پکاتے تہکی آنے سے شروع ہوتی ہے۔اور بھی کئی افسانوں میں چائے پکوڑے شامل ہو ہی جاتے ہیں باورچی خانے کی ہر شے اس کی گواہ ہے۔کیا پکاتی ہوں کیا نہیں یہ طویل فہرست ہے بس یہ سمجھیں کہ سب کچھ پکاتی ہوں مجھے پکانا اچھا لگتا ہے۔صبح چائے سے ہوتی ہے۔دم چائے ہمارے یہاں بہت اہتمام سے بنتی ہے۔لیکن ظاہر ہے جب شوق عشق میں بدلتا ہے تو جنون بن جاتا ہے خاص طور پر شعر گوئی کے وقت فعلن فعلاتن فاعلات کے چکر میں بہت کچھ الٹا سیدھا ہو جاتا ہے چینی میں نمک اور نمک میں چینی۔اگر قورمہ یا پھر دال سبزی میں دو مرتبہ نمک پڑ جائے تو آپ افراد خانہ کی نظروں کا تصور کیجئے۔۔یہ خجالت بھی اٹھانا پڑتی ہے جناب۔اکثر روٹی پکاتے میں باورچی خانے سے عظیم صاحب کو آواز لگاتی پلیز یہ

مصرع لکھ لیجئے میرے ذہن سے محو ہو جائے گا اور شوہر بیچارہ جلدی سے کاغذ قلم۔۔۔ افففو۔ایک مرتبہ ان کے کچھ دوستوں کی دعوت تھی مختلف کھانے پکاتے پکاتے گرمی کے سبب میرا چہرہ شاید تمتما اٹھا تھا لیکن مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا عظیم صاحب کچن میں داخل ہوئے اور ایکدم یہ جملہ ان کی زبان سے ادا ہوا آج تو تمھارے چہرے سے شفق پھوٹ رہی ہے۔مجھے اچانک اپنی غزل کا مقطع مل گیا:

میرے نگار خانے سے پھوٹی ہے جو شفق
یہ تو کسی کی حسن نظر کا کمال ہے

تو اس طرح کے کمال زندگی میں ہوتے رہے ہیں۔

لیکن سچ پوچھیں تو عظیم صاحب کے بعد یہ دار الفکر بس ان کی یادوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔۔کیونکہ وہ کھانے اور۔کھلانے کے انتہائی شوقین تھے محفل کے انسان تھے۔نت نئی ڈشز تیار ہوتی رہتی تھیں۔باورچی خانے کی بیشتر رونق ان کے دم سے تھی۔اللہ سلامت رکھے بیٹے ہیں اب بھی سب کچھ بنتا اور پکتا ہے لیکن ہر شے جیسے پھیکی اور بے رنگ سی محسوس ہوتی ہے۔ایسا لگتا ہے ان کی شخصیت میری ذہنی جلا کا حصہ تھی۔جواب ماند پڑ گئی ہے۔۔

☆ کچھ روداد فوٹو گرافی کے شغف اور تجارتی بنیادوں پر فوٹو اسٹوڈیو چلانے کی بتلایئے؟

☆☆ ھاھاھاھا۔۔۔لمبی کہانی ہے خوب سوال داغے ہیں آپ نے بھی۔مختصر یہ کہ زندگی میں ہر کام کے لیے پختہ ارادہ اور جوش جنون درکار ہے۔بس پھر ہر منزل آسان ہے۔فوٹو گرافی میرا شوق ہے۔جب جہاں موقع ملا طبع آزمائی کر لی۔ابتدائی شوق میں تو اسٹوڈیو کا ہی رخ کیا جاتا تھا۔عیدی بقرعیدی جیب خرچ جو بہت معمولی ہوتا تھا جوڑ جاڑ کے بس فوٹو گرافر کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ پچیس روپے کی تین کاپی۔اسے ہم نے سمجھایا بھائی ایک کاپی کافی ہے تین کیا کریں گے دس روپے میں ایک کاپی دے دیں۔ہمیں فوٹو کھنچوانے کا بہت شوق ہے۔وہ راضی ہو گیا لیکن لاحول ولاقوۃ کوئی فوٹو آرٹسٹک نہ ہوتا۔نہ لائٹ کی تمیز نہ کیمرے کی ایسے میں ایک سائما (Syma) اسٹوڈیو مل گیا جہاں بڑے بھائی اپنے ایلسیشن کتے کے کیے لاجواب پوز کھنچوا کر لائے تھے۔بس پھر کیا تھا ہم نے بھی راستہ دیکھ لیا جب تک بریلی شہر نہیں چھوٹ گیا یہ فوٹو شوق چلتا رہا۔شادی ہو کر دہلی آ گئے۔اتفاق سے عظیم صاحب کے دو دوست فوٹو گرافر دونوں کے اسٹوڈیو۔ لیکن اب ہمارا یہ الڑھ پن کم ہو چکا تھا اور سنجیدگی آ گئی تھی۔عظیم صاحب پر ان دنوں خود ایک کیمرہ یاشیکا 635 تھا چونکہ کمرشل آرٹسٹ تھے ان کے آفس میں ڈارک روم انلارجر اور تمام کیمیکل لوازمات موجود تھے۔تب تک میں ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔عظیم صاحب کا کاروبار ان دنوں ذرا ہلکا تھا بس آئیڈیا آیا کیوں نہ ایک اسٹوڈیو کھول لیں عظیم صاحب حیران بار بار کہیں مجھ سے امید نہ رکھنا۔اچھا بھئی ٹھیک ہے نہیں رکھیں گے وہ آپ کے دوست کس دن کام آئیں گے اور میں واقعی ان کے دوست نندا جی کے "لائٹ اسٹوڈیو" جو سندر نگر میں واقع تھا پہنچ گئی کچھ ضروری چیزیں ایک ہفتہ میں سیکھ لیں اور لیجیے نندا جی کی نگرانی میں اوکھلا مین مارکیٹ میں ''راجہ اسٹوڈیو'' کا افتتاح ہو گیا۔(1977۔1982) راجہ میرے بیٹے کامران عظیم کا پیار کا نام ہے۔پانچ برس یہ اسٹوڈیو چلایا اسی یاشیکا 635 سے خوب کام کیا ہزاروں فوٹو کھینچے۔اللہ نے پہلے دن سے ہی روزی عنایت کی۔پوری دہلی میں کوئی لیڈی فوٹو گرافر نہیں تھی اس لیے خوب شہرت بٹوری۔منورما میگزین میں انٹرویو شایع ہوا لڑکیاں لڑکے نئے شادی شدہ جوڑے لورز جامعہ کے اسٹوڈنٹس غرضیکہ یہ ایسا سنہرا موقع تھا کہ دل کھول کر اپنے شوق کی تسکین کی۔فوٹو سے لیکر پرنٹ انلارج کلر ٹچنگ فنشنگ کاونٹر سب خود سنبھالتی تھی۔دو بیٹے کامران اور سبحان اسی اسٹوڈیو پر پل گئے اسی دوران میں نے ماسٹر فائن آرٹس مکمل کیا اور گورنمنٹ جاب کے لئے منتخب ہو گئی بہت مجبوری میں اسٹوڈیو ختم کرنا پڑا گھر ملازمت اور بچوں کے ساتھ اسٹوڈیو چلانا ممکن نہیں تھا۔

لیکن پروفیشنل طور پر فوٹو گرافی کوئی بری چیز نہیں بلکہ سود مند ہے اب تو تکنیک بہت ترقی کر گئے ہے تب ایسا کچھ نہیں تھا۔اسی اسٹوڈیو نے مجھے کئی افسانے دیئے اور کئی نایاب لوگوں کو پایا جن میں معروف فکشن نگار ہرچرن جاولہ (ناروے) بھی شامل ہیں وہ جب تک حیات رہے دوستی نبھاتے رہے۔آج بھی میں اسٹوڈیو کو مس کرتی ہوں۔

☆ کچھ مفید معلومات مصوری کے شغل اور اس کے نتائج کے حوالے سے ہمارے قارئین کو بتلایئے؟

☆☆ مصوری دراصل ایک قدرتی تحفہ ہے ہم کسی کو زبردستی مصور نہیں بنا سکتے۔میرے لیے اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں پہلی وجہ میں نے قدرت کی گود میں آنکھ کھولی پیڑ پودے پھول تتلیاں پرندے ان سب کے درمیان بچپن گزرا کچھ ہوش سنبھالا تو والد صاحب کو مصوری کرتے دیکھا جو ان کا پیشہ نہیں تھا صرف شوق تھا (ان کی مصوری کے کچھ نمونے آج بھی میری تحویل میں ہیں۔) بس یہیں سے مصوری کا شوق پروان چڑھتا گیا۔اور پھر باقاعدہ تعلیم میں شامل ہو گیا میں نے ڈرائنگ پینٹنگ میں ایم اے کیا اور دہلی ایڈمنسٹریشن کے ایک اسکول میں ڈرائنگ کی ٹیچر بن کر اکتیس سال اپنے فن کو جاری رکھتے ہوئے یہ ذمہ داری سنبھالی اب سبکدوش ہو گئی۔یہ تو رہی شغل کی بات اب رہے نتائج تو جایئے سب اولادیں مختلف صورتوں میں آرٹسٹ ہی ہیں۔سب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔سب کا کچھ نہ کچھ مخصوص فیلڈ ہے کامران عظیم پینٹر ہیں سبحان عظیم ایکٹر، تیمور عظیم عمارتیں بنانے کے فن میں ماہر ہیں عدنان عظیم کا ویڈیو پروڈکشن ہے اور حسن عظیم ڈیزائنر یعنی ویژول آرٹسٹ ہیں۔

☆ ایک سقہ اور قادر الکلام شاعر کی بیٹی نے لفظوں کو قرینے اور سلیقے یعنی ردیف اور قافیہ میں کب پرونا شروع کیا اور اہل خانہ نے اسے کس نظر سے دیکھا اور سراہا؟

☆☆ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قادر الکلام شاعر کی بیٹی ہونے کے سبب ان کے فن کا ہلکا سا عکس مجھ پر پڑتا رہا اور مجھ میں سماتا رہا۔علامہ سحر عشق آبادی میرے والد کے عزیز ترین دوست تھے اور والد صاحب کے عروضی شاگرد یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں سحر صاحب کو ہم چاچا کہتے تھے وہ اکثر تشریف لاتے ابا

کی اوران کی باتیں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں پہروں بیت جاتے صرف عروضی باتیں ہوتی تھیں اس وقت میری عمر سات آٹھ برس تھی۔ پروفیسر امیر اللہ شاہین بشیر بدر صاحب اکثر عروضی مشورے کرنے آتے یہ سلسلہ تو ابّا کے آخری ایام تک چلتا رہا میں شادی ہوکر دہلی آ گئی یہاں جب بھی ابّا آتے پروفیسر عنوان چشتی ابّا سے عروضی مشورے لینے آتے اور بہت دیر بیٹھتے۔ بس اسی ماحول سے شعر فہمی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اسکول کی تعلیم کے دوران کلچرل پروگرام وغیرہ میں سہیلیوں کے گروپ میں بیٹھ کر تک بندی سے گانے اور قوالیاں تیار کرتے اور پھر ایسے ہی کسی دن شعر پیدا ہو گیا پتہ ہی نہیں چلا۔

گھر میں کوئی خاطر خواہ پزیرائی نہیں ہوئی بلکہ ابّا نے خفگی ظاہر کی کہ یہ لکھنے پڑھنے کے دن ہیں تعلیم پر توجہ مرکوز کروں یہ بھی سچ ہے کہ میرا دسویں کا تعلیمی رزلٹ کچھ بہتر نہ تھا۔ لہٰذا پہلی کاوش کسی ناجائز بچے کی طرح دفنا دی گئی۔ لیکن کچھ وقت بعد ہی ابّا نے محسوس کر لیا تھا کہ شوق مرا نہیں کہیں اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔ مجھے میری کاپیوں میں لکھی تک بندی اصلاحی صورت میں ملتی تو خوشی سے پاگل ہو جاتی۔ لیکن ایک دن ابّا نے پاس بٹھا کر کچھ باتیں سمجھائیں کہ شاعری کرو گی تو مشاعرے بھی پڑھو گی خواتین کے لیے یہ کوئی بہتر شغف نہیں۔ انہوں نے تنبیہ کی کہ شاعری کے بجائے نثر پر توجہ مرکوز کروں یوں میرا رجحان نثر کی طرف بڑھ گیا اور ابّا نے بھی سکون کی سانس لی۔

☆ افسانہ یا کہانی سے ملاقات کب اور کیونکر ہوئی اور نتیجۂ فکر کس شکل میں برآمد ہوا؟

☆☆ میرا خیال ہے افسانہ یا کہانی ہم سب کے آس پاس ہوتی ہے قدم قدم پر ہوتی ہے بس ضرورت اس احساس کی ہے جو اسے شدت سے محسوس کر لے اور صفحۂ قرطاس پر اتار دے۔ جب میری آپا کی شادی ہوئی تو میں نویں برس میں تھی آپا اور نانی سے کہانیاں سن سن کر ذہن میں پریوں اور شہزادوں کی دنیا بسی ہوئی تھی۔ میری آپا میری نظر میں کسی شہزادی سے کم نہ تھیں۔ لیکن دولہا اچھا خاصا ہونے کے باوجود میرے معیار پر پورا نہیں اترا اور میرا دل کچھ مرسا گیا دلہن بنی آپا کے پاس گئی اور بہت برا منہ بنا کر بولی آپا اپکا دولہا تو بڈھا ہے۔ آپا کی سہیلیوں نے میرا منہ بند کر دیا پاگل لڑکی بڈھا کہاں سے ہے میں نے اسی معصومیت سے جواب دیا داڑھی ہے۔ آپا کی سہیلی نے مجھے گود میں بٹھایا اور پوچھا کالی ہے کہ سفید میں نے کہا کالی۔ تب بڈھا کہاں ہوا بڈھے کی داڑھی تو سفید ہوتی ہے۔ اور میں یہ جملہ دہراتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ کچھ برسوں بعد اندازہ ہوا باقی تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے آپا اور بہنوئی صاحب کا مزاج بالکل نہیں ملتا۔ ہمارے سماج میں شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں اور نوے فیصد شادیاں ایڈجسٹمنٹ پر چلتی ہیں۔ بس اسی موضوع پر پہلی کہانی ''آپی'' جب گیارہویں کلاس میں تھی لکھی لیکن کہیں شایع ہونے کو نہیں بھیجی۔ اس وقت اتنی سمجھ نہیں تھی اور وہ کہانی ضائع ہو گئی لیکن سوچ اور غور وفکر کے دریچے کھل گئے۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں آپ کا ابتدائی سفر ترقی پسندی کے زیر اثر رہا۔ کچھ تفصیل اس عارضی یا مستقل تعلق کی بتلائیے تو عنایت ہوگی؟

☆☆ نہیں ایسا تو نہیں ہے۔ میں نے کبھی کسی ازم یا تحریک سے متاثر ہو کر یا زیر اثر کچھ نہیں لکھا۔ میں تو فرمائشی موضوعات تک پر افسانہ نہیں لکھتی یہ تو تحریک ہے۔ میں ۱۹۷۴ء سے باقاعدہ طور پر رسائل میں شائع ہو رہی ہوں۔ تب میں جانتی بھی نہیں تھی ترقی پسندی ہے کیا ۱۹۹۰ء میں میرا پہلا افسانوی مجموعہ شائع ہوا تو پروفیسر قمر رئیس صاحب نے اس کا پیش لفظ لکھا تبھی میں ان کے رابطہ میں آئی۔ وہ ترقی پسند تحریک کے اہم ستون تھے کچھ برس بعد میں پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب کے رابطے میں آئی وہ بھی ترقی پسند تحریک کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان دونوں کی صحبت میں رہ کر اندازہ ہوا ترقی پسندی کے معنی کیا ہے۔ ترقی پسندی ہے کیا۔۔؟ یہ کوئی لڈو یا چاکلیٹ نہیں۔ صحیح معنی میں زندگی کی سچی کڑوی تلخ حقیقتوں سے روبرو ہونا اور ان کا سامنا کرنا ہی ترقی پسندی ہے۔ میری تحاریر میں اگر یہ چیزیں پائی جاتی ہیں تو ہاں میں ترقی پسند ہوں۔ اس میں ابتدا یا انتہا کی کوئی بات نہیں۔ میں تجریدی یا جگسا پزل جیسے افسانے نہیں لکھتی اور وہ مجھے پسند بھی نہیں آتے۔ میرے افسانوں کے کردار زمین سے جڑے ہیں اور زندگی کے مسائل سے جوجھ رہے ہیں۔ مجھے ان کے اندر جھانکنا ہے انہیں سمجھنا ہے۔ اور بس۔ میرے افسانوں میں اگر ناقدین کو ترقی پسندی نظر آتی ہے تو ضرور ہوگی کسی کو جدیدیت نظر آتی ہے تو وہ بھی ہوگی۔ یہ کام ناقدین اور قاری کا ہے تو کرنے دیجئے۔

☆ منٹو کا قول ہے " کہانی آپ شروع کیجیے ختم کرانے کا ذمہ دار میں ہوں" آپ کے ہاں کہانی شروع کرنے سے ختم کرنے تک منٹو کسقدر دخیل ہوتے ہیں؟۔

☆☆ منٹو بہت ذہین کریٹو رائٹر تھے ان کی آنکھ ماضی حال مستقبل دیکھنے کے علاوہ وہ بھی دیکھ لیتی تھی جہاں کسی کی نظر نہیں جاتی۔ اور افسانہ تو ان کا میدان تھا۔ وہ جانتے تھے کہانی کی ابتدائی یعنی شروع ہی تو مشکل ہے شروع ہو جائے گی تو اختتام بھی ہو ہی جائے گا جبکہ وہ خود افسانے کے اختتام پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔

میرے لیے بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ شروع تو ہو اختتام ہو ہی جائے گا لیکن کبھی کبھی اختتام کہانی شروع ہوتے ہی ذہن میں آ جاتا ہے تو کبھی کبھی کئی کئی دن بیقراری میں گزر جاتے ہیں اور اختتام فٹ نہیں بیٹھتا لیکن ایسا کم بلکہ بہت کم ہوا ہے۔ یہ دونوں ہی چیزیں افسانے کا اہم جز ہیں۔

☆ آج کی نشست میں اس جنگ کی بابت کچھ بتلائیے جو آپ کے دل و دماغ میں برپا ہے؟

☆☆ مجھے لگتا ہے آج میں ہی نہیں شاید ہی کوئی فرد ایسا بچا ہو جس کے دل و دماغ میں کوئی جنگ جاری نہ ہو۔ یہ جدوجہد کے ساتھ بے بسی کا دور ہے اپنی پہچان اپنا تشخص ثابت کرنے کا دور ہے بازارواد کا دور ہے رشتوں کی ڈور پھسل رہی ہے فرد کمزور پڑ رہا ہے۔ فاشزم عروج پر ہے۔ زباں پہ مہر ہے تو جنگ کہاں برپا ہوگی۔۔۔؟ دل و دماغ میں نا۔۔۔ کیا آپ اس سے مبرا ہیں؟ میں تو کہتی

ہوں ایک عام فرد اس سے نہیں بچ سکتا تو ایک حساس قلمکار کیسے بچ سکتا ہے اسے تو وقت کی سوئی پر وقت کی نبض پر انگلی رکھنا ہے۔

☆ تانیثیت کے حوالے سے ان گنت کہانیاں قرطاس پر بکھیرنے کے باوجود آپ خاتون افسانہ نگار کہلانے پر بضد کیوں ہیں؟

☆☆ دیکھئے جناب میں نے صرف تانیثیت کے حوالے سے افسانے نہیں لکھے۔ مرد کردار اور ان کے مسائل پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ میں کوئی تانیثیت کی علمبردار نہیں اور یہ تو قطعی الزام تراشی ہے بلکہ زیادتی ہے کہ میں خود کو خاتون افسانہ نگار کہلانے پر بضد ہوں۔ یہ تو قاری کا فیصلہ ہوسکتا ہے خاتون افسانہ نگار تو چھوڑیں وہ مجھے خاتون کے زمرے میں نہ رکھیں تو میں کیا کرلوں گی اور ایسے کئی ادبی مرد دوست ہیں بھی جو میرے ساتھ کمفرٹیبل ہوتے ہیں اور میرے عورت ہونے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خیر یہ ایک الگ بات ہے۔ گزارش ہے کہ مجھے کسی خانے میں نہ رکھ کر صرف اور صرف افسانہ نگار سمجھیں شکریہ

☆ نورالحسنین صاحب آپ کے افسانوں کی عورت اور اس کے کردار کو کن معنوں میں مختلف بتلا رہے ہیں؟

☆☆ نورالحسنین ایک معروف اور قدآور فکشن نگار ہیں ذہین اور تجربہ کار ہیں "چاند ہم سے باتیں کرتا ہے" اور "تلک الایام" جیسے انوکھے اور منفرد ناولوں کے خالق ہیں تو ظاہر ہے انہوں نے ضرور ایسا محسوس کیا ہوگا۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں اور میرے افسانوی کرداروں پر وہ جس طرح گفتگو کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے وہ کرداروں کو گہرائی سے سمجھنے کا ہنر رکھتے ہیں جو ہر ایک کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اوپر اوپر سے نہیں پڑھتے اور پڑھنے اور سمجھنے کے بعد بخل سے کام نہیں لیتے۔ کسی کی تعریف یا تنقید میں تکلف یا کنجوسی بھی نہیں برتتے بلکہ کھلے دل کا مظاہرہ کرتے ہیں جو ہمارے۔ ناقدین میں کم کم ہے۔

میرے افسانوں کی عورت زندگی سے عبارت ہے۔ زمین سے جڑی ہے۔ درد سہتی ہے غم کھاتی ہے اور آنسو پیتی ہے۔ رشتوں کو بکھرنے نہیں دیتی۔ محبت اور ممتا سے لبریز ہے۔ حوصلہ مند ہے۔ قربانی دیتی ہے مگر زندگی سے ہارنا نہیں چاہتی۔ زندگی اپنے اصولوں پر جیتی ہے۔ بیچاری بن کر رہنا اسے پسند نہیں۔ اس لیے مقابلہ کرتی ہے۔ حالات سے سمجھوتہ بھی کرتی ہے لیکن ظلم نہیں سہتی۔ ظالم سے عبرتناک انتقام لیتی ہے۔ باغی ہے لیکن خودسر نہیں۔ محبت میں موم کی طرح پگھل جاتی ہے مگر کردار کی مضبوط ہے۔ اور اگر کہیں ہارتی ہے تو وہ ہار سماج کے منہ پر طمانچہ سے کم نہیں ہوتی جسے بھولا نہیں جاسکتا۔ بس ایسی ہی ہے میرے افسانوں کی عورت جسے شاید نورالحسنین صاحب نے پہچان لیا اور آپ نے جان لیا۔

☆ نسیم سحر صاحب نے آپ کے افسانوں میں تحیر کا ذکر کر کے ہمارا اشتیاق بڑھا دیا ہے؟

☆☆ ایسے حساس قاری اور ناقد میسر آجائیں تو گونگے کردار بھی بولنے لگتے ہیں۔ میں نسیم سحر صاحب کی شکر گزار ہوں اور آپ سے گزارش کرتی ہوں یہ اشتیاق پورا کیجیے۔ اگر افسانے میں تحیر کی آمیزش نہ ہو تو متن اور مکالمہ بے جان ہوجاتا ہے۔ اسے ہم کہانی تو کہہ سکتے ہیں افسانہ نہیں۔ افسانے میں ابتدا اور خصوصی طور پر اختتام میں تحیر کا ہونا افسانے کی ایک بڑی خوبی ہے بلکہ یہ افسانے کا فن ہے۔

☆ آگے چل کر سحر صاحب آپکے افسانوں میں تغیراتی تبدیلی کی بات کر کے سوال کا جواز پیدا کر رہے ہیں؟

☆☆ یہ میرے لیے اچھی اور سودمند بات ہوئی۔ تغیرات زمانہ ہیں ہم لوگ۔ یہ قدرت کا اصول ہے ایسا ہونا لازمی ہے۔ اس سے زندگی کو مثبت انرجی ملتی ہے۔ زندگی جینے کی راہ آسان ہوجاتی ہے۔ اگر اس سے بغاوت کریں گے تو تنہا پڑ جائیں گے اور ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔

☆ ڈاکٹر سید احتشام الدین نے آپکے افسانے "گہن" کا تجزیہ کرتے ہوئے منٹو اور عصمت کی بازیافت کس بنیاد پر کی ہے؟

☆☆ سب واقف ہیں کہ منٹو اور عصمت بے باک افسانہ نگار رہے سماجی برائیوں کی پردہ پوشی کرنے کے بجائے ان کو واضح کرنا انہوں نے اپنا فرض جانا قلمکار کی یہ بڑی ذمہ داری ہے۔ حالانکہ اس کی ابتدا رشید جہاں کر چکی تھیں۔ جب سماجی سروکار کمزور پڑ جاتے ہیں تو بہت سے غلط، نقصان دہ اور منفی رویئے پنپنے لگتے ہیں بلکہ دیمک کی طرح اپنی جگہ بنانے لگتے ہیں اور سماج کو کھوکھلا کر دیتے ہیں ایسے میں لازم ہے کہ انہیں طشت از بام کیا جائے "گہن" بھی کچھ ایسا ہی افسانہ ہے۔ شاید اس مماثلت کے سبب احتشام صاحب نے گہن کو عصمت اور منٹو کی بازیافت جانا۔

☆ آگے چل کر یہ ہی صاحب آپکے ہاں تکنیک کی کمی کا گلہ کرتے بھی نظر آتے ہیں۔؟

☆☆ اب اس بارے میں بھلا میں کیا کہہ سکتی ہوں میرے ذہن میں نہیں کہ تکنیک کی یہ کمی ان کو گہن میں محسوس ہوئی یا دوسرے افسانوں میں۔ بہرحال جہاں بھی رہی ہو۔ گہن کا موضوع لسبین ہے اس کے لیے اس سے بہتر تکنیک سمجھ میں آنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اکثر ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کچھ اور کہتا ہے قاری کچھ اور سمجھتا ہے۔ تکنیک میں بھی یہی بات ہے کون سے افسانے کے لیے کیا تکنیک اپنائی جائے اس کا حق تو قلمکار کو ہی ہے کیونکہ افسانہ کی تخلیق کا کرب تو اسی نے جھیلا ہوتا ہے۔ آپ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ بچہ سر نہیں پیروں کی طرف سے پیدا ہونا چاہئے۔

☆ اسی پر بس نہیں احتشام صاحب تو آپ کے افسانے "عکس" کو کھلم کھلا سریندر پرکاش کے افسانے کا پرتو بتلا رہے ہیں۔؟

☆☆ دیکھئے جناب میں نے افسانہ لکھا اور قاری کے حوالے کر دیا اب قاری کو اختیار ہے وہ جو چاہے سمجھے اور جو دل چاہے لکھے۔ لیکن اتنا ظلم نہ کریں یار کہ جواب دینا ضروری ہوجائے۔ جوگندر پال مرحوم، پروفیسر قمر رئیس مرحوم، پروفیسر محمد حسن مرحوم اور پیغام آفاقی مرحوم کو یہ افسانہ بہت پسند تھا کیا اردو فکشن پر ان سب کی نظر نہیں تھی؟ اگر ایسا ہوتا تو "عکس" کے لیے مجھے اتنی سراہنا نہیں ملتی۔

کیا پال صاحب (FICTION" URDU "NEW) کے انتخاب میں ( جو انگریزی میں ترجمہ ہوکر 2004 میں شائع ہو چکا ہے ) عکس کو شامل کرتے؟ ہمارے دو معروف فکشن نگار الحمدللہ ہمارے درمیان موجود ہیں جنہوں نے " عکس" کو پڑھا بھی ہے اور میری زبانی سنا بھی ہے۔ جن کی فکشن پر بھرپور نظر ہے۔ نورالحسنین صاحب کی " عکس" کے بارے میں رائے ہے کہ " عکس ایک منفرد افسانہ ہے اور سریندر پرکاش کے افسانے کا اس سے کوئی تعلق نہیں"

پروفیسر معین الدین جینا بڑے صاحب کی صدارت میں یہ افسانہ پڑھ چکی ہوں کسی قاری نے تب بھی یہ سوال اٹھایا تھا اور جینا بڑے صاحب نے اس سوال کو رد کرتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں ان سے پھر گفتگو کی اور استفسار چاہا جسے میں ہو بہو یہاں پیش کر رہی ہوں۔

☆ صنف نازک کی نسبت بے باک افسانہ نگار کا لفظ آتے ہی خیال کی رو، عصمت چغتائی کی جانب رواں ہو جاتی ہے۔ آپ کے بارے۔، بے باکی کا تصور کب اور کیونکر جگہ پایا اور آپ کے ہاں اس بے باکی کا استعمال کس طور عمل میں لایا گیا۔؟

☆☆ جی ہاں ایسا ہے۔ خصوصی طور پر خواتین قلکاروں کے لیے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ کی سوچیں آپ کو کہاں لے جاتی ہیں آپ خود ذمہ دار ہیں۔ مجھے خود نہیں معلوم میں نے کہاں بے باکی کا اظہار کیا تو کیسے بتا سکتی ہوں 'عکس'، ' گہن'۔ 'پھانس'، 'مرد'، 'بیل'۔، 'تکمیل' اور جشن جیسے افسانوں پر اس طرح کے کلمات گردش کرتے رہے جیسا آپ کا خیال ہے۔ لیکن سب کا خیال یکساں نہیں۔ انہیں افسانوں کو کچھ قارئین اور قدمائی نے ادبی فنی اور نفسیاتی گہرائی کا آئینہ دار کہا تو کچھ نے اردو ادب پر سیاہ دھبہ۔

☆ آپکے ہاں جنس کے استعمال کے تناسب کو زیادہ بتلانے والے کس امر کی نشاندہی کے شائق ہیں؟

☆☆ خدا جانے۔ اول تو میرے یہاں جنس پر لکھے گئے افسانے ہیں ہی نہیں۔ اور اگر کہیں ضرورتاً موجود ہے تو وہ کردار یا افسانے کا حصہ ہے۔ میں نے کام شاستر کو کھ شاستر نہیں افسانہ لکھا ہے۔ اور چلیں چھوڑیں ہاں لکھا ہے تو۔۔۔ جنس کو آپ زندگی سے الگ کر سکتے ہیں کیا۔؟ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہم ابھی فضولیات ہی میں الجھے ہوئے ہیں ۔ کس امر کی نشاندہی کے شائق؟ دراصل میرے منٹو پر پی ایچ ڈی کرنے کی وجہ سے مجھے اسی راہ سے جوڑ دیا جاتا ہے اور کچھ نہیں۔

☆ ان تحفظات اور خدشات سے آگاہی بھی ضروری ہے جن کے سبب آپ نے اپنی کہانی "مادری زبان" میں اردو کو درپیش مسائل کا حل عربی زبان میں تلاش کیا ہے؟

☆☆ "مادری زبان" کسی ایک مسئلہ کو پیش نہیں کرتی بلکہ یہ بہت سارے مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ اردو کو درپیش مسئلہ بھی اتنا اہم نہیں دراصل یہ کہانی خصوصی طور پر اقلیتوں کے مسائل کی طرف توجہ مرکوز کراتی ہے۔۔ اس میں قومی مسائل بھی ہیں۔ اس کے کئی ڈائمنشن ہیں۔ اس کو مختلف طریقوں سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک بار نہیں بار بار پڑھنے والی کہانی ہے اسکی پرتیں زرا دیر میں کھلتی ہیں۔

☆ آپکے خیال میں مستقبل قریب یا بعید میں برصغیر بالخصوص بھارت میں اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو کس طرح کے خدشات لاحق ہیں؟

☆☆ میرے نزدیک نہ اردو زبان کو خطرہ لاحق ہے اور نہ ہی رسم الخط کو۔ کچھ شر پسند عناصر اس طرح کے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں اس سے کچھ ہونے والا نہیں سوائے تذکرہ کے۔ باقی سارے جہاں میں دھوم اردو زباں کی ہے۔

☆ پروفیسر علی احمد فاطمی کے بقول "ہندی کے افسانوں ادب میں کہانی انسانی رشتوں کے گرد گھومتی ہے"۔ پریم چند افسانوی ادب کو نبی نوع انسان کی ضرورت ٹھہراتے ہیں۔ آپکی قلمی جہات کس امر کی غماز ہیں۔؟

☆☆ پروفیسر علی احمد فاطمی ایک بڑے ناقد ہیں ان کی تنقید میں کہیں نہ کہیں تخلیقی عنصر بھی ہوتا ہے۔ کہانی اردو کی ہو یا ہندی کی انسانی رشتوں کے گرد ہی گھومتی ہے۔ انسان ہے تو کہانی ہوگی اور کہانی ہے تو انسان ہونا لازمی ہے اور جب کہانی انسان کی ہوگی تو رشتے کیونکر نہ ہوں گے؟ لیکن کچھ کہانیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کردار اور رشتوں سے مبرا ہوتی ہیں یہ موضوع پر منحصر ہے۔ پریم چند اپنی جگہ درست ہیں اس بات سے انکار تو نہیں کر سکتے۔ میرے افسانوں میں آپ کو ان دونوں کا عکس نظر آئے گا۔ دراصل میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں افسانہ زندگی کا عکاس ہوتا ہے تب کیونکر ہم زندگی کی حقیقتوں سے منہ موڑ سکتے ہیں ۔

☆ پروفیسر وارث علوی نے کہیں لکھا ہے کہ " کہانی محض واقعہ نگاری نہیں ہوتی۔ اس کے بلیغ اشارے سماجی اور معاشی رشتوں اور کہانی کار کے شعور کا پتہ دیتے ہیں" آپ کی سوچ، فکر اور عمل، رائے مزکور کی روشنی میں کس سمت کو درست گردانتی ہیں۔؟

☆☆ بالکل صحیح فرمایا کہانی محض واقعہ نگاری نہیں ہوتی میں وارث علوی کی اس بات سے اتفاق کرتی ہوں۔ ادب اپنے وقت کا عکاس ہوتا ہے۔ ایک ادب ہی ہے جو وقت کو قید کرتا آگے بڑھتا ہے۔ آپ قلمکار ہیں خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سماجی اور معاشی رشتوں کی کس قدر اہمیت ہے۔ ہر انسان اس سے جڑا ہے اور حد یہ ہے کی سماج کا تصور رشتوں کے بغیر ادھورا ہے۔ میرا ادب اسی کا عکاس ہے ۔ آپکے پچھلے سوال کا جواب بھی اس میں پنہاں ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ تخلیق میں تخلیق کار کا شعور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں اس کی زندگی کا عکس اس کے نظریات تلخ ترش شیریں رویئے اس کی کڑواہٹ، سماج کے تئیں اس کے رشتے اور احساسات سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ میری سوچ، فکر اور عمل اس سے مختلف نہیں ۔ عوامی زندگی سے میری کہانیوں کو بہت قربت ہے۔

☆ چیخوف کے بقول "افسانہ چھوٹی چیزوں کو زندہ رکھنے کا نام ہے" آپ۔ نے بھی کچھ اہم اور غیر اہم موضوعات کو یادگار بنانے کی یقیناً کوشش کی

ہوگی۔؟

☆☆ اس میں کوئی شک نہیں یہ بات مان سکتے ہیں افسانہ چھوٹی چیزوں کو زندہ رکھنے کا نام ہے۔ کیونکہ جو چیزیں چھوٹی ہوتی ہیں وہ بہت اہم ہوتی ہیں لیکن ہر ایک کی ان پر نظر نہیں جاتی۔ یہ کام قلمکار کا ہے کہ وہ ان چیزوں کو دکھائے۔۔۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ بڑی چیزوں، بڑے واقعات وحادثات سے افسانہ خالی ہے۔ ویسے بھی بڑی چیزیں تو خود بہ خود تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں لیکن لکھی تو وہ بھی جاتی ہیں۔ وہ بھی افسانہ۔، ناول اور تاریخی صفحات میں جگہ پاتی ہیں۔

بیشک۔۔۔، میں نے بھی کچھ اہم اور غیر اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن جان بوجھ کر کسی خاص ارادے سے کبھی ایسا نہیں کیا یہ چیزیں تو خود بہ خود وجود میں آجاتی ہیں۔ کچھ واقعات حادثات اور کردار ذہن پر اس طرح حاوی ہو جاتے ہیں کہ خود کو لکھوا لیتے ہیں موضوع کچھ بھی ہو۔ اور میں نے بھی ان پر لکھنے میں کبھی تکلف نہیں کیا بلکہ پوری طرح حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

☆ پریم چند کی پیروی میں نفسیاتی نکتہ پر زور دینے کی ضرورت کیوں آن پڑی نیز اس کے نتائج کیا رہے؟

☆☆ یہ سب کو معلوم ہے پریم چند افسانے کی زمین ہیں جیسے کسی عمارت کی زمین یعنی بنیاد ہوتی ہے۔ اس کی مضبوطی پر ہی عمارت کے ڈھانچے کا انحصار ہوتا ہے۔ اب بھلے ہی اس کا رنگ روغن اور سجاوٹ بدلتے رہیں۔ پریم چند نے زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا اور اپنے افسانے اور ناولوں کے ذریعہ اپنے وقت کو پیش کیا۔ گاؤں، کسان، کھیت کھلیان، بال وواہ، ستی پرتھا، تعلیم بچہ مزدوری، ابلا ناری، اور بہت سے۔ چھوٹے بڑے سماجی مسائل۔ وقت بدلتا ہے حالات بدلتے ہیں سوچ کے زاویے بدلتے ہیں تو اس کے اثرات بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ اس اثر سے ہماری تنقید بھلا کیسے بچ سکتی ہے۔ پریم چند کے ادب پر تحقیق اور تنقید کے نئے نئے باب روشن ہو رہے ہیں کسی نے ان کے کرداروں کے نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی تو کسی نے علامتیں تلاش کیں یہ کام تو ہوتا رہے گا۔ اس سے مزید پریم چند ادب شناسی کے نئے در وا ہوتے ہیں اور پریم چند ادب کی اہمیت افادیت میں اضافہ بھی۔

☆ کہانی یا کہانی کار کی بابت ایک تصور یہ بھی ہے کہ اگر لکھنے والے کے ہاں ادب اور زندگی کا بڑا تصور نہیں ہے تو وہ ذاتی موضوعات کو ترجیح دیتا ہے؟

☆☆ ہاں ایسا سوچ لیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ غلط ہے۔ میرے خیال میں یہ اتنا اہم نہیں ہاں قلمکار کے لیے ادب اور زندگی کا بڑا تصور ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کا ویژن تبھی بڑا ہوگا۔ پھر چاہے وہ ذاتی موضوعات پر لکھے یا سماجی اور عالمی پر۔ ویسے لگاتار کوئی بھی ذاتی زندگی یا ایک ہی موضوع پر نہیں لکھ سکتا۔ چند کہانیاں ہر ایک کی ذاتی زندگی پر مل جائیں گی یہ کوئی عیب بھی نہیں۔ ادب زندگی ہی سے عبارت ہے۔ جو لکھا ہے اس میں کتنا دم ہے وہ موضوع کتنا اہم ہے بیان کرنے کا طریقہ کار کیا ہے یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس طرح سوچیں گے تو تمام سوانحی ناول کس زمرے میں رکھیں گے۔ زندگی کے تمام تجربات تو قلمکار خود ہی جھیلتا ہے تب اگر اس کے پاس ایسا کچھ ہے جو وہ قاری کو دینا چاہتا ہے تو اسے ضرور لکھنا چاہیے۔

☆ اردو ادب میں ایک تصور یہ بھی راسخ ہو چکا ہے کہ بڑا ادیب یا بڑا فکشن نگار ناول لکھے بنا نہیں بن سکتا۔ اس کے باوجود ہم آپکے ناول سے محروم ہیں؟

☆☆ اچھا کیا واقعی ایسا ہے؟ مجھے اس کا اندازہ نہیں لیکن سعادت حسن منٹو نے بھی کوئی ناول نہیں لکھا ایک طویل افسانہ "پھندنے" ضرور ہے جس کو ناولٹ کہا گیا لیکن ان کے بڑا ادیب بننے پر تو شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

رہی میری بات مجھے ایسا ضروری نہیں لگتا۔ میرا مزاج شاید ناول کے لیے مناسب نہیں۔ میں تو افسانے بھی مختصر لکھتی ہوں دس صفحات کے افسانے کو کاٹ چھانٹ کر چار پانچ میں لے آتی ہوں۔ مجھے ناول لکھنے سے انکار نہیں نہ ہی ایسا کوئی فیصلہ کیا ہے بشرطیکہ کوئی واقعہ حادثہ کردار یا موضوع زندگی سے اتنا قریب نظر آئے کہ میرے دل و دماغ پر حاوی ہو جائے۔ تو شاید ضرور لکھوں۔ صرف اس لیے تو ناول نہیں لکھ سکتی کہ بڑی ادیبہ کہلاوں۔۔۔ اس کی بھلا کیا ضرورت؟

☆ منشی پریم چند سے لے کر منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت، کے علاوہ اردو ادب میں ان گنت اور لاتعداد قد آور افسانہ نگاروں کی کہکشاں کی موجودگی میں سعادت حسن منٹو کا انتخاب کن وجوہ کے سبب کیا۔ نیز کام کے دوران اور کام کے بعد آپ کے احساسات کیا رہے۔؟

☆☆ یہ سوال تو آپکا بہت آسان ہے لیکن اس کا جواب بہت مشکل اور تفصیل طلب ہے۔ دراصل افسانہ نگاری کے بڑھتے شغف نے مجھے منٹو سے روشناس کرایا تھا۔ میں فائن آرٹس میں ماسٹرز کرنے کے بعد گورنمنٹ جاب میں آ چکی تھی ہندی میڈیم میں تعلیم حاصل کی تھی اور اردو کی کوئی ڈگری میرے پاس نہیں تھی۔ اپنی اس محرومی سے خود میں بڑی شرمندگی ہوتی تھی جبکہ میں افسانہ نگار اردو کی تھی۔ میری چھوٹی بہن جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کر رہی تھی بس دماغ میں آیا پرائیویٹ اردو میں ایم اے کر لیا جائے۔ یوں کتابوں افسانوں اور افسانہ نگاروں سے شناسائی بڑھی۔ ایم اے کے دوران منٹو اور ان کے معاصرین کے افسانوں کو اور زیادہ پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ بڑھتے شعور اور مطالعہ نے منٹو کے فکر وفن کی اپنے معاصرین سے منفرد تصویر میرے سامنے پیش کی۔ ناقدین کی متضاد آرا نے مجھے منٹو شناسی پر مائل کیا۔ "چھٹتی نہیں یہ کافر منہ کو لگی ہوئی" منٹو کی زندگی، اس کی فطرت، اور تخلیقی نہاں خانوں کی مزید سیر کی تو پتہ چلا صرف بیالیس سال آٹھ مہینے اور سات دن کے عرصہ حیات میں منٹو نے جو سرمایہ اردو ادب کو عطاء کیا اس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس میں سماج کے ہر گوشے کی نہ صرف نمائندگی کی ہے بلکہ فکشن میں نئے باب کا اضافہ کیا۔ سماج، سیاست، طوائف اور جنس کا اس قدر وسیع میدان کسی اور کے پاس نہ تھا۔ ممی، سلطانہ، سوگندھی، موذیل شاردا، سکینہ، بابو گوپی ناتھ، ایشر سنگھ، رام کھلاون، غفار سائیں

جیسے ٹوٹے بکھرے زخمی اندر سے کھوکھلے کرداروں نے میرے ذہن کو جکڑ لیا۔ یہ وہ کردار ہیں جنہوں نے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے میرا تعاقب کیا اور مجھے اس راہ پر چلنے کے لیے مجبور کیا اور بس پھر میں اس کی تلاش میں نکل پڑی۔

کام کے دوران تو مجھے منٹو کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ میری جاب تھی، بچے اور پوری گرہستی، کوئی ملازمہ نہیں سب کاموں سے فارغ ہوکر رات کو پڑھتی تھی صبح کے تین چار بج جاتے تھے چند گھنٹے سوتی اور پھر منٹو کے کرداروں کے ساتھ زندگی کے روٹین میں مصروف ہو جاتی ۔ پانچ برس لگ گئے "منٹو کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ" لینے میں اور بس۔

جو دقتیں جو پریشانیاں رجسٹریشن سے لیکر ڈگری ایوارڈ ہونے تک پیش آئیں وہ بہت تکلیف دہ رہیں۔ بھدے مزاق کا نشانہ بھی بنی۔ ایک تو عورت اوپر سے منٹو کسی کو ہضم نہیں ہوتا تھا میں نے بھی بے شرمی اوڑھ لی لیکن حوصلہ نہیں ہارا ۔اب یہاں ان کا ذکر کرنا بیکار ہے اب نہ میرے گائیڈ حیات ہیں نا ہی ایکزامنر اور نہ ہی دوسرے لوگ۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی یہ مشکل وقت تھا۔ شوہر نے حوصلہ دیا تو میں نے منفی روئیوں سے مثبت انرجی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آپ حیران ہوں گے میں مطمئن نہیں ہوئی۔ مجھے یہ ڈگری دو وجوہات کی بنا پر زندگی کی بہت بڑی بھول یا بے وقوفی محسوس ہوئی۔ پہلی! مجھے اندازہ ہوا میں نے خود اپنے دشمن پیدا کر لیے ہیں۔ دوسری! پی ایچ ڈی کے اصول وضوابط نے مجھے کھل کر کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ گائیڈ اور اصولوں کی پابندیاں ساتھ ساتھ چلتی رہیں ورنہ ان پانچ برسوں میں جو کچھ میں نے حاصل کیا کئی کتابیں منظرِ عام پر آسکتی تھیں۔ میرا یہ تھیسس نہ چھپے بڑے بڑے جغادری اس میں لگ گئے۔ اور یہی ہوا ہم اس وقت گرہستی چلا رہے تھے بچے پال رہے تھے اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ کتاب شایع کرا لیں۔ مخمور سعیدی اس وقت دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری تھے میری پریشانی سے واقف تھے ان کے مشورے سے کتاب کے ایک حصہ کو چھاپنے کی اجازت پر میں نے مسودہ جمع کیا اور منظوری مل گئی یعنی وہ بھی اتنا حوصلہ نہیں رکھتے تھے کہ ڈنکے کی چوٹ پر میرا مکمل کام شایع کرنے کی امدادی منظوری دیں کیونکہ بیٹھنا اٹھنا تو انہیں پیروں میں تھا جن کی مریدی اوّل تھی۔ اس ضمن میں بہت نقصان بھگتا۔ اب الحمدللہ صاحب حیثیت ہوں لیکن چوبیس برس بعد اب کام روائز کرنے کی طاقت نہیں۔ یہ زکر اور اس سے جڑی تلخ سچائیوں کو ساتھ ہی لے جاؤں گی۔

☆ سعادت حسن منٹو پر لکھے گئے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے پر کچھ لوگ جز بز ہوئے اور کچھ نے اعتراض بھی اٹھائے۔ آپ کے خیال میں اس مخالفانہ عمل کا سبب کیا تھا۔؟

☆☆ نہیں۔۔۔ کیا جز بز ہونا، ظاہر ہے منٹو پر بات کرتے ہوئے لوگ شرماتے ہیں جھجکتے ہیں اور کوئی عورت بات کرے تو عجیب سا تاثر دیتے ہیں جیسے کوئی بہت بڑا عیب کر لیا ہو۔ مقالے پر تو ایسا کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ہاں کچھ حضرات کو شبہ تھا، مقالہ میں نے نہیں لکھا تو واؤا میں میری بخیہ ادھیڑ ڈالی کافی طویل واؤا چلا لیکن کرم اللہ کا میں پر اعتماد رہی اور ڈگری ایوارڈ ہوگئی ۔اصل مخالفانہ عمل تو اس کے بعد شروع ہوا۔ سبب تو مجھے اس وقت سمجھ میں آیا جب منٹو پر ہی دوسری کتابیں میرے نکات کو فولو کرتی ہوئی منظر عام پر آگئیں۔ باقی آپ خود سمجھدار ہیں میں اس بارے میں زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی۔

☆ ہرچرن چاولہ پر آپ کے کام کی نسبت، لوگوں میں عدم اطمینان کی کیفیت کے اسباب آپ کے خیال میں کیا ہیں؟

☆☆ ہرچرن چاولہ ایک بڑے فکشن نگار تھے تارک وطن کا درد ان کی تخلیقات میں جسم میں خون کی طرح بہتا ہے۔ ان کا فکشن مشرقی اور مغربی ماحول کا عکاس ہے۔ رسائل کے ذریعے ان کی کوئی تخلیق نظر سے گزری تھی اور نام ذہن میں محفوظ تھا ایک دن اچانک "محور" کے ایڈیٹر زم زم بک ڈپو کے مالک قیصر صاحب میرے اسٹوڈیو میں داخل ہوئے چاولہ صاحب ہمراہ تھے قیصر صاحب ان کی کوئی کتاب پبلش کر رہے تھے ارجنٹ فوٹو درکار تھا اوکھلا ایریا میں گھوم رہے تھے بس قیصر صاحب لے آئے چاولہ صاحب سے وہ پہلی ملاقات دوستی اور فیملی تعلقات میں بدل گئی۔ بہت پیاری مخلص شخصیت۔ حالانکہ وہ مجھ سے چھبیس برس بڑے تھے۔ لیکن دوستی کا عمر سے کیا تعلق۔؟ چاولہ صاحب کا تعلق داؤد خیل میانوالی مغربی پنجاب سے تھا ان کی پیدائش بھی یہیں کی ہے۔ روزگار کے سبب ناروے میں مقیم تھے لیکن روح ہندوستان میں بستی تھی ہر برس ہندوستان آتے تھے اور غریب خانے کو ضرور رونق بخشتے تھے۔ کالکا جی دہلی میں ان کا اپنا خوبصورت فلیٹ ہے ان کی بیوی دونوں بیٹیوں اور بیٹے اور اب نواسے سے بھی ملاقات ہے ۔چاولہ صاحب کی مسز کا انتقال کالکا جی دہلی میں ہی ہوا۔

چاولہ صاحب کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے معروف ادیبوں کے تقریباً تیس مضامین پر مشتمل "ہرچرن چاولہ فن اور شخصیت" مرتب کی جس پر نارنگ صاحب کا پیش لفظ ہے لیکن افسوس اچانک ناروے سے ان کے انتقال کی خبر نے نہ صرف ہمیں بلکہ اردو دنیا کو مغموم کر دیا اور وہ یہ کتاب نہ دیکھ سکے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اب یہ کام ادھورا رہ جائے گا لیکن میں نے مکمل کیا اور شاندار رسم اجراء کیا جس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور اور پروفیسر قمر رئیس کے علاوہ چاولہ صاحب کے دوست احباب اور کئی بڑے ادیب شامل تھے۔ آسٹریلیا سے ان کی بیٹی بھی تشریف لائیں۔ اس کتاب کو انیس امروہوی نے تخلیق کار پبلیکیشنز سے شائع کیا۔

لوگوں کے عدم اعتماد کی وجہ شاید یہ تھی کہ کہاں ناروے کا ایک بڑا رائٹر ہرچرن چاولہ اور کہاں دہلی کی یہ معمولی غیر معروف نگار عظیم۔ دنیا بھر کے قلمکاروں کو چھوڑ کر چاولہ پر کیوں محنت کر رہی ہے۔۔۔ سچ یہ ہے کہ یہ ان کا حق تھا۔ اور ان کی خواہش کا احترام اور بس۔

☆ ثروت میر ٹھی سے بطور شاعر آپ کے تعارف، تعلق اور تحقیقی کام کے مراحل کس طور طے پائے اور یہ تجربہ آپکی ادبی زندگی میں کس مقام کا حامل ہے؟

# ''چہارسُو''

☆☆ ثروت میرٹھی سے پہلے میرا تعارف ایک باپ سے ہوا آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ تعارف میرے پیدا ہونے کے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ سب سے بڑی آپا اوران سے چھوٹے دو بھائی دنیا میں آ چکے تھے ابّا ایک بیٹی اور چاہتے تھے تا کہ بہن کی جوڑی بن جائے اور ابّا کی دعاؤں کے ثمر میں، میں پیدا ہو گئی ابّا نے میری لمبی لمبی نازک انگلیوں کو چھو چھو کر دیکھا اور چوما۔ ماتھے پر بوسہ دیا اور کان میں اذان دی۔ یہ ابّا سے میرا پہلا تعارف تھا۔ میرا نام ملکہ مہر نگار میر پیدا ہونے سے پہلے رکھا جا چکا تھا۔ آپا اور امی بتاتی تھیں کہ ابّا تمھیں دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ یہ اور بات کہ میرے بعد تلے اوپر دو بہنیں اور آ گئیں۔

جیسے جیسے ہوش سنبھالا احساس ہوا ابّا بہت سخت گیر ہیں۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں ہر کام میں ڈسپلن یعنی نظم و نسق چاہتے ہیں۔ با رعب شخصیت کے مالک، اس لیے بچپن کچھ اچھا نہیں گزرا، ڈرا سہا سا رہا۔ میں نو برس کی تھی کہ آپا کی شادی ہو گئی تب میں ابّا کے کام دوڑ دوڑ کر کرنے لگی۔ جیسے جیسے عمر کی اگلی سیڑھی چڑھتی گئی ابّا کی توجہ کا مرکز بنتی گئی۔ ابّا مطالعہ بہت کرتے تھے۔ ابّا کے مزاج کی پاکیزگی، زندگی جینے کے طور طریقے، لباس، پیڑ پودوں اور خوشبوؤں سے ان کا والہانہ عشق مجھے بھی بھانے لگا اور آہستہ آہستہ ان کی شخصیت، شعر و سخن اور ان کے آرٹ کے نمونے مجھے متاثر کرنے لگے اور خود بہ خود میں بھی ان کے شوق کی نمائندگی کرنے لگی۔ اس طرح میرا ان سے تعارف ایک جزباتی لیول پر تعلق میں بدلنے لگا۔ ان کے پاس اکثر لوگ ادبی مشوروں کے لیے آتے گھر میں محمود الحسن، سحر عشق آبادی اور میرے والد گھنٹوں شعر و شاعری اور عروضی گفتگو میں۔ محو رہتے۔ تو ظاہر ہے شاعری سے پہچان ہو ہی گئی۔

گھریلو حالات بدلے اور ہم سب کچھ برس بریلی بڑے بھائی کے پاس رہے اتفاق سے پرانا شہر کٹرہ چاند خاں میں کرائے پر رہائش پزیر ہوئے جہاں ایک طرف وسیم بریلوی شاعری میں قدم جما رہے تھے تو دوسری طرف استاد شاعر شوق بریلوی بھی اسی محلّہ میں مقیم تھے۔ اور بھی نمائندہ شاعر تھے یہاں مشاعروں کا ماحول تھا۔ حکیم حامد علی کے یہاں اکثر شعر و سخن کی محفلیں جمتیں مشاعرے بھی ہوتے عرس کے موقع پر قوالی اور مشاعرے کی رونق ہی مختلف ہوتی قل ہوتے ہوتے صبح ہو جاتی۔ یوں تو شعر و شاعری ابتدا سے ہی گھر میں دیکھی اشعار بھی بہت مرتبہ سنے تھے لیکن مشاعرہ پڑھتے پہلی مرتبہ ابّا کو وہیں دیکھا۔ ثروت میرٹھی سے یہ ہماری پہلی اور منفرد سرور آمیز ملاقات تھی۔ وہ صدر ہوتے تھے اور سب سے بعد میں پڑھتے تھے اور ہم صبح تین چار بجے تک پردے کے پیچھے خواتین میں گھسے بیٹھے رہتے تھے کیا مجال کہ سو جائیں پندرہ سولہ برس کی عمر تھی شعور بیدار ہو رہا تھا شعر فہمی کی سمجھ آ رہی تھی اور ابّا کی شخصیت آہستہ آہستہ پراسرار طور پر کھل رہی تھی کہ ہمارے سخت گیر ابّا بہت نرم و نازک دل رکھتے ہیں اور اس قدر جزباتی کلام کہتے ہیں کہ مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ کئی دن تک کانوں میں واہ واہی گونجتی رہتی۔

عجب تھا وہ زمانہ کہ ابّا نے میرے ادبی شوق کو بڑھنے نہیں دیا۔ تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے مجھے درسی کتابوں میں الجھائے رکھا۔ شعر گوئی سے دور رہنے کی تاکید کی لیکن کب تک۔۔۔ میرے ادبی ذوق کو دیکھ کر وہ موم کی طرح پگھلنے لگے اور میری غیر موجودگی میں میری کاوشوں کی اصلاح کرنے لگے۔ پھر وہ مجھے نثر اور شاعری کی باریکیوں کو سمجھانے لگے لیکن افسوس۔۔۔ یہ وقت جلدی گزر گیا میری شادی ہو گئی اور میں غم روزگار اور گھر گرہستی کی ذمہ داریوں میں پھنس گئی لیکن ذہن ثروت میرٹھی سے غافل نہیں تھا۔ اچانک میرے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ امی ابّا اور ہم سب کے لیے بہت بڑا تھا۔ اب وہ واپس اپنے شہر میرٹھ آ گئے۔ وہ کمزور اور نحیف ہوتے جا رہے تھے گوشہ نشین ہو گئے تھے اور میں انہیں دیکھ کر تل تل مر رہی تھی۔ ایسے میں انہیں اپنے گھر دہلی لے آئی۔۔

ایک دن میں کاغذ قلم لیکر بیٹھ گئی ان کا انٹرویو لینے کے لیے جو سمجھ میں آتا گیا پوچھتی گئی تب صحیح معنوں میں اندازہ ہوا ابّا کسقدر عالم فاضل ہیں وہ تو ثروت میرٹھی کے قد سے کہیں بلند ہیں۔ نہ شہرت کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔۔۔ علم بانٹنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا بس ہم ہی محروم رہ گئے۔ منشی فاضل، منشی کامل لاہور یونیورسٹی سے، فارسی کا آخری امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے، عربی اور مولوی کا امتحان بھی پاس کیا۔ تین شرح شایع ہو چکی تھیں اور اکیس برس کی عمر میں سحبان الہند کا خطاب پا چکے تھے بہترین استاد کے لیے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ مجموعی ادبی خدمات پر بھی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ نہ میں ان کا انٹرویو لیتی اور نہ مجھے ان باتوں کا علم ہوتا۔ ابّا مجھے بہت عزیز رکھنے لگے تھے۔ پھر ایک دن وہ اپنا تمام علمی اثاثہ میرے پاس چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئے۔ آاااااہ۔۔۔

یہ تو رہی تعارف اور تعلق کی بات اب رہی تحقیق کی تو میری بساط اتنی نہیں تھی کہ ان کی علمی چیزوں کو سمجھ سکوں۔ ایک کرید، بے چینی، تشنگی، کم علمی اور مایوسی میری زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی رہی کہ میں ابّا کے لیے کچھ نہیں کر سکی اور بہت وقت گزر گیا اتنا کہ اب اپنی زندگی کی ڈور بھی کمزور پڑتی دکھائی دینے لگی۔ تب میں نے ہمت کر کے ان کے اس ذخیرے کو نکالا اور سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے تمام کام ایک طرف رکھ دیئے اور عہد کیا کہ ثروت میرٹھی کے ادھورے کام جب تک پائے تکمیل کو نہ پہنچ جائیں اپنے کام نہیں کروں گی اور الحمد للہ اس کام کی ابتدا "انتخاب کلام ثروت میرٹھی" سے کی۔ ان کا علمی ادبی ذخیرہ کافی تھا کئی برس اسے سمجھنے میں لگ گئے میرے لیے یہ کام مشکل تھا۔ کئی ادیبوں سے مشورے لیے کہ کیا یہ کام اہم ہے۔ بہت مثبت آراء ملیں اور میں جٹ گئی بہت سے مراحل سے دوچار ہوئی آخر کار "علم البیان" کی شکل میں یہ تحقیق بھی مکمل ہوئی جسے قومی اردو کونسل نے بہت اہتمام سے شائع کیا۔ یہ طالب علموں نیز ادب زبان اور عروض کے شائقین کے لیے ایک اہم کتاب ہے۔ یہ کام میرے لیے ایک تجربہ تو تھا ہی بہت بڑا چیلنج بھی تھا کیونکہ یہ موضوع میرا نہیں تھا۔ اس دوران مجھے بہت کچھ سیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا۔ ادبی زندگی میں اس سے مجھے کیا مقام حاصل ہوگا ایسا میں نے سوچا نہیں میرے لیے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کام سے مجھے ذہنی آسودگی نصیب ہوئی۔

☆ عالم فاضل عروض دان اور سحبان الہند ثروت میرٹھی کی بیٹی کے شعری محاسن میں تکرار کی نشاندہی کن حوالوں سے کی جاتی ہے اور آپ اس کا سدباب کس طور کیا کرتی ہیں؟

☆☆ تکرار یا صنعت تکرار کو شاعری میں حسن تسلیم کیا گیا ہے۔ اس سے شعر میں ایک خاص لطف کے ساتھ ساتھ بات میں زور پیدا ہوتا ہے۔ اس کا استعمال اکثر اوقات لاشوری اور کبھی کبھی شعوری طور پر ہوا ہے۔ لیکن آپ کے سوال کا دوسرا حصہ، جس میں اس کے سدباب کی بات آپ نے کی ہے، تضاد پیدا کر رہا ہے۔ اگر یہ صنعت، خوبی یا حسن ہے تو اس کے سدباب کا سوال کیوں۔۔۔؟ کہیں آپ کا مطلب مضامین یا مفاہیم کی تکرار سے تو نہیں۔۔۔۔! اگر آپ کا اشارہ اس طرف ہے تو۔۔۔ عرض کردوں کہ یہ بڑا فطری معاملہ ہے۔ ایک ہی موضوع یا مضمون کا اعادہ عام بات ہے۔۔۔ کبھی تشنگی کی وجہ سے، کبھی کسی واردات یا تجربے سے بار بار گذرنے کے سبب یہ تکرار در آتی ہے۔ اور اگر کسی دوسرے شاعر سے خیال ٹکرانے کی بات آپ کر رہے ہیں تو یہ ایک الگ موضوع بحث ہے۔۔۔ تجربات, واقعات, محسوسات میں یکسانیت تو ہوتی ہی۔۔۔ اور ہر شاعر اسے اپنے طور پر شعر میں ڈھال سکتا ہے۔۔۔ معاملہ توارد کا بھی ہوسکتا ہے۔ تکرار یا صنعت تکرار کو شاعری میں حسن تسلیم کیا گیا ہے۔ اس سے شعر میں ایک خاص لطف کے ساتھ ساتھ بات میں زور پیدا ہوتا ہے۔ اس کا استعمال اکثر اوقات لاشوری اور کبھی کبھی شعوری طور پر ہوا ہے۔ لیکن آپ کے سوال کا دوسرا حصہ، جس میں اس کے سدباب کی بات آپ نے کی ہے، تضاد پیدا کر رہا ہے۔ اگر یہ صنعت، خوبی یا حسن ہے تو اس کے سدباب کا سوال کیوں۔۔۔؟ کہیں آپ کا مطلب مضامین یا مفاہیم کی تکرار سے تو نہیں۔۔۔۔! اگر آپ کا اشارہ اس طرف ہے تو۔۔۔ عرض کردوں کہ یہ بڑا فطری معاملہ ہے۔ ایک ہی موضوع یا مضمون کا اعادہ عام بات ہے۔۔۔ کبھی تشنگی کی وجہ سے، کبھی کسی واردات یا تجربے سے بار بار گذرنے کے سبب یہ تکرار در آتی ہے۔ اور اگر کسی دوسرے شاعر سے خیال ٹکرانے کی بات آپ کر رہے ہیں تو یہ ایک الگ موضوع بحث ہے۔۔۔ تجربات, واقعات, محسوسات میں یکسانیت تو ہوتی ہی۔۔۔ اور ہر شاعر اسے اپنے طور پر شعر میں ڈھال سکتا ہے۔۔۔ معاملہ توارد کا بھی ہوسکتا ہے۔

☆ آپکے ہاں زمانے کی بے ثباتی بلکہ بے وفائی نے جس طور جگہ پائی ہے اس کے بعد تفصیل نہ جاننا، قاری کو اندھیری گلی میں رکھنے کے مترادف ہے؟

☆☆ زمانے کی بے ثباتی تو تخلیق کار کا مقدر ہے۔ یہی بے ثباتی تخلیق کار کو عام انسان سے منفرد کرتی ہے۔ بے وفائیاں بھی زندگی کا حصہ ہیں۔ اس کی تفصیلات میں نہ جائیں اس کے اثرات میری شاعری میں بھی ملیں گے اور افسانے میں بھی۔ میرے ہی کیا ہر قلمکار کے ہاں ملیں گے۔ یہی رنگ ہیں زمانے کے۔ صرف معشوق یا محبوب کی بے وفائی کی بات کیا کرنا اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ ویسے بھی اس بے ثباتی میں ذات کا کم کائنات کا زکر زیادہ چھپا ہوتا ہے۔ تو جناب اندھیری گلی سے باہر نکل آئیں ورنہ محبوب پر حرف آجائے گا۔

☆ کچھ تفصیل رومان سے حقیقت کے سفر کی بیان فرمادیجئے ؟

رومان۔۔۔؟؟ واہ کتنا دلکش لفظ ہے یہ۔ اس سے بھلا کون خالی ہے۔ زندگی میں رومان نہ ہو تو زندگی بنجر ہے۔ اگر رومان نہیں تو خوشیوں کا احساس، درد کی کسک کچھ بھی نہیں۔ میں ایک آرٹسٹ ہوں مجھے اقرار ہے، میرے روم روم میں رومان بھرا ہوا ہے اور یہ احساس مجھے خدا نے عطاء کیا ہے۔ رومان کے احساس سے ہی مجھ پر بے خودی طاری ہونے لگتی ہے۔ یہ رومان قدرت کے لمس کا ہے۔ پیڑ پودے، رنگ برنگے پھول، طرح طرح کے پرندے، لہراتی ندیاں، پہاڑ اور تلہیٹیاں، جھرنے، ان کا ترنم، قدرت کی گود، آسمان میں بادل، بارش کی بوندیں، چاندنی راتیں، کہرا، دھند، ان میں سے کچھ بھی مل جائے تو میں خود کو بھول جاتی ہوں اور انہیں میں خود کو تلاش کرتی ہوں۔ یہ سب مجھ سے روبرو ہوتے ہیں باتیں کرتے ہیں ہواؤں کی سرگوشیاں کسقدر منفرد ہوتی ہیں؟ اودے پور کی ہوائیں کچھ اور کہتی ہیں تو کشمیر کی ہوائیں کچھ اور، شیلانگ کی ہوائیں کچھ اور سرگوشیاں کرتی ہیں تو تاشقند کی کچھ اور۔ یقین کیجیے پھول مجھ سے بار بار کہتے ہیں ہمیں چوم لو بس ایک بار، اور ایک بار، اور میرے لمس سے وہ اور مسکرا کر کھل اٹھتے ہیں پتی پتی. پرنکھار آجاتا ہے ان کے لمس سے میری زندگی امنگوں سے بھر جاتی ہے۔ احساسات میں سرشاری آجاتی ہے۔ میرا رومان سے حقیقت تک کا سفر یہی ہے اور یہ کبھی ختم ہونے والا نہیں جیسے جیسے عمر پروان چڑھ رہی ہے یہ رومان بھی پروان چڑھ رہا ہے لیکن ہم دنیا میں اس قدر پھنس گئے ہیں کہ یہ رومان پرور لمحات میسر آنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔

☆ آپکی شاعری میں کبھی کبھی، کہیں کہیں جس دلبر کی نشاندہی جناب معین شاداب نے فرمائی ہے اس کے حوالے سے بھی اشتیاق فطری ہے۔؟

☆☆ ھاھاھاھاھاھا کیا بات ہے؟ دیکھئے جناب یہ بڑا ذاتی سا معاملہ ہے۔ دلبر دل میں رہتا ہے۔ یہ مرحلے بہت عجیب وغریب ہوتے ہیں۔ شاعری کی دنیا میں تجربات، تصورات دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ شاعری میں عشق اور دلبر کا ذکر کوئی نیا تو نہیں؟ پھر مجھ سے وضاحت کیوں؟ یہ شاعر حضرات قاری کو کہیں بھی پھنسا دیتے ہیں۔ آپ نے معین شاداب صاحب کے توسط سے دلبر لفظ پڑھ لیا اور بس۔۔۔؟ لیکن جناب دلبر ہے کہاں؟؟ شعر ملاحظہ فرمائیں:

پہلی سی چاہتوں کے وہ منظر نہیں رہے
عاشق تو بے شمار ہیں دلبر نہیں۔ رہے

امید ہے آپ اس شعر کی گہرائی تک پہنچ گئے ہوں گے۔

☆ کس بشر کا کون سا تہذیبی خسارہ اپ کو بے چین رکھتا ہے اور جا بجا آپکی شاعری میں نمایاں ہوکر سامنے آتا ہے؟

☆☆ کسی خاص بشر کا تو نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ تہذیب کسی ایک بشر کی تو نہیں ہوتی یہ تو صدیوں پرانی روایات کا سلسلہ ہے۔ اس میں ہر بشر شامل ہے اور ہر بشر پریشان ہے۔ شاعر یا افسانہ نگار چونکہ زیادہ حساس ہوتا ہے چیزوں کو جلدی

محسوس کر لیتا ہے چہرے پڑھ لیتا ہے دل میں بغیر آہٹ کئے جھانک لیتا ہے اس کی نگاہ تیز ہوتی ہے اس کی نظر سے کچھ چھپا نہیں رہتا۔ سماجی رشتوں کا کھوکھلا پن کڑوی کسیلی سچائیاں، خود غرضی، بے مروتی، ریشم کی ڈور کی طرح پھسلتے ٹوٹتے بکھرتے رشتے، اپنے گھر میں غیر محفوظ بچیاں اور والدین کی بے حرمتی، اولڈ ہوم میں بڑھتی تعداد، فسادات میں نشانے پر عورت، تعلیم کی کمی، بازار واد میں عورت کی نمائش، بچوں کا عمر سے پہلے بالغ ہو جانا کیا یہ سب باتیں بچپن نہیں کرتیں بلکہ کہیں کہیں کبھی کبھی تو بیزاری بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو ہم انسان کہلانے لائق نہیں قلمکار تو کیا بنیں گے؟ سماج کا یہ درد قلمکار کی تخلیقات میں نمایاں ہونا فطری ہے وہ دعائیہ کلمات میں خدا تک سے شکوہ کر بیٹھتا ہے:

عہد نو راس کب آیا ہمیں بھی یارب
اس نئے وقت کو پہلے سا پرانا کر دے
ہم کو یہ شہر ہوس کاٹ رہا ہے کب سے
ہم فقیروں کا کہیں اور ٹھکانا کر دے

بہت شکریہ آپ نے میری اس بے چینی کو جلا بخشی۔

☆ یقیناً آپ نے سفرنامہ از بکستان اور تاشقند پر کافی کچھ لکھا ہے پھر بھی ہماری خواہش ہے کہ تاشقند اور از بکستان کے لوگوں اور تہذیبی وتمدن کے حوالے سے آپ کے تاثرات ومشاہدات آپ کی زبانی سنیں؟

☆☆ "گرد آوارگی" (سفرنامہ از بکستان) شایع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ تاشقند کی یہ گرد آوارگی پروفیسر قمر رئیس مرحوم کی بدولت نصیب ہوئی۔ ان کی کتاب انقلاب سے انقلاب تک " پڑھنے کا موقع ملا تو تاشقند خوابوں میں بس گیا۔ قمر صاحب تاشقند انڈین کلچرل سنٹر کے ڈائریکٹر تھے بس منہ سے نکل گیا تاشقند دیکھنے کی خواہش ہے اور بس۔۔۔ اکتوبر 1999 میں ہم دونوں کو تاشقند جانے کا موقع میسر آیا۔ تاشقند اور سمرقند دیکھا تو محسوس ہوا خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں داخل ہو گئے ہوں اور یہ حقیقی دنیا خوابوں کی دنیا سے کہیں زیادہ خوبصورت اور سحر انگیز ہے۔ ازبکی عوام، آرٹسٹ اور ادیبوں کا ہندوستانی کلچر سے لگاؤ دیکھتے ہی بنتا ہے۔ وہاں ایسے قلمکار ہیں جنہوں نے مہا بھارت، رامائن اور باغ وبہار کا ترجمہ ازبکی زبان میں کیا ہے۔ وہاں اسکولوں میں اردو ہندی پڑھائی جاتی ہے۔ وہاں لال بہادر شاستری شاہراہ اور کوچۂ غالب ہیں۔ وہاں عوام ہماری تہذیب اور وراثت کے شیدائی ہیں۔ ہند ازبکی تعلقات کی گہرائی، سچائی میرے تصور سے کہیں زیادہ نکلی۔ وہاں کے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے ہندوستانیوں کو بہت عزت واحترام سے نوازتے ہیں۔ ادیبوں سے ملاقاتیں، حسین مسکراتے چہرے، بارونق محفلیں، کھنکتے نقرئی قہقہے، پوری آب وتاب اور تمام رعنائی کے ساتھ میرے دل میں بسے ہیں بالکل پہلی محبت کی طرح۔ نہیں بھول سکی کبریائی چور باغ میں نیشنل رائٹرز یونین میں قلمکاروں کی محفل صدر عبداللہ عاریپوف کی ضیافت، خوش مزاجی، خوش اخلاقی اور تحائف۔ یاد آتے ہیں سلیمان یلدوش کے محبت سے لبریز یہ جزباتی جملے جس سے میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں " نگاراں ہماری وہ گمشدہ بہن ہے جس کی ہمیں صدیوں سے تلاش تھی" نہیں بھولی ڈاکٹر عزیزہ خانم اور طاہر جان جیسی تاریخ ساز شخصیات جن میں پورا ایک عہد سمایا ہوا ہے۔ نہیں فراموش کر سکی سمرقند انسٹیٹیوٹ آف فارن لینگویجز کے ریکٹر یوسف عبداللہ ئف کی سحر انگیز شخصیت، ان کے کام اور منفرد ادارہ، یہاں اٹھارہ زبانیں نہ صرف پڑھائی جاتی ہیں بلکہ فلموں اور لیکچرز کے ذریعہ ان ملکوں کی تہذیب سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے۔ اس درس گاہ کی عمارت بہت خوبصورت اور زبردست نظام۔ آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں معروف آرٹسٹ اور ادیب دادا خان نوری کے قہقہے اور اداس کر دیتی ہے ان کی غم شناسی۔ گھر کر گئے ہے میرے دل میں غموں میں مسکراتی ان کی میزبانی اور قدر دانی۔ ان کے ڈاچے کی سیر اور ان کے ہاتھ کا ازبکی پلاو بھلا کیسے بھول سکتی ہوں تاشقند انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز میں وہ پروقار محفل بھی اکثر یاد آتی ہے جہاں آزاد شاتوف اور تش مرزا جیسے ادب کے معماروں سے نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ تہذیبی ادبی اور ثقافتی ورثہ پر بہت اہم گفتگو بھی ہوئی یہاں سورداس اور تاج محل کی تصویر دیوار پر آویزاں دیکھ کر حیرانی بھی ہوئی تاج محل کو ازبکی اپنے اجداد کی میراث مانتے ہیں۔ ازبکستان کی سر زمین پر انڈین کلچرل سینٹر میں دسہرہ کی تقریب اور ہندی دوس میں شرکت کا موقع ملا۔ ہندوستانی ازبکی تہذیب، ثقافت اور ورثہ کا پھیلاؤ، لین دین، اور اس کی اہمیت کا اندازہ وہاں دیکھ کر ہی ہو سکا۔ ریاض اللہ کی آواز میں ہندوستانی گانوں کی رمق، منگلا بھٹ کے رقص اور گھنگروؤں کی جھنک میں آج بھی کھو جاتی ہوں۔ دلا رام کی دلفریب مسکراہٹ، اور محیا عبدالرحمانوا۔ سے بے تکلف ملاقات اور راز ونیاز کی باتیں آج بھی دل کو گرما دیتی ہیں۔ علی شیر نوائی تھیٹر، تیمور میوزیم، گور امیر، مدرسہ الغ بیگ، شاہ زنداں کا مزار، حضرت محمد اسمٰعیل بخاری محدث کا مزار، تاشقند اکیڈمی آف آرٹس، کے علاوہ بہت کچھ دیکھا اقتصادی حالات کمزور ہیں روزگار کی کمی ہے جس کی کئی وجہیں ہیں بہر حال عوام محنت پر یقین رکھتی ہے۔

ازبکستان کی سب سے متاثر کن ناقابلِ فراموش سوغات وہاں کا قدرتی حسن اور لوگوں کا ایمان ہے جو خلوص ومحبت اور مہمان نوازی پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ گھریلو ازبکی تقریبات، تاریخی عمارتیں، بازار شاہراہ ریشم۔، نیلے گنبد جو مقبروں پر ہوتے ہوئے بھی زندگی کی علامت ہیں۔ رہن سہن آداب و اخلاق، سنہری دھوپ، نشیلی ہوائیں، ازبکی کھانوں کی لزت اور خوشبوئیں، مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔۔۔ وہاں کی عوام اور ہواؤں نے جو محبت بھرے پیغام میرے ذریعے بھیجے یہ ان کی ہلکی سی جھلک ہے۔ اور تفصیلات ممکن نہیں۔

☆ "چہارسو" کے قارئین کے اشتیاق کو پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ روشنی اپنے تنقیدی وجدان اور آپکی جانب سے ناقدین وقت کی بے مروتی پر ضرور ڈالئے؟

☆☆ چہارسو کے قارئین کو محبت بھرا سلام۔ میرے تنقیدی وجدان میں کوئی بہت سرمایہ نہیں بس اتنا ہی ہے جتنا ایک تخلیق کار کے پاس ہونا چاہئے البتہ منٹو کی افسانہ نگاری پر میرا مقالہ ضرور ہے۔ چیزوں کو اس سطح سمجھ لینا جس طرح

وہ ہیں نہ کہ جیسیا ہونا چاہئے کو اہمیت دیتی ہوں۔ میرے نزدیک بہتر تنقید وہ ہے جو تخلیق کو اس وقت اور زمانے میں رکھ کر پرکھے جس وقت کی وہ ہے اور اس کے منفی اور مثبت رویئوں کو پیش کرے جہاں تک ممکن ہو رجکشن سے بچے اور تخلیقی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے خامیوں سے آگاہ کرے ظالمانہ نہیں عالمانہ نظریہ کو بروئے کار لائے ایسا کرتے وقت قلمکار کی زندگی اس کی کڑواہٹ اور تخلیقی پہلوؤں کا باریک بینی سے مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ ناانصافی نہ ہو سکے۔ ناقدین وقت کی بے مروتی کا رونا کب تک روئیں گے میں پرواہ نہیں کرتی تو شکوہ کیا کروں گی؟ جہاں تک میرا ذاتی معاملہ ہے میری تحریروں کو ناقدین نے بھی سراہا ہے۔ تخلیقی غزا اپنے قاری سے مل جاتی ہے اس لیے ناقدین کے منفی رویئوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں جاتا۔ لیکن پھر بھی یہ خواہش ہے کہ رشتے، دوستی اور مفاد سے ہٹ کر ایماندار ناقد ادب کو وقار بخشیں اس کی ہر دور میں اہم ضرورت رہی ہے پرانے بت ٹوٹ جاتے ہیں نئے آجاتے ہیں امید کی جاسکتی ہے کہ نوجوان نسل کا رجحان اس طرف بڑھے گا اور وہ سنجیدگی سے اس بارے میں سوچیں گے۔۔

☆ کچھ احوال "بنات" کے قیام،۔ دائرہ کار اور نتائج کی ہمارے قارئین سے شیئر کیجیے؟

☆☆ "بنات" (بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم) اردو کی خواتین قلمکاروں کی ایک تنظیم ہے اس کا قیام ۱۳۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء کو دہلی میں ہوا۔ اس میں ملک اور بیرون ملک کی ایک سوتیس خواتین ادیبائیں شامل ہیں۔ یہ پلیٹ فارم عالمی سطح پر "بہناپا" فروغ دینے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اردو زبان و ادب کے فروغ میں خواتین قلمکاروں کی خدمات کا اعتراف، نسائی فکر کی تلاش، اس کی ترویج و اشاعت اس تنظیم کا نصب العین ہے۔ سسٹرہڈ اور استری ومرش جیسی کسی تحریک کے فقدان نے اس نسائی ادبی تنظیم کی داغ بیل ڈالنے میں اہم رول ادا کیا۔ ادب برائے تعمیر، ادب برائے ادب، ادب برائے سماجی ارتقاء، ادب برائے امن و آشتی، ادب برائے انسانیت، ادب برائے باہمی اتفاق اور ادب برائے قومی خیر سگالی کو فروغ دینا اس تنظیم کے اغراض و مقاصد ہیں۔

کسی فرد واحد یا ادارے کے رحم و کرم کے بجائے خواتین قلمکار اپنی سوچ فکر اور اپنی تخلیقات کے حوالے سے یکجا ہوں اور ایک مثبت اور مربوط تنظیم کھڑی کریں تاکہ آنے والی نسل اس سے استفادہ کر سکے۔ یہی اس تنظیم کی روح ہے۔

"بنات" اردو کے شہد کی افزائش کے لیے ایک ہنی ویب سجانے کی تحریک ہے جس کی معمار خواتین قلمکار ہیں۔ اس کے لیے ایک واٹس اپ گروپ ہر وقت ایکٹو رہتا ہے جس پر ادبی ایونٹ ہوتے رہتے ہیں اس کے علاوہ "بنات لائیو" ف ب پیج بھی ایکٹو ہے جہاں بنات کی تمام سرگرمیوں کی رپورٹ آڈیو ویڈیو خوشی اور غم کے لمحات شیئر کیے جاتے ہیں۔

ادبی نشستوں کے علاوہ بنات ایک سال میں دو پروگرام بڑے پیمانے پر مختلف شہروں میں کرتی آئی ہے "یوم خواتین" اور "یوم تاسیس" دور دراز شہروں سے بہنیں شرکت کرتی ہیں۔ بنات کے قیام کا مطلب مرد مخالف احساس قطعی نہیں ہے۔ بنات اپنے پروگراموں میں ادیب بھائیوں کو بھی مدعو کرتی ہے اور بہنیں ان کے اظہارِ خیال سے فیضیاب بھی ہوتی ہیں۔

"بنات" نے ابتدا سے ہی ایوارڈ دینے کا سلسلہ بھی قائم کیا ہے۔ فکشن، شاعری، سماجی خدمات، اردو زبان کی ترویج میں کارہائے نمایاں انجام دینے پر بنات نشان محبت کے طور پر سرٹیفکیٹ مومنٹو اور شال پیش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بنات نے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کی بھی ابتدا کی ہے یہ ایوارڈ معروف فکشن نگار رتن سنگھ جی کو پیش کیا جاچکا ہے۔

بنات نے سالانہ کتابی سلسلہ بھی شروع کیا ہے جس کی پہلی کتاب "یادوں کے جھروکے" منظر عام پر آ گئی ہے ۱۳۱ اکتوبر ۲۰۲۲ء کو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ میں بنات کے چھٹے یوم تاسیس کے موقع پر اس کی رسم رونمائی ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں بنات کی اڑتالیس بہنوں کے مضامین شامل ہیں کتاب بہت دلچسپ ہے اور کافی مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ اس تنظیم کو شہرت یافتہ معتبر سینئر قلمکار بہنوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ جن کی شفقت کے سائے میں مرکزی اور ریاستی سطح پر اردو کی خواتین قلمکار تاریخ رقم کریں گی۔ ان شاءاللہ!

| | |
|---|---|
| بنات کی صدر | نگار عظیم |
| نائب صدر | عزرا نقوی |
| سیکریٹری | تسنیم کوثر |

☆ سوال مشکل بھی ہے اور نازک بھی مگر اس سے مفر ممکن نہیں۔ بطور سینئر ادیب، شاعر اور نقاد، آپ کے خیال میں بھارت کا سیکولر تشخص اور گنگا جمنا تہذیب کو آنے والے زمانے میں کس طرح کے خطرات ہیں اور ان سے کس طور بچا جاسکتا ہے۔؟

☆☆ سوال مشکل اور نازک اس لیے ہے چونکہ حالات مشکل اور نازک ہیں۔ بھارت کا سیکولر تشخص اور گنگا جمنی تہذیب کو کوئی خطرہ نہیں ہے حالات کبھی یکساں نہیں رہتے بدلتے رہے ہیں بدلتے رہیں گے ابھی ان چیزوں پر کچھ عناصر حاوی ہیں ہم وقت سے ناامید نہیں۔ اس زہر کا تریاق بھی پیدا ہوگا ان شاءاللہ۔ تاریخ مٹانے کی کوششیں ہوتی رہیں لیکن سچ بہر حال زندہ رہتا ہے۔ چند مٹھی بھر افراد کے پروپیگنڈہ کو چھوڑ کر بھارت کے عوام آج بھی گنگا جمنی تہذیب، میل ملاپ، محبت اور بھائی چارے پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک ساتھ تہوار مناتے ہیں ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے ہیں گلے ملتے ہیں کچھ نہیں بدلا۔ یہ سب سیاسی ہتھکنڈے ہیں اور کچھ نہیں۔ ادھر چند ماہ میں حالات کچھ بدلے ہیں عوام کو سمجھ میں آرہا ہے۔ ظلم، جھوٹ اور غلط پر عوام آواز اٹھا رہے ہیں شاعر ادیب اور بطور ناقد ہمارے ہاتھ میں قلم ہے سچائی دکھاتے رہیں گے محبتیں لکھتے رہیں گے محبتیں جیتے رہیں گے محبتیں بانٹتے رہیں گے۔ ہمیں سرکاروں یا کسی دوسرے پر تکیہ کرنے کے بجائے خود آگے بڑھنا ہوگا ہندوستان سیکولر ملک ہے اور رہے گا ان شاءاللہ اس پر یقین ہے۔ ہم اس دیش کے واسی ہیں جس دیش میں گنگا بہتی ہے۔ بیشتر برادران وطن ہمارے محافظ ہیں۔

باقی صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ کیجیے

# "نگارخانۂ دل"

فاری شا
( لندن )

پہلی سی چاہتوں کے وہ منظر نہیں رہے
عاشق تو بے شمار ہیں دلبر نہیں رہے

اس عہد نو میں اور تو سب کچھ ملا مگر
شرم و حیا کے قیمتی زیور نہیں رہے

یہ پھول یہ چراغ یہ تاروں کا قافلہ
سب کچھ ہے تیرے خواب کے پیکر نہیں رہے

دل کے نگر میں قید ہیں چاہت کی بلبلیں
وہ موسم بہار کے منظر نہیں رہے

لائی تھی جتنی سیپیاں سب بانجھ ہو گئیں
حیران ہوں کسی میں بھی گوہر نہیں رہے

میں نے نگار سانسیں بھی کر دیں تھی جن کے نام
وہ ایک پل کو بھی مرے ہو کر نہیں رہے

..... ○ .....

☆

جنون دل کا ابھی ترجمان باقی ہے
لبوں پہ مہر لگی ہے زبان باقی ہے

گئی رتوں کا ابھی تک نشان باقی ہے
گلی میں ایک شکستہ مکان باقی ہے

نہ پوچھیے ابھی عنوان میرے فسانے کا
یہ ابتدا ہے ابھی داستان باقی ہے

ڈبو دیا تھا کبھی جس کو تند طوفاں نے
اسی سفینے کا اک بادبان باقی ہے

ہزار بار زمانے نے کروٹیں بدلیں
ہمارے سر پہ وہی آسمان باقی ہے

اک آشیانے پہ بجلی گری تو رونا کیا
ہمارے واسطے سارا جہان باقی ہے

نگار خانۂ دل میں بسی ہے ویرانی
مکیں چلا گیا لیکن مکان باقی ہے

○

☆

گزر گیا جو زمانہ عجیب لگتا ہے
گئی رتوں کا فسانہ عجیب لگتا ہے

تم اپنے ساتھ ہی لے جاؤ اپنی یادوں کو
کہ چشم نم کا چھپانا عجیب لگتا ہے

گلہ کیا نہ کبھی تم سے بے وفائی کا
لبوں پہ آہ کا آنا عجیب لگتا ہے

نہ ہاں نہ ہوں نہ کوئی سلسلہ نگاہوں کا
یہ خامشی کا فسانہ عجیب لگتا ہے

کبھی زمانے کی ہر شے سے پیار تھا مجھ کو
تیرے بغیر زمانہ عجیب لگتا ہے

ہر ایک زخم میرا پھول بن گیا شاید
کہ اب بہار کا آنا عجیب لگتا ہے

کسی کے پیار کا شعلہ بجھا دیا تھا نگار
وہ شعلہ پھر سے جلانا عجیب لگتا ہے

○

مدت ہوئی ہے وہ مرا مہماں نہیں ہوا — گھر میں اسی سبب سے چراغاں نہیں ہوا
شامیں اداس راتیں بھی بے نور ہیں بہت — وہ مدتوں سے بزم نگاراں نہیں ہوا
آئے گا وہ ضرور مری انجمن میں پھر — دل میرا اس لیے بھی ہراساں نہیں ہوا
میری اَنا نے راہ میں دیوار کھینچ دی — اس بار بھی سفر مرا آساں نہیں ہوا
اس بار بھی بہار نئے زخم دے گئی — اس بار بھی وہ درد کا درماں نہیں ہوا
میں نے بھی اپنی پلکیں بھگوئیں نہیں نگار — وہ بھی بچھڑتے وقت پریشاں نہیں ہوا

..... ○ .....

☆

صرف خاکہ ابھر رہا ہے ابھی
کوئی چہرہ کہاں بنا ہے ابھی
ریزہ ریزہ بکھرتی آنکھوں میں
گھر کا سپنا بسا ہوا ہے ابھی
کیسے کہہ دوں بدل گیا موسم
زخم دل میں سجا ہوا ہے ابھی
کن رتوں کا حساب دوں اس کو
سبز موسم کہاں ملا ہے ابھی
رات آدھی گزر چکی ہے مگر
اک دریچہ کھلا ہوا ہے ابھی
شمعیں سب بجھ گئیں خموش ہے رات
اور دل ہے کہ جاگتا ہے ابھی
کیا ملیں تجھ سے تو نے خود کو نگار
معتبر ہی کہاں کیا ہے ابھی

○

☆

دل کے موسم کو کسی طور سہانا کر دے
زندگی کرنے کا کوئی تو بہانا کر دے
ہم کو یہ شہر ہوس کاٹ رہا ہے کب سے
ہم فقیروں کا کہیں اور ٹھکانا کر دے
مانگنے چل تو دیئے اس سے دل اپنا واپس
وہ مگر پھر نہ کوئی تازہ بہانا کر دے
عہد نو راس کب آیا ہمیں بھی یارب
اس نئے وقت کو پہلے سا پرانا کر دے
جو فسانوں کو حقیقت میں بدل دیتا ہے
یہ بھی ممکن ہے حقیقت کو فسانہ کر دے
فکر کو میری وہ تاثیر عطا کر یارب
میرے شعروں کو جو مقبول زمانہ کر دے
زندگی اپنی تو گزری ہے حوادث میں نگار
میرے بچوں کے مقدر کو سہانا کر دے

○

معجزہ یہ بھی دکھایا میں نے  اپنے قاتل کو رلایا میں نے
خود ہی زخموں سے سجایا دل کو  اور پھر جشن منایا میں نے
زیست بے نور ہوئی جاتی تھی  پھر لہو دل کا جلایا میں نے
چاند اور پھول ہی کیا ہر شے میں  بس تیرا عکس ہی پایا میں نے
تیری یادوں کو سجا کر دل میں  اک صنم خانہ بنایا میں نے
شہر احساس تھا وہ خود بھی نگار  بت کدہ دل کا جو ڈھایا میں نے

.....○.....

☆

ذات کی سیر پہ نکلوں مری ہمت ہی نہیں
اس بیاباں سے گزرنے کی جسارت ہی نہیں
زندگی میں نے قناعت کا ہنر سیکھ لیا
اب تیرے ناز اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں
جب بھی ملتے ہیں چمک اٹھتی ہیں آنکھیں ان کی
اور دعویٰ ہے انہیں ہم سے محبت ہی نہیں
دل تو کیا چیز ہے پتھر بھی پگھل جائے مگر
جذبۂ عشق میں تیرے وہ حرارت ہی نہیں
اپنے اشکوں سے بنا دیتے بیاباں کو چمن
کیا کریں ہم کو تو رونے کی اجازت ہی نہیں
معتبر بھی وہی ارباب نظر میں ٹھہری
جس کہانی میں کوئی حرفِ صداقت ہی نہیں
اس کی یاد آئی ہے مت چھیڑ مجھے باد صبا
تجھ سے پھر بات کروں گا ابھی فرصت ہی نہیں
گلشنِ دل پہ خزاؤں کا تسلط ہے نگار
کوئی خواہش کوئی ارماں کوئی چاہت ہی نہیں

○

☆

محرومیٔ نظر نے دلاسے دیئے بہت
یوں ہم نے آندھیوں میں جلائے دیئے بہت
وہ سلسلے وفاؤں کے سب رائگاں گئے
اس نے مجھے بساط کے طعنے دیئے بہت
دیدہ وری پہ اپنی بہت ناز تھا اسے
دیدہ وری نے ہی اسے دھوکے دیئے بہت
اللہ میری سادگی خود میں نے ہی اسے
غیروں سے رسم وراہ کے موقعے دیئے بہت
غم مستقل مزاج تھا ٹس سے نہ مس ہوا
میں نے اسے فرار کے رستے دیئے بہت
فصل بہار پر میں بھروسہ کروں تو کیوں
مجھ کو اسی بہار نے کانٹے دیئے بہت
شعلہ فشاں نہ کیوں میرا لہجہ ہو اے نگار
دنیا نے ہر قدم پہ شرارے دیئے بہت

○

- خاکہ -

# محبتوں کا پیکر

ڈاکٹر شمع افروز زیدی
(دہلی)

کتابی چہرہ، اس پر سنجیدگی کے ساتھ محبتوں کا رنگ گہرا، لمبے گھنے بال، ذہن محوِ خیال سرو قد، کھلتا ہوا رنگ، روشن آنکھوں میں خلوص، لبوں پر تیرتی نرم نرم مسکراہٹ، مسکراہٹ میں گھلی محبت کی دھیمی دھیمی آنچ، سہج سہج بات کرنے کا انداز کہ سرگوشیوں کا گماں ہونے لگتا ہے۔ یہ ہیں ''عکس''، ''گہن'' اور ''عمارت'' جیسے افسانوی مجموعوں کی مالک حقیقی کہانیوں کی خالق، منٹو کے سرمایۂ فکر و فن پر پی۔ایچ۔ڈی ایوارڈ یافتہ ''ہرچرن چاولہ فن و شخصیت''، ''وہ جو کہہ گئے'' کی مؤلفہ ''گردآوارگی'' کے ذریعے قارئین کو ازبکستان کی فضاؤں میں لے جانے والی ''بہادر شاہ ظفر شخصیت اور شاعری'' مونوگراف تیار کرنے والی ''کلام ثروت میرٹھی'' کو یکجا کرنے والی، ادب و آرٹ کی دلدادہ، بہترین استاد، اپنے فن میں طاق، تخلیقی نثر کی ایوارڈ یافتہ ملکہ مہر نگار جو ادبی حلقوں میں ''نگار عظیم'' کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔

نگار میری ان دوستوں میں سے ایک ہیں جن سے غیر مشروط محبت کی جاسکتی ہے، ان سے میری پہلی ملاقات معروف افسانہ نگار انور زنہت کے دولت کدے پر ہوئی اس وقت وہ خالص گھریلو عورت کا روپ دھارے، سادگی کا پیکر بنی اپنے سب سے چھوٹے بیٹے حسن کو گود میں اٹھائے انور زنہت سے محوِ گفتگو تھیں، رسمی سا تعارف ہوا۔

اس پہلی ملاقات میں نہ جانے کیا بات اور کیسی اپنائیت تھی کہ لمحوں کی ملاقات برسوں پر محیط لگی۔ پھر یہ سلسلہ دراز سے دراز ہوتا چلا گیا۔ میں اپنی مصروفیتوں سے وقت چُرا کر کبھی ان کے یہاں اور کبھی وہ میرے ہاں۔ ہماری ملاقاتیں اکثر غالب اکیڈمی کے پروگراموں میں بھی ہوتی رہتیں۔ ایسے ہی ایک پروگرام کے بعد غفنفر (جو اب خیر سے پروفیسر ہیں)، پیغام آفاقی (جنھیں ''مرحوم'' لکھتے ہوئے جی دکھتا ہے)، انجم عثمانی اور طارق چھتاری کو نگار نے اپنے آشیانے پر مدعو کرلیا یہ لوگ بھی باتیں کرنے کے موڈ میں تھے وقت بھی تھا اور موقع بھی۔ سب بٹلہ ہاؤس نگار کے ہاں اکٹھا ہوگئے۔ میں نے جیسے ہی جانے کے لیے اپنے گھر کی جانب قدم بڑھایا نگار نے نرمی سے میرا ہاتھ تھام لیا، اس ہاتھ تھامنے میں ایسی اپنائیت اور نظروں میں ایسا خاموش اصرار پنہاں تھا کہ میں انکار نہ کرسکی۔ دراصل آنکھوں کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے کچھ آنکھیں بولتی ہیں اور کچھ آنکھیں دیکھنے والے کو بولنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ نگار کی آنکھوں میں دونوں خوبیاں سمائی ہوئی ہیں۔ خیر یہ بات گزرے مدت ہوگئی لیکن آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔ وہ بھی کیا وقت اور زمانہ تھا ایک دوسرے کے افسانے اور کہانیاں سنجیدگی اور توجہ سے سنی جاتیں، گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ سب ہنسی خوشی تنقید برداشت کرتے، درمیان میں عظیم بھائی بھی مسکراہٹیں بکھیرتے رہتے پھر یوں ہونے لگا کہ میں کبھی کبھار بلکہ چھٹی والے دن چہل قدمی کرتی ہوئی اس کے ہاں پہنچ جاتی۔ دیکھتے ہی دونوں خوش ہوجاتے۔ ان دنوں میاں بیوی نے گھر کی چھت پر آرٹسٹک انداز میں چھوٹا سا کاٹیج بنا رکھا تھا جو انگور کی بیلوں سے ڈھکا ہوا خود کہانی کہتا محسوس ہوتا تھا۔ بیلوں کے سائے تلے بیٹھ کر خوب گپیں ماری جاتیں، کہانی بھی سنی جاتی، چاروں جانب گملوں میں انواع واقسام کے پودے اور پھول اپنی بہار اور خوشبوئیں بکھیرتے کہ سارا ماحول معطّر معطّر اور پراسرار سا لگتا۔ ایسے میں عظیم بھائی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے بھاپ اٹھتی گرما گرم چائے پیش کرتے تو زبان سے بے ساختہ تعریف کے جملے نکل جاتے۔ نگار کا فون پر محبت بھرا اصرار ''آفس سے ادھر ہی آجانا''، ''کیا کوئی کہانی ہوئی ہے'' جواب اثبات میں ملتا جو کشاں کشاں مجھے ان کے دولت کدے پر لے جاتا۔ پھر شروع ہوتا باتوں کا طویل سلسلہ۔ نگار کچن میں مصروف، وہیں ہم دونوں کھڑے ہوکر باتیں کرتے، باتوں کے درمیان نگار بتاتیں: ''کبھی باورچی خانے میں ہنڈیا بھونتے، آٹا گوندھتے روٹی پکاتے یا سینکتے ہوئے، کبھی بلّیوں کو نہلاتے اور کبھی جوئیں صاف کرتے ہوئے خیال ابھرا بھرتا ہے اور آہستہ آہستہ ذہن میں کہانی پکنا شروع ہوجاتی ہے جب اچھی طرح پک جاتی ہے تو الفاظ خود بخود کاغذ پر اترنے کے لیے بے چین ہوجاتے ہیں۔'' کسی نے کیا خوب کہا ہے ''باورچی خانہ عورت کا دارالفکر ہے، نئے نئے مضامین یہیں کام کرتے ہوئے ذہن میں آتے ہیں''۔ میں نے یہ سچ ہوتے دیکھ بھی لیا۔ نگار کا ٹھہرا ٹھہرا دلآویز اندازِ گفتگو ان کی کہانیوں میں بھی جاری وساری ہے۔ وہ اپنے انداز نگارش کی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ سوچ سمجھ کر واقعات کو اپنے اندر جذب کرکے کہانی کی بُنت کرتی ہیں۔ جب تخلیقی جذبہ انھیں زیادہ بے چین کرتا ہے تبھی کہانی لفظوں کا روپ دھارتی ہے اور پھر گہن، عکس، حصار، پھانس اور جشن جیسی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔

نگار کے پاس الفاظ کا ذخیرہ اور تجربات کا خزینہ ہے، ان کی کہانیوں میں بعض اوقات جذباتی مقام بھی آتے ہیں لیکن وہ ایسے مواقع پر جذباتی دھارے میں بہنے کے بجائے ان تمام حقیقتوں کو ساتھ لے کر چلتی ہیں جن کی روزمرہ زندگی میں اہمیت ہے۔ کرداروں کی نفسیات اور سچ کو حقیقت کی ترازو میں تولنے کے ہُنر سے وہ یوں واقف ہیں جیسے کہانی کہنا ان کے لیے سانس کی آمدورفت کا ذریعہ ہے۔ نگار کے افسانوں میں کسی نہ کسی نوعیت کا تجربہ یوں سمایا ہوا ہے جو قاری اور فنکار کے درمیان رشتے کو استحکام بخشتا ہے۔

نگار اپنے افسانوں کے سبب اردو کے حلقوں میں گفتگو کا موضوع بھی بنی ہیں کہیں سے یہ آواز ابھرتی ہے کہ نگار بے باک افسانہ نگار ہے تو کہیں سے یہ آواز کانوں میں پڑتی ہے کہ ان کی کہانیوں میں جنسیت ہے، منٹو کو پڑھتے

پڑھتے موصوفہ نے اپنے افسانوں میں بھی جنسیت کو برتنا شروع کر دیا ہے لیکن میں کہتی ہوں کہ نگار کی گہن عکس، جشن اور بیل جیسی کہانیوں کو ہی نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے۔ لمحہ، تکمیل، عمارت اور زاہدہ مقدس جیسی کہانیاں بھی تو نگار کی ہی دین ہیں۔ میرے نزدیک 'جشن' اور 'سنگین جرم' فسادات کے موضوع پر نگار کی بہترین کہانیوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ ان کہانیوں کے کردار اور واقعات افسانے کے تانے بانے میں منسلک ہو کر یوں ہمہ گیر اثر انگیز اور خود کفیل ہو گئے ہیں کہ افسانہ نگار کی تخلیقی وسعتوں کا احساس کراتے ہیں۔ اس میں شک ہے بھی نہیں کہ نگار کے یہاں جرأت اظہار ہے۔ ''جشن'' ایک ایسی طوائف کی کہانی ہے جو نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے۔ وہ اپنی عزت کی حفاظت کی جدوجہد میں ناکام ہونے پر انتقام کی شدتوں کو چھو لیتی ہے یوں ''جشن'' ایک بولتی ہوئی زندہ کہانی بن گئی ہے اور جب لفظ بولنے لگتے ہیں تو ہر شے میں اپنا اور زندگی کا پرتو نظر آنے لگتا ہے اور جشن جیسی کہانی ہو جاتی ہے۔

جب خاموشیاں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی صدائیں دینے لگتی ہے تو ''عکس'' اور ''پھانس'' جیسی کہانیاں تخلیق ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ نگار کے اندرون میں ایک جنگ جاری ہے، مختلف کردار جب اسے بے چین کرتے ہیں تو ''بیل'' کہانی تخلیق ہو جاتی ہے۔ نگار کے تخلیق کردہ کردار انگلی پکڑ کر قلم کے سہارے اسے کاغذی سڑک پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں اور وہ سلیقے سے انھیں الفاظ کا جامہ عطا کر دیتی ہے۔ نگار کو اپنے ماحول اور اس میں پنپ رہے مسائل کا ادراک ہے۔ وہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی حالات سے بھی باخبر ہے۔ اس کی کہانیوں کا کینوس بڑا ہوتے ہوئے بھی اس کی سوچ متوازن ہے۔ چنانچہ اس کی تحریریں افراتفری کا شکار نہیں ہوتیں۔ نگار معاشرے کی دکھتی رگ اور خامیوں کی جانب اس طرح اشارہ کرتی ہے کہ اس میں آہستگی سے طنز کی شمولیت در آتی ہے۔ ''لمحہ'' کا ہیرو ندیم رات بھر جاگتا ہے اور کہانی کی ہیروئن پاکیزہ ذرا سی آہٹ پر چوکنا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ بڑے ہی نازک جذبوں کی کہانی بن گئی ہے۔

نگار کا ظاہر و باطن یکساں ہے لگتا ہے اس کا وجود محبتوں سے گوندھا گیا ہے۔

محبت عورت کی زندگی کا حاصل اور محور ہوتا ہے۔ نگار اپنے شوہر کی یادوں کو سینے سے یوں لگائے ہوئے تھیں کہ ایک ذرا سا ان کا ذکر چھیڑا اور آنکھیں برسنے لگتی تھیں۔ ان کی گفتگو اور مسکراہٹ میں بھی پہلے جیسی کیفیت نہیں رہ گئی تھی لگتا تھا بس جی رہی ہیں وہ تو بھلا ہو اپٹنہ کانفرنس کے دوران خواتین تنظیم کا خیال ذہن میں جاں گزیں ہو گیا یوں بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم (بنات) کا قیام عمل میں آیا۔ اب بنات کی صدر کی حیثیت سے ہر دم مصروف رہتی ہیں لگتا ہے ان کی بے قراریوں کو کچھ قرار آ گیا ہے۔ بنات کے بینر تلے دہلی کے علاوہ مختلف صوبوں میں یہ پروگرام کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ یقین ہے اس طرح مسلسل مصروف عمل رہ کر وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو وسعتیں بخشیں گی۔ نئی نئی بستیاں آباد کریں گی۔ اس سے ان کی آگہی اور سوچوں کا دائرہ مزید وسیع ہو گا ساتھ ہی ان کی تحریروں میں نئے نئے شگوفے کھلیں گے۔ ایسا میرا یقین ہے۔

- بقیہ -

## براہِ راست

☆ یہ فرمائیے! عالمی منظر نامے پر، ورلڈ آرڈر، نیو ورلڈ آرڈر، منی ورلڈ آرڈر، جنگ و جدل، مہنگائی، بیماری اور بے روزگاری کی جو ہاہا کار مچی ہے، اردو والوں کو اس حوالے سے سوچنے، سمجھنے یا لائحہ عمل طے کرنے کی کبھی توفیق ہو گی یا پہلے کی طرح آئندہ بھی "نوالہ تر" بننے کی ٹھانی ہوئی ہے؟

☆☆ ورلڈ آرڈر، نیو ورلڈ آرڈر، منی ورلڈ آرڈر یہ سیاسی اکھاڑے ہیں ان کا الگ ایک نظام اور پالیسیاں ہیں۔ ساری دنیا اس کے لپیٹے میں ہے۔ حالات کب کیا رخ اختیار کر جائیں نہیں معلوم۔ میں سمجھتی ہوں یہ معاملات اردو والوں کی پہنچ سے باہر ہیں اس کی کئی وجوہات ہیں۔ رہا جنگ و جدل، مہنگائی اور بیماری، یہ بھی صرف اردو والوں کے اختیار میں نہیں اس کا کسی زبان سے کوئی تعلق نہیں۔ بیماری، بے روزگاری سرکار کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے یہ اکنومیکل کرائسس ہے۔ نوٹ بندی کے بعد سے اب تک حالات قابو میں نہیں آئے۔ نیا اقتصادی نظام اور کورونا کی مار، اس میں اردو والے کیا کر سکتے ہیں۔ اردو والوں کی سب سے بڑی کمی ان کا اپنا کوئی پلیٹ فارم نہ ہونا ہے۔ ایوانوں تک آواز پہنچانے کے لیے دم چاہیے۔ اس بارے میں سوچنا اور قدم بڑھانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ میں سمجھتی ہوں "نوالہ تر" نہ بنیں اس کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔ حالانکہ اردو قلمکار ان تمام مسائل پر لکھتے رہے ہیں اور اب بھی لکھ رہے ہیں۔

# نگار عظیم کے چند افسانے

پروفیسر علی احمد فاطمی
(الٰہ آباد)

ہندی افسانوی ادب میں ایک خیال عام ہے کہ استری (عورت) اور کہانی لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ عورت اپنے آپ میں خود ایک پُرکشش اور پرتاثیر کہانی ہے اور مرد اس کے مقابلے معمہ بلکہ چیستان۔

اردو کے افسانوی ادب میں اس کو دوسری شکل میں یوں کہا گیا کہ اصل کہانی تو انسانی رشتوں کی ہوا کرتی ہے۔ ممتاز افسانہ نگار عابد سہیل جو ایک اچھے افسانہ نگار کے علاوہ ایک اچھے پارکھ بھی ہیں۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''دراصل افسانوی ادب میں سارا معاملہ رشتوں کا ہوتا ہے۔ رشتہ انسان اور انسان کے درمیان — انسان اور دنیا کے درمیان اور انسان کا خود اپنے ساتھ۔''

بابائے افسانہ پریم چند نے کافی پہلے ایک دوسرے انداز میں کہا تھا:

''روحانیت اور فلسفہ عالموں کے لیے ہے اور افسانوی ادب بنی نوع انسان کے لیے ہے۔''

یہ سبھی باتیں اپنی جگہ درست لیکن انسان اور افسانہ کے درمیان کی کشاکش۔ کیف وکم اور پیچ وخم کو فنکاری کے ساتھ پیش کرنا ہی اصل ہنر ہے، فن ہے، بلکہ کمالِ فن ہے۔

برینڈر میتھیوز نے غلط نہیں کہا — ''سچ بات یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے یہاں اختراع کی صلاحیت، جامعیت اور کاریگری نہیں ہے، کبھی افسانہ نگار کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہوا۔'' اسی کو دوسرے لفظوں میں ہینری جیمس نے اس طرح کہا — ''بحث سے، تجربے سے کوششوں کی رنگارنگی سے فن زندہ رہتا ہے۔ پریم چند نے سادگی اور سادگی میں معنی خیزی کے ذریعہ اس میں اضافہ کیا اور یہ ثابت کیا کہ آسان کہانی لکھنا زیادہ مشکل ہوا کرتا ہے اور مشکل کہانی لکھنا آسان —

تمہید کے طور پر یہ جو چند تحریریں یا مثالیں پیش کی ہیں وہ صرف اس لیے کہ میں جس خاتون افسانہ نگار کی چند کہانیوں پر مختصر گفتگو کرنے جارہا ہوں ان کے یہاں رشتوں کی کہانیاں زیادہ ہیں، جو پوری سادگی بلکہ کمالِ سادگی کے ساتھ افسانوی افق پر ابھرتی ہیں اور کمالِ فن کا مظاہرہ کرتی ہیں جو اکثر ترقی پسند افسانہ نگاروں کا شیوہ رہا ہے، پریم چند سے لے کر عصمت چغتائی تک۔

نگار عظیم اب ایک سینئر، کہنہ مشق افسانہ نگار ضرور ہوگئی ہیں لیکن ابتداً ترقی پسند ذہن وشعور کے زیر اثر جب سے لکھنا شروع کیا ان کے پیش نظر انسان ہی رہے۔ انسانی رشتے اور انسانی مسائل درمیان میں معاشرہ اس لیے کہ عورت خواہ کتنی ہی گھر میں قید رہے وہ معاشرہ سے الگ ہو ہی نہیں سکتی۔ بہرحال سماج ہو یا معاشرہ، گھر ہو یا باہر اس کے بطن سے ڈوبتے ابھرتے مسائل اور بنتے بکھرتے تعلقات کی مجروح حقیقت سے مضبوط کہانی بنتی ہے اور ادب بھی۔ نگار عظیم کا جب پہلا افسانوی مجموعہ 'عکس' (1990) میں منظرِ عام پر آیا تو اس میں شامل زیادہ تر کہانیوں میں رشتے تو ہیں لیکن یہ رشتے انسان سے بھی ہیں اور سماج سے بھی۔ کہانی مرد ہو یا بدلے کا سہاگ۔ فرق ہو یا بابا یا تحفہ ان سب سے نہ گھر الگ ہوا ہے نہ سماج۔ کہانی 'بیاہ' میں تو دیہی سماج ہے جہاں پرانے رسم ورواج ہیں۔ 'عکس' میں اگر نگار عظیم کا اپنا طویل عکس ہے تو 'روشنی' میں سنیتا ہے جس کا قد چھوٹا ہے۔ سیلاب، زخم، نوکری، کسک وغیرہ سبھی کو بغور دیکھیے تو سب میں انسان اور انسانی معاشرہ بولتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات ومسائل میں ڈوبی یہ کہانیاں زندگی کا عکس ہی پیش کرتی ہیں، کوئی بڑا فلسفہ نہیں اگرچہ چھوٹی کہانی سے بڑے فلسفہ کی امید کرنا وہ بھی ایک نئے افسانہ نگار سے زیادتی ہوگی۔ تاہم ان کی ابتدائی کہانیوں میں بھی رومان سے حقیقت کے سفر کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ متوجہ کرتی ہیں اور تابناک مستقبل کی نشاندہی بھی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر صالحہ زریں نے غلط نہیں لکھا:

''نگار عظیم کی یہ کہانیاں ان کے پہلے دور کی کہانیاں ہیں جب نگار عظیم کم عمر تھیں۔ رومانی احساس وشعور سے دوچار تھیں لیکن پھر بھی زندگی کے تئیں ان کا جدوجہد سے بھرا رویہ ان کی کہانیوں میں کہیں کہیں شعوری اور کہیں لاشعوری طور پر سماجی جدوجہد اور معاشرتی وجدان سے مالامال کردیتا ہے اور کہانی رومانی ہوکر حقیقت کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ رومان اور حقیقت کے درمیان کا یہ سفر اپنے آپ میں کچھ اس انداز سے پر ہوتا ہے کہ کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل سا تو نظر آتا ہے۔ یہ ان کا تعمیری وتشکیلی دور ہے۔''

(جدید خواتین افسانہ نگار، ص 161)

چند برسوں کی مشق ومزاولت کے بعد جب نگار عظیم کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'گہن' (1999) میں شائع ہوتا ہے تو یہ یقیناً ان کی فکری پختگی اور تخلیقی بالیدگی کا اعلان کرتا ہے۔ خاص طور پر افسانے غرض، سنگین جرم، زندگی زندگی، گہن، پھانس، بیل وغیرہ کا مطالعہ کیجیے۔ قلم وہی ہے اور ذہن بھی وہی لیکن ان کہانیوں میں بدلاؤ اور پھیلاؤ کے عناصر صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں، جو نہ صرف متوجہ کرتے ہیں بلکہ غور وفکر پر مجبور کرتے ہیں۔

'زندگی زندگی' عنوان ہی ملاحظہ کیجیے، بظاہر ایک حادثے کی کہانی۔ شہر میں زہریلی گیس پھیل جاتی ہے، اموات ہوتی ہیں، ایک طرف شادی کی خوشیاں، دوسری طرف غم زدگیاں، سچی اور پراثر کہانی جو اپنے Paradoyes سے شکل وصورت نکھارتی ہے۔ عارف اور ثریا کا گلے ملنا دراصل غم اور خوشی کا گلے ملنا ہے۔ اس نازک اشارے پر کہانی ختم ہوکر خوشگوار تاثر چھوڑنے میں کامیاب

ہوتی ہے۔ پریم چند نے کہا تھا کہ کہانی میں کوئی نہ کوئی نفسیاتی نکتہ ہونا ضروری ہے جو زندگی میں نظر آتی ہے۔ 'گہن' میں بھی نفسیات ابھرتی ہے جس میں کلچر کے ٹکراؤ کو بھی سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح سے کہانی 'پھانس' بھی ہے، لیکن ایک کہانی 'کنفیشن' بھی۔ نفسیاتی پیچ وخم میں ڈوبی ہوئی غرض کہ رشتے ہی رشتے جس میں کسی کی عزت ہے اور کسی کی ذلت — دونوں کا تصادم، جن میں خواتین زیادہ ہیں، یہ ایسی کوئی غلط بات بھی ہیں، نگار عظیم خود ایک عورت ہیں لیکن ان کے یہاں جا و بیجا حمایت، ہمدردی کم، سچائی اور فنکاری زیادہ ہے۔ وہ ایک فنکار اور غیر جانب دار کے طور پر سماج اور حادثوں اور مشکلوں کو دیکھتی ہیں۔

اب میں ان کی چند اور کہانیوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جو غالباً بعد کے دور میں لکھی گئی ہیں جس میں نگار عظیم کے فکر وفن کے جوہر زیادہ نکھرے نظر آتے ہیں۔

'طنابیں' ایک ایسی ہی لڑکی کی کہانی ہے جس کی ماں بیوہ ہے، گھر گھر کام کرتی ہے۔ غربت اور عسرت نے نوجوان زرینہ کا بچپن چھین لیا۔ یہ جملے دیکھیے:

''ماں کو در بدر بھٹکتے روتے سسکتے دیکھ کر زرینہ کا بچپن خوف زدہ ہو کر چپکے سے کہیں اور جا بسا۔''

'کہیں اور جا بسا' میں جو اشاریت ہے وہی کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ کئی کردار ابھرتے ہیں جن میں ایک بیگم سجاد ہیں جہاں زرینہ کی والدہ کو کام کرنے کی ملازمت ملتی ہے۔ ادھر تتلیوں کے پیچ دوڑتی دوڑتی زرینہ جوان ہوئی اُدھر اس کی ماں بیماری سے رخصت ہوئی۔ یہ زندگی کے تقاضے ہیں اس سے زیادہ غریبی کے۔ کمسن زرینہ اب سترہ برس کی ہوگئی یعنی کہ جوان اور جوانی امیری کی ہو تو امکانات سے پر ہوتی ہے اور غریبی کی ہو تو خطرات زیادہ منڈرانے لگتے ہیں۔ جوانی ایک لیکن طبقاتی اور سماجی خطرے الگ الگ جو مختلف دنیا کی تعمیر کرتے ہیں۔ یہ بلیغ اشارے بھی بین السطور میں ملتے ہیں، جسم کی ہی نہیں احساس کی طنابیں از خود کھنچنے لگتی ہیں۔ بہر حال جوانی اپنی جگہ پر اور زندگی کی کہانی اپنی جگہ پر — بیگم سجاد کا ایک لڑکا ضرور ہے لیکن وہ ملک سے باہر ہے اور بیگم سجاد بھرے پرے گھر میں تنہا — اسی لیے ملازمائیں زیادہ ہیں جن میں ایک زرینہ بھی ہے۔ بیگم سجاد کی ایک اور کہانی ہے جو ان جملوں میں پوشیدہ ہے:

''بھوک جسم کی ہو یا پیٹ کی اگر فاقوں کی عادت پڑ جائے تو آہستہ آہستہ بھوک خود ہی مر جاتی ہے —''

پھر ایک اور کہانی سجاد اور زرینہ کے مابین جنم لیتی ہے — کہانی در کہانی اور یہ اشاراتی جملے — ''کسمساتی فاختائیں، پھڑ پھڑاتی ہوئی ان کے وجود میں داخل ہوگئیں —'' اور پھر تجربہ کار بیگم سجاد نے اچانک زندگی کے بدلتے ہوئے رخ پڑھ لیے اور آناً فاناً چھدّا اور زرینہ کا نکاح ہوگیا اور سجاد صاحب کے جسم کی ساری طنابیں اچانک ڈھیلی پڑ گئیں۔ بظاہر چھوٹی سی کہانی لیکن اپنے اندر انسانی نفسیات نفسانی خواہشات کے کئی پہلو سمیٹے ہوئے جسے نگار عظیم نے بڑے سلیقہ وشعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ کہانی میں صرف جذبہ یا رشتہ نہیں بولتا بلکہ اس سے زیادہ طبقہ بولتا ہے۔ حالات کا جبر بولتا ہے اور جبر کی حقیقت بولتی ہے۔ جہاں جوانی اور بزرگی سب شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔ عمدہ کہانی کا یہی ہنر ہوتا ہے۔ واقعات میں، پیچیدہ حقیقت میں۔ رشتوں کی نزاکت باہم مربوط ہو کر زندگی کا رخ دکھلائے جو اس کہانی میں نظر آتا ہے۔

'سرخ آندھی' میں پروفیسر دانش فراز ہیں جو لسانیات کے پروفیسر ہیں۔ ان جملوں میں ان کی شخصیت دیکھیے:

''مالو پیہ کی شکار آنکھیں زندگی بھر علم کی پیاس بجھانے میں مصروف رہیں۔ بھیگی گہری آنکھیں اور کتاب کے لفظوں کے درمیان موٹے موٹے شیشے ہمیشہ ان کی مدد کرتے رہے۔ اپنی اسی محنت، جدوجہد اور لگن کے سبب وہ اس مقام تک پہنچے، عزت، شہرت، ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی —''

گھر علم وادب کا گہوارہ ضرور ہوگیا لیکن وقت کے تبادلے اور زندگی کے تقاضے بڑے بڑے گہوارے کو متزلزل کر دیتے ہیں، وہی خوشحال پروفیسر اب:

''آہستہ آہستہ وقت بدلا، حالات بدلے، لفظوں سے شناسائی کمزو رپڑی تو علم کی دیوی پر بھی اداسی چھا گئی پرانے عشق بوڑھے ہونے لگے اور نئے عاشقوں کی قطار گھٹتی چلی گئی۔ پچھلے کئی برس سے پروفیسر دانش میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ وہ اکثر دورانِ گفتگو اپنے آپ میں نہ ہو کر نہ جانے کہاں گم ہو جاتے۔ بات بات پر یا جھنجھلا جاتے یا پھر خاموش ہو جاتے، کبھی کبھی اس خاموشی کی مدت طویل بھی ہو جاتی ایسے میں محفلیں برخاست ہی رہتیں۔''

ماحول بدل گیا تو کردار بھی بدل گیا۔ ہجوم کم ہوتا گیا کم اور کم — اور پھر ایک دن:

''ایک دن چند مخلص پرانے شاگردوں اور دوستوں نے فیصلہ کیا کہ استاد سے ملا جائے اور اس خاموشی تبدیلی کی وجہ جانی جائے —''

جواب ملا — ''یہ سب کتابیں بیکار ہوگئی ہیں — تمام لفظ غائب ہو چکے ہیں —'' اور کہانی ان جملوں پر ختم ہوتی ہے:

''اس سے پہلے کہ شاگرد کوئی جواب دیتے۔ اچانک دھڑام سے کھڑکی اور دروازے کے پٹ کھلے اور دھول بھری آندھی کا جھکڑ کمرے کی فضا کو دھندلا کر گیا۔ ہواؤں کے مرغولے اڑنے لگے۔ آسمان دیکھتے دیکھتے سرخ ہوگیا۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ کتابوں سے صفحات اڑ اڑ کر چاروں طرف پھیلنے لگے اور تمام شاگرد انھیں سمیٹنے کی کوشش میں ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ سرخ آندھی کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔''

اس کہانی میں کوئی نسوانی کردار نہیں ہے اور نہ سبک رومان۔ نہ رشتے نہ خاندان — لیکن پھر بھی یہ کہانی ایک بہت بڑے اور گہرے اشارے پر ختم ہوتی ہے۔ یہ کہانی بدلتے ہوئے سماج، معیشت وصارفیت سے گہرا تعلق رکھتی ہے، سود وزیاں کے چکر میں علم وفکر کس قدر بے وقعت ہو رہے ہیں۔ دنیا مادیت کی طرف کس طرح بھاگی جا رہی ہے اور دولت کی سرخ آندھی کے آگے کتابوں کی

اہمیت، تہذیب کی قدر و قیمت، معیارِ اخلاق وغیرہ معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ اقدار بازار میں تبدیل ہورہے ہیں۔ نگار عظیم کی یہ کہانی صرف کہانی نہیں رہ جاتی بلکہ دورِ حاضر کا آئینہ اور تہذیب کا فلسفہ بن جاتی ہے اور مجھے لارنس کے وہ جملے یاد آنے لگے کہ فکشن اپنے تہہ نشین میں جب تک فلسفہ نہ بن جائے بڑا فکشن نہیں بن پاتا۔

کاغذی پیرہن میں بھی مرکزی کردار مرد ہے۔ ورزشی جسم کا نوجوان مرد جسے اپنے جسم پر بڑا ناز ہے، ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم۔ غرضیکہ وہ سب کچھ ہے جس پر لڑکیاں فریفتہ ہوسکتی ہیں، چنانچہ تھیں لیکن وہ صرف غزالی آنکھوں والی کو ہی پسند کرتا تھا۔ یہ تخلیقی جملے دیکھیے:

''غزالی آنکھوں کی پلکیں اٹھتیں تو چراغ روشن ہوجاتے اور جب جھکتیں تو سرِ شام کا احساس ہوتا۔''

بظاہر یہ شاعرانہ جملے ہیں جواب نئی کہانیوں سے ناپید ہیں، کوئی یہ بھی اعتراض کرسکتا ہے کہ کہانی کی سچائی سے ان کا رشتہ کیا ہے۔ ایسے معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ سماج کی سچائی اور تخلیق کی سچائی میں بہرحال فرق ہوا کرتا ہے جیسے گھر، سماج اور زندگی ایک مخصوص آرائش و زیبائش چاہتے ہیں۔ ویسے ہی تخلیق بھی تخلیقی جملوں سے آگے بڑھتی ہے، تبھی وہ تخلیق بنتی ہے اور تصویر سے الگ بلند مقام بناتی ہے۔ کورے آدرش و حقیقت سے فلسفے تو بنتے ہیں جذبے نہیں اور جذبہ و تخیل کے بغیر تخلیقی عمل غیر فطری ہوتا ہے اور غیر تخلیقی بھی۔ یہ ایک بڑی تخلیقی صداقت ہے جسے سمجھتے چلنا چاہیے۔ یہ کہانی رومانی نوعیت کی ضرور ہے لیکن اس میں ایک مقام پر لاک ڈاؤن بھی ہے اور کورنٹین بھی غرضیکہ رومان الگ اور سماج کی حقیقت الگ۔ اسی میں تاجدار انکل کی موت زندگی کی حقیقت بن کر داخل ہوتی ہے۔ بیماری، علاج، دوائیں زندگی کی دوسری ضرورتیں، رومان کو حقیقت میں بدل دیتی ہیں۔ اکیلا پن، خوف اور چہرے پر ماسک۔ فاصلہ اور یہ فضا:

''شام ابھی دھندلکوں سے دور تھی، آسمان میں چمپئی بادل ہوا کے دوش پر تھے۔ مارچ کا آخری ہفتہ تھا لیکن موسم میں خوشگواری نام کو نہ تھی۔ شاید یہ ماحول کا حبس تھا جو چاروں طرف پھیلا ہوا تھا—''

کہانی رومان کی دلپذیری کے بجائے وقت کی ستم ظریفی میں بدلنے لگتی ہے اور معنی خیز جملہ نکلتا ہے— ''یہ کیسے لمحات ہیں جو میرے ہوتے ہوئے بھی میرے نہیں ہیں—'' کہانی اسپتال، مریض، چیخ و پکار اور موت کے آس پاس سے گزرتی ہوئی، اپنی بے بسی کو ظاہر کرتی ہوئی ایک عجیب موڑ پر آکر ختم ہوتی ہے، کچھ بے رحم خواب، کچھ سفاک حقائق، کہانی ایک سماجی المیہ پر ختم ہوتی ہے۔ یہ ایک مشکل کہانی تھی جسے نگار عظیم کے خلاق ذہن اور مخصوص تکنیک کے ذریعہ آج کی، بالکل آج کی کہانی بنا دی۔ بظاہر رومان، بباطن پر پیچ حقیقت، بادی النظر میں رومان غیر ضروری سا لگتا ہے لیکن زندگی کی کوئی حقیقت متضاد رویوں اور اکثر تصادم کے بغیر مکمل نہیں ہو پاتی۔ یہ شعور نگار عظیم رکھتی ہیں اور کہانی کی پراسراریت پر بھی نظر رکھتی ہیں جو ان کی بعد کی کہانیوں میں بدرجۂ اتم نظر آتی ہیں۔ اسی لیے وہ سادگی میں بھی گہری بات کہہ جانے کا ہنر جانتی ہیں۔ یہاں میں ایک کہانی کا ذکر بطور خاص کرنا چاہوں گا۔

'مادری زبان' بظاہر مضمون کا عنوان لیکن نگار عظیم کی فنی چابکدستی اسے کہانی بنا دیتی ہے۔ ''کون ہے؟'' سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے جو ایک فطری تجسس پیدا کرتا ہے اور قاری کو پورے طور پر متوجہ کرلیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی کہانی کا پر تجسس انداز ہی کہانی کا انجام ہوتا ہے۔ ماہر افسانہ نگار منٹو نے ایک بار کہا تھا کہ کہانی آپ شروع کیجیے ختم کروانے کی ذمہ داری میری ہے۔ نگار عظیم نے منٹو پر کام کیا ہے۔ کم و بیش وہ اس ہنر سے واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر کہانیاں ابتدا سے ہی قاری کو گرفت میں لے لیتی ہیں۔ اس کہانی کی بھی یہی صورت ہے جس میں چھوٹی لڑکی اور اس کی بڑی چٹپٹی معنی خیز اشارے پیدا کرتی ہے۔ پھر ایک اور لڑکی— سوال در سوال۔ تجسس در تجسس اور پوری سادگی اور سلاست۔ مردم شماری کا ایک گھر پورے گیارہ بچے، والدین، تعلیم و تربیت، مردم شماری کے سوال و جواب کے بہانے پوری ازدواجی نیز سماجی زندگی کے نازک ترین پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ زبان اور خاندان دونوں ہی ابھرتے ہیں، ڈوبتے ہیں اور پھر ان جملوں میں تو معاشرت اور سیاست سبھی کچھ آجاتے ہیں:

''اردو کیوں؟ عربی لکھو!''

''چالیس برس سے رہتے ہیں۔ کون نکالے گا ہمیں''

راشن کارڈ پہچان کارڈ کچھ بھی نہیں— یہ اشارے محض کارڈ کی گمشدگی تک محدود نہیں رہتے بلکہ قومی تعلیمی اشارے بن جاتے ہیں جنھیں نگار عظیم نے آسان سے سوالوں کے ذریعے مشکل حوالوں کو پیش کردیا ہے۔ جب کچھ نہیں تو جھنجھلایا ہوا یہ جواب ملتا ہے:

''ارے تم تو پیچھے ہی پڑ گئیں۔ نہ جانے کیا کیا لکھ لیا اور کیا کیا لکھو گی اب بس بھی کرو۔ بہت ہوگیا—''

اور پھر جب مردم شماری کرنے والا کردار یہ کہتا ہے:

''آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔ یہ آپ کا ہی کام ہے۔ آپ میری مدد کیجیے۔ آپ ہی کا فائدہ ہے۔''

تو کہانی اپنے کلائمکس پر پہنچ ایک عاجز و مجبور کے نمائندے کے طور پر کردار کہتا ہے:

''کیا فائدہ ہے ہمارا؟ نوکری دلوا دوگی ہمارے بچوں کو؟ بولو۔ گھر دلوادوگی، زمین دلوادوگی؟ فائدہ فائدہ۔''

اور کہانی ایک معمولی واقعہ سے اوپر اٹھ کر غیر معمولی سوالات سے جڑ جاتی ہے اور زندگی کے وسیع دامن سے رشتہ جوڑ لیتی ہے۔ کہانی کا اصل ہنر یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ معمولی پن سے غیر معمولی پن پیدا کرے۔ وارث علوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کہانی محض واقعہ نگاری نہیں ہوتی۔ اس کے بلیغ اشارے سماجی اور

معاشی رشتوں کی پہچان ہوتے ہیں اور کہانی کار کے فکر وشعور کی داستان بھی۔ خود نگار عظیم نے عمارت کے ابتدائیہ میں یہ اظہار کیا ہے:

''افسانہ واقعہ بھی ہوسکتا ہے، کردار بھی اور حادثہ بھی جو گھر، باہر، پڑوس، شہر یا ملک کا بھی ہوسکتا ہے۔ کبھی کبھی تو صرف ایک احساس ہی کسی افسانے کے لکھنے کا سبب بن سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعات حادثات یا کردار وہ ہوتے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے— بالآخر کبھی نہ کبھی افسانے کی صورت لے لیتے ہیں۔''

لیکن افسانے کی صورت گری بھی ایک فنکارانہ عمل ہے۔ واقعہ کو افسانہ اور بڑا افسانہ بنانا اس سے بڑا عمل ہے جس سے نگار عظیم کم وبیش واقف ہیں۔ مردم شماری جس کی بین مثال ہے۔

آخر میں ایک ایسی کہانی کا ذکر کروں گا جس کا عنوان ہی ہے 'ایک زندہ کہانی' کہانی کا مرکزی کردار ہے نوری۔ ایک آزاد خیال و بے باک نڈر لڑکی ساتھ ہی خوبصورت بھی۔ یہ سب غیر معمولی انسانی ونسوانی اوصاف ضرور ہیں لیکن کبھی کبھی یہ اوصاف افکار میں انقلاب برپا کردیتے ہیں۔ مصنفہ نوری کی دوست و ہم خیال بھی لیکن آگے چل کر زندگی کے سفر میں کچھ الگ الگ بھی۔ نوری شعبۂ نفسیات سے تعلق رکھتی ہے اور مصنفہ کا شعبہ فائن آرٹس قرار پایا۔ نوری کی ایک انفرادیت یہ بھی بقول مصنفہ: ''جب بھی بات عورت شادی اور جنسی رشتوں پر آتی نوری غصہ اور نفرت سے بھر جاتی اس کی زبان سے زہر بھرے نشتر نکلنے لگتے۔ مرد ہمیشہ اس کے نشانے پر ہوتا—'' اسی لیے وہ شادی سے بیزار ہے کہ اس سے ساری صلاحیتیں معدوم ہوجاتی ہیں اور وہ صرف غلام بن کر رہ جاتی ہے۔ یہاں پر مصنفہ نے کچھ بے باک انداز سے کردار پر روشنی ڈالی ہے:

''(مرد سے) رشتے کی شروعات عورت کے زیر ہونے سے ہوتی ہے۔ وہ صاف کہتی مجھے چت ہوتی ہوئی عورت سے نفرت اور کراہیت آتی ہے۔ شادی کے بعد وہ شوہر کے لیے بس جسم بن جاتی ہے۔''

ساتھ ہی وہ اپنی خودداری، خودمختاری وغیرہ کھودیتی ہے اور پھر یہ اہم سوال—

''کیا عورت اس رشتہ کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی؟''

یہ سوال ہی نوری کا جلال ہے اور جمال بھی اور کہانی کا مرکزی خیال بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آزاد خیال پڑھی لکھی نوری کی زندگی میں انقلابات آجاتے ہیں اس لیے بھی کہ وہ ایک ایسے گھر کی فرد ہے جس کے کئی بھائی بہن ہیں، ایک سماج ہے جسے عام طور پر مردانہ سماج ہی کہتے ہیں جہاں جوش علم یا جوش جوانی میں سوچنا اور بات ہے اور حقیقتِ زندگانی کچھ اور، مرد کے لیے بھی عورت کے لیے بالخصوص۔ پھر جہاں کنبہ بڑا ہو آمدنی قلیل ہو وہاں ضرورتیں وحقیقتیں بے رحم ہوجایا کرتی ہیں۔ ان حالات میں نوری کا کنوارے اور آزاد رہنے کا دوٹوک اعلان، پھر تو بقول مصنفہ ''نوری پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔'' اور پھر اجتماعی مسائل ومصائب کے آگے انفرادی فیصلہ کی کچھ نہ چلی اور نوری کو نہ چاہتے ہوئے شادی کے لیے رضامند ہونا پڑا۔ یہ تھا کہانی کا نصف حصہ، جو ایک گھر، ایک فیصلہ پر رُکا تھا لیکن اصل کہانی تو وہاں سے شروع ہوتی ہے جب انفرادیت، اجتماعیت میں تبدیل ہوتی ہے۔ وہ پڑھی لکھی نوری جو شادی سے انکار کرتی تھی اب ایک دوسرے گھر میں زیورات سے لدی دلہن کے کپڑے میں سجی کسی انجان مرد کا انتظار کررہی تھی کہ کہانی ایک اور موڑ لیتی ہے۔ حجلۂ عروسی میں دو بلیاں آواز کرتی ہوئی داخل ہوتی ہیں، ان میں ایک تندرست بلّا ہے، دوسری کمزور بلّی نتیجتاً پل بھر میں کمزور بلی مضبوط بلے کی گرفت میں تھی بلکہ زیر تھی۔ یہ منظر دیکھ کر دلہن کی کیفیت کو ان جملوں میں ملاحظہ کیجیے:

''غصہ کے مارے نوری کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ پسینہ پسینہ ہوگئی، حلق سوکھ گیا، اس کا کپکپاتا جسم بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس کا کمزور وجود کسی کی گرفت میں بے بس ہوکر بری طرح تڑپ رہا ہے—''

اسے صاف محسوس ہوا کہ وہ ایک کمزور بے بس بلّی ہوگئی ہے اور داخل ہوتا ہوا اس کا شوہر مضبوط وخونخوار بلّا— لیکن شوہر تو شہریار نکلا، پہلی ہی رات کو نوری کی طرف سے طلاق کے مطالبہ نے شہریار کو حیران کردیا ساتھ ہی قارئین کو بھی اور پھر یہ جملہ— ''مجھے مرد کا غلام نہیں بننا'' کچھ غیر فطری سا لگتا ہے اور ناقدین کو دعوتِ فکر دیتا ہے لیکن یہ بھی نزاکت زیرِ نظر رہے کہ تخلیق کا غیر فطری پن کبھی کبھی غیر معمولی پن کی طرف اشارکر جاتا ہے اور کردار وسچویشن کو لرزہ بھی دے جاتا ہے اور کہانی کو ایک نیا موڑ بھی۔ پریم چند نے کہا تھا ''تلخ تجربوں، مشکل حادثوں کو آسان اور دلکش طریقہ سے کہہ دینا ہی ادب کی کیمیا گری ہے۔'' فطرت اور جبریت کے مابین ایک بے نام ٹکراؤ ابھرتا ہے اور کہانی ٹکراؤ سے ہی آگے بڑھتی ہے اور زندہ رہتی ہے۔ شہریار کا جواب ہے ''یہ تو فطرت کا نظام ہے اس سے عورت کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ ماں بنتی ہے، قدرت کے حسین تحفے اس کو سرشاری عطا کرتے ہیں'' لیکن نوری کا وہی فیصلہ کہ ''عورت کے زیر ہونے کا یہ ایک ناقابل فراموش المیہ ہے۔'' تکرار سے آزاد کی صورت پیدا ہوئی اور نوری کو میکے پہنچا دیا گیا— نوری پھر اکیلی لیکن نوری کو نہ غم نہ تنہائی، ملازمت کرلی لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ، بدلتے ہوئے حالات یا حالات کی ستم ظریفی نے اسے مجبوراً بیگم دلدار خاں بنادیا۔ کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ پھر آتا ہے جو بظاہر عجیب لگتا ہے لیکن حالات کا جبر اور ڈھلتی ہوئی عمر کے بہرحال اپنے کچھ تقاضے بھی تھے۔ نوری کا یہ فیصلہ قاری کی طرح مصنفہ کو بھی بے چین کرتا ہے۔ جوان شہریار سے طلاق اور عمر رسیدہ دلدار خاں سے نکاح۔ چہ معنی دارد؟ اور پھر یہ سوال جو صرف مصنفہ کا نہیں قاری کا بھی ہے:

''یار تیرے اندر یہ تبدیلی ہوئی کیسے؟
چت کون ہوا؟
وہ کہ تم؟''

جواب ہی کلائمکس ہے اور نوری کا سچ بھی:

''کوئی بھی نہیں!''

تو کیا وہ نا— نوری نے اپنے ہاتھ سے میرا منھ بند کر دیا۔''

بات صرف دلدار کے نامکمل پن کی نہیں نوری کی زندگی کے اٹل فیصلہ کی ہے جو وہ خوشی خوشی کرتی ہے۔ کہانی اور زندگی دونوں مکمل ہوتے ہیں، صحیح رویوں اور نظریوں سے۔ باوجود یکہ کہانی میں کہیں کہیں ڈرامائی موڑ آتے ہیں لیکن کہانی کا بڑا کلائمکس۔ بڑا مقصد جو راست طور پر زندگی اور آزادی سے تعلق رکھتا ہے۔ تخیل و تصور کی تخلیقی مداخلت کی بھی بہر حال اجازت دیتا ہے۔ نگار عظیم نے مختصر اور کسے ہوئے انداز میں خود عورت ہو کر عورت کے بعض مردانہ فیصلوں کی نشاندہی کی اور یہی نگار عظیم کا وصف ہے کہ وہ جذباتی قسم کی تانیثیت کا شکار نہیں ہوتیں۔ وہ کہانی کو مرد اور عورت کی تقسیم کے بجائے زندگی کی مکمل تجسیم میں دیکھتی ہیں۔ یہی نظر ان کو انھیں ہمعصروں سے نہ صرف مختلف بلکہ ممتاز کرتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں اگر عورت کمزور ہے تو مرد بھی کمزور ہے۔ وہ ان کمزوریوں کو سماج اور زندگی کے کھلے ڈھکے سیاق و سباق میں دیکھتی ہیں اور سوچے سمجھے اور ترشے ہوئے انداز میں پیش کرتی ہیں، کچھ اس انداز سے کہ کہیں کہیں کہانی کا غیر فطری پن بھی بڑے سلیقہ سے فطرت کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ پھر کہانی کار اور فنکار کو اتنی اجازت اور حق ملنا بھی چاہیے کہ وہ کہانی کو من و عن پیش نہ کر کے ایک بڑے مقصد کے لیے پھیر بدل کر سکے۔ یہ اجازت تو بابائے افسانہ پریم چند بھی دیتے ہیں کہتے ہیں کہ ''روحانیت اور فلسفہ تو عالموں کے لیے ہوتا ہے لیکن کہانی پورے طور پر آدمی کی ہوتی ہے'' اور آدمی کی منطق تخیلاتی بھی ہوتی ہے اور کرشماتی بھی اور کبھی کبھی نا قابلِ فہم بھی۔

یہاں میں ایک بات اور کہتا چلوں کہ جب بھی کہانی کار کے ذہن میں ادب اور زندگی کا کوئی بڑا تصور نہ ہوگا وہ ایسے موضوعات کی طرف بڑھے گا جو اس کے اپنے ذاتی ہوں گے۔ کمزور ہوں گے اور محدود ہوں گے۔ نگار عظیم کی کہانیاں مختصر ہیں اور وہ اختصار و جامعیت کا حسن بھی جانتی ہیں لیکن پھر بھی وہ متذکرہ کمزوری اور محدودیت سے مبرا ہیں۔ ان کے یہاں ذات کم سے کم ہے اور کائنات زیادہ سے زیادہ۔ یہ الگ بات ہے کہ گھر کی کائنات زیادہ ہے یہ کوئی غلط بات بھی نہیں۔ یہ ہر عورت کی کمزوری سے زیادہ مضبوطی ہوا کرتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ گھر سماج کا پہلا زینہ ہوا کرتا ہے جسے نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ ایک خاتونِ خانہ ضرور ہیں لیکن تنظیم و تحریک سے وابستہ بھی ہیں۔ وہ اپنے آپ میں انجمن ہیں، اسی لیے ان کے یہاں گھر اور باہر۔ باطن اور خارج کے سارے عناصر شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ وہ کم لکھتی ہیں لیکن سوچ سمجھ کر ٹھونک بجا کر بلکہ بنا سجا کر لکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے کہانی ہوتی ہے اس کے بعد کچھ اور لیکن یہ بھی کہ وہ کہانی صرف واقعہ نہیں ہوتی، زندگی کا تجربہ ہوتی ہے جو کہیں کہیں فلسفہ بھی بن جاتی ہے۔

روسی افسانہ نگار چیخوف نے کہا تھا ''افسانہ چھوٹی چیزوں کو زندہ رکھنے کا دوسرا نام ہے۔''

نگار عظیم کی کہانیاں اس معیار پر پورا اترتی ہیں۔ انھیں کے جملوں پر گفتگو تمام کرتا ہوں:

''انسانی زندگی سماجی، سیاسی اور ثقافتی تبدیلیاں ہی ادب کے منظرنامے کو نیا موڑ دیتی ہیں... زمانہ جوں جوں بدلتا گیا قدریں بدلیں۔ انسانی رویے بدلے، نظریات بدلے، طرز معاشرت بدلا، سب کچھ بدلا۔ اگر نہیں بدلا تو انسان سے قلم کار شتہ۔ قلمکار آج بھی وقت کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے۔''

(خواتین افسانہ نگاروں کے سروکار)

## آ بیل مجھے مار

کینیڈا ایک مہنگا ملک ہے، لیکن اس کی شہری خدمات اعلیٰ ترین معیار کی ہیں۔ کرسمس کے دوران کراچی سے ایک فیملی چھٹیاں منانے کینیڈا گئی ہوئی تھی۔ اس میں ایک جوڑا، ان کے 2 بچے اور اس شخص کا باپ شامل تھا۔ ٹورنٹو میں 3 دن کے بعد، انہوں نے مونٹریال جانے کے لیے ایک کار کرائے پر لی۔ ہائی وے 401 دنیا کے سب سے چوڑے حصے میں 18 لین گزرنے کے ساتھ فری وے بالکل شاندار ہے۔ ایک 80+ کینیڈین خاتون ان کے پیچھے ایک کار میں محفوظ فاصلہ رکھتے ہوئے تھی۔ بچے پچھلی سیٹ پر سے بار بار پیچھے دیکھ رہے تھے اور اکثر کینیڈین خاتون کو ہاتھ ہلاتے تھے جو مسکرا کر جواب میں ہاتھ ہلاتی جاتی تھی۔ اچانک کینیڈین خاتون نے دیکھا کہ ایک بوڑھے کا سر پچھلی سیٹ کی کھڑکی سے باہر نکلا اور خون کی قے ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی کار سائیڈ پر روکی اور فوری طور پر مدد کے لیے 911 پر کال کی۔ بہت جلد، ایک ایمبولینس ہیلی کاپٹر نمودار ہوا۔ یہ ایک کلومیٹر آگے اترا۔ خاندان کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا، اور کچھ ہی دیر میں تربیت یافتہ طبی عملہ بوڑھے کو ہیلی کاپٹر میں لے گیا جو تقریباً ایک آئی سی یو تھا۔ آکسیجن کی سپلائی شروع ہو گئی۔ دل کی شرح اور دیگر پیرامیٹرز کی نگرانی کی گئی۔ ایک ماہر ایم ڈی ہدایات فراہم کرنے کے لیے ٹورنٹو سے ویڈیو کال پر تھا۔ آدھے گھنٹے میں بوڑھے کو محفوظ اور دوبارہ سفر کے لیے فٹ قرار دے دیا گیا۔ کینیڈین خاتون کی فوری مدد اور بروقت کارروائی پر خراج تحسین۔ ان خدمات کے لیے، اس آدمی سے $3,500 وصول کیے گئے۔ ایک متوسط پاکستانی خاندان کے لیے یہ بہت پیسہ ہے۔ اس غیر معمولی مالی اخراجات کے ساتھ، کراچی والا صدمے میں تھا اور اس نے اپنے والد کو بڑے افسردگی سے کہا کہ:

ابا جی، پان کھا کر کے باہر تھوکنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔

# ممتا کی مورت

نورالحسنین
(اورنگ آباد)

اردو افسانے پر جدیدیت کا ہینگ اوور ابھی باقی تھا اور تمثیلی و علامتی افسانے اب بھی لکھے جارہے تھے کہ دلی کی فضاؤں میں کوئی بہت دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا کہ لوافسانے پر چھایا ہوا غبار اب چھٹنے ہی والا ہے۔ قارئین نے اطمینان کا سانس لیا، لیکن ناقدینِ ادب سہم گئے تھے کہ ہمارے طئے کردہ اُصولوں کے خلاف یہ کون راوی ہے جو افسانے کے مزاج کے بدلنے کی باتیں کر رہا ہے؟ یہ نازک سی آواز، جیسے کوئی چھوٹا سا دیا روشن ہوکر اندھیرے کی سلطنت کو چیلنج کررہا ہو۔ رسالہ ''شانِ ہند'' کے اوراق پھڑ پھڑانے لگے تھے اور سب کی نظریں اُس میں چھپے ہوئے افسانے ''عقیدت کے آنسو'' پر ٹھہر گئی تھیں۔ حقیقت پسندانہ اسلوب میں حقیقت نگاری کا مرقعہ ایک نئے روپ کا اعلان کررہا تھا، اور مہر نگار کے نام سے اُمید بھری شعاعیں نکل رہی تھیں۔

نگار عظیم نے پہلے ہی افسانے سے اپنے قارئین اور ناقدین کو چونکا دیا تھا۔ وہ میرٹھ کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے والد، ثروت میرٹھی کی شاعری کی دھوم تھیں۔ گھر میں ادبی شخصیات کی آمد کے سلسلے تھے، کبھی شعر خوانی، کبھی زبان دانی کے رموز و نکات پر باتیں، کبھی کوئی ادبی مباحثہ ہو رہا ہے۔ الماریوں میں کتب و رسائل کا انبار تھا۔ مہر نگار کو والد کے شعری وقار نے شاعری کی طرف متوجہ کیا، لیکن قدرت کا منشاء کچھ اور تھا، چنانچہ شعر لکھنے والے ذہن نے چپکے چپکے اُن سے افسانے بھی لکھوانا شروع کر دیا، لیکن ابھی جسارت نے باہر قدم نہیں نکالا تھا، ابھی مطالعہ کی بھٹی میں ذہن کندن بن رہا تھا، آخر شہرت کے چشمہ نے آنکھیں کھولیں اور 1974ء سے اُن کی اشاعت عمل میں آنے لگی۔ 1976ء میں اُن کی شادی عبدالعظیم صدیقی سے ہوگئی اور وہ مہر نگار سے نگار عظیم بن گئیں۔

اپنے اظہار کے لیے اُن کے پاس اور بھی دو وسیلے تھے۔ مصوری، اور فوٹو گرافی وہ جب بھی چاہتیں، زندگی کے کسی رخ کو رنگوں سے سجادیتیں، یا پھر فوٹو گرافی کا فن چلتی پھرتی کہانیوں کو قید کرلیتا۔ اس واضح اور کھلے کھلے انداز نے اُن کے افسانوں کو بھی گنجلک، علامتی بننے نہیں دیا، کیونکہ اُن کا رول ماڈل سعادت حسن منٹو تھا۔ اپنے پہلے ہی افسانوی مجموعے میں ''کچھ اپنی بات'' کے عنوان کے تحت اُنھوں نے جو بات لکھی تھی وہ منٹو کے ادبی نظریے سے بہت قریب تھی۔ اُنھوں نے لکھا تھا:

''میرے افسانے انسانی زندگی کے اردگرد گھومتے ہیں۔ ان میں انسانی اور جذباتی رشتوں کی اہمیت رہی ہے۔ میں اردگرد ہونے والے واقعات و حادثات سے متاثر ہوکر بول چال کی سیدھی سادی زبان میں انسانی زندگی کے مسلوں کو پیش کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔''

نگار عظیم آج تک اپنے اسی نظریے پر قائم ہیں۔ چنانچہ آج بھی افسانہ لکھنے کے لیے اُنھیں کسی بڑے موضوع کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن جب وہ اپنے سبجکٹ پر افسانہ لکھ لیتی ہیں تو افسانہ اہم بن جاتا ہے۔ اپنے آس پاس پھیلے ہوئے معاشرے سے وہ ایسے موضوعات تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں جو اُن کے قلم کی نوک پر آتے ہی قاری کے دل و دماغ میں اُتر جاتے ہیں۔ اور وہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ان کرداروں میں ہی تو ہوں، میں ہی تو زندگی سے جوجھ رہا ہوں، میں ہی تو دوہری زندگی جینے پر مجبور ہوں، میں ہی دم توڑتی پناہ گاہوں میں سِسک رہا ہوں، میں ہی وہ عورت کا روپ ہوں جو عورت کو کھلونوں کی طرح کھیل رہی ہے، تو کہیں میں بھرے پورے خاندان میں بھی تنہا ہوں، کہیں اولاد کے لیے میری تڑپ، اور کہیں اولاد ہی مجھے تڑپانے کی وجہ، کہیں دانشوری کی دیواریں، اور ان دیواروں میں خود کو کچو کے لگاتا ہوا میں۔ خارجیت کو داخلیت کا حصہ بناتے ہوئے اپنے افسانوں کا خمیر اُٹھانا نگار عظیم کا فن ہے۔ اسی لیے وہ ''مُردار، عمارت، ایکیورم، بڑی فیملی، طنابیں، احساس زیاں، ابورشن، مادری زبان، اور بے چہرگی'' جیسے لاجواب افسانے لکھنے میں کامیاب ہوسکیں۔

افسانہ ''مردار'' ایک بہترین کرداری افسانہ ہے۔ اس افسانے کا اسلوب، کرداروں کی زبان و بیان، پلاٹ، واقعات کی بنت سب کچھ اس قدر کسا ہوا ہے کہ اس افسانے کا تاثر قاری کو افسانے سے نکلنے ہی دیتا اور وہ اس قابل نہیں رہ جاتا کہ کسی دوسرے افسانے کی طرف متوجہ ہوسکے۔ میں نے گھنٹوں کوشش کی کہ اس افسانے کے پلاٹ کو مختصر الفاظ میں بیان کرسکوں، لیکن میں کامیاب نہیں ہوسکا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک ایسے باپ کی کہانی ہے جو اپنی اولاد کے لیے کیسے کیسے دلدوز سمجھوتے کرتا ہے۔ یہ افسانہ اس قدر مربوط ہے کہ اس سے کوئی اقتباس نکالنا بھی سخت دشوار ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار خورشید کی تعمیر میں نگار عظیم نے بلاشبہ فن کی بلندیوں کو چھولیا ہے۔

نگار عظیم سرتاپا ممتا کی مورت ہیں۔ اُن کے سینے میں ایک ایسا حساس دل ہے جو شاید اُن کے لیے کم لیکن اوروں کے لیے زیادہ دھڑکتا ہے۔ وہ دوست ہو یا دشمن سب کے دکھ درد کو اپنا غم سمجھتی ہیں۔ میں نے کتنی ہی بار دوسروں کے لیے اُن کی آنکھوں کو نمناک دیکھا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب جب بھی ایسا حساس دل کسی مصور یا قلم کار کے سینے میں ہوتا ہے تو پھر فسانہ بھی حقیقت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ افسانہ ''بڑی فیملی، یا افسانہ ''عمارت'' اسی دردمند دل کی دھڑکنیں ہیں۔

کسی بھی افسانہ نگار کو کب کہاں سے کوئی کہانی مل جائے گی وہ بھی نہیں سوچ سکتا، نگار عظیم کے ذمہ مردم شماری کا کام آیا تو جیسے کہانیاں پکے پھلوں کی

مانند اُن کی جھولی میں ٹپکنے لگیں:

''ایک شخص کے اِکتالیس کالم پورے کرنے کے بعد بیوی، سات بچوں، دو بہوؤں، ان کے تین تین بچوں اور دادی سمیت تمام تفصیلات درج کرتے کرتے تقریباً ایک گھنٹہ بیت چکا تھا۔ پچھلے پانچ گھنٹوں سے میں فیلڈ میں تھی، اور اب بری طرح تھک چکی تھی۔ سامان سمیٹتے ہوئے باہر نکلی تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لہٰذا سیدھے گھر جانے کا ارادہ کر کے میں نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ لیکن چند قدم کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کوئی نسوانی آواز میرا پیچھا کر رہی ہے۔ مڑ کر دیکھا۔ کوئی نہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی بھی نہیں۔۔۔

''اِدھر اِس طرف۔۔۔ اوپر دیکھیے نا''

میں نے دیکھا بائیں جانب دو منزلہ فلیٹ کی بالکنی پر ایک خاتون جھکی ہوئی ہے۔

''کیا ہمارے یہاں نہیں آئیں گی؟ مردم شماری کے لیے؟''

وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اندر پہنچتی ہیں، اور پھر اُنتالیس کالموں کی تفصیل لکھتے لکھتے پتہ چلتا ہے کہ خاتون کو اللہ نے محبت کرنے والا شوہر، مال زر، رہنے کے لیے پوری عمارت، سب کچھ دیا ہے لیکن اولاد نہیں دیا۔ آنسوؤں بھری آنکھوں سے وہ بتاتی ہے کہ کوئی اُس کے پاس نہیں آتا۔ لوگ اپنے بچوں کو بھی اُس کے گھر آنے نہیں دیتے، افسانہ نگار اُسے دلاسہ دیتے ہوئے بہت کچھ مشورے بھی دیتی ہے اور اُسے دوست بناتے ہوئے اپنے پتہ بھی تھماتی ہے اور اصرار کرتی ہے کہ وہ اُس کے گھر آیا کرے، جب وہ جانے لگتی ہے تو خاتون اُس سے پوچھتی ہے:

''آپ کو کتنے بچے ہیں؟'' اُس نے چلتے چلتے سوال کر ڈالا۔

''جی اللہ کے کرم سے۔۔۔ اُف۔۔۔ لمحہ بھر کو میں رُکی۔۔۔'' آواز حلق میں کہیں گم ہو گئی تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کوئی نہیں ہے؟'' اُس نے دردمندی سے پوچھا تو میں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کیا آپ بھی؟''

''جی۔۔۔ میں بھی آپ کی طرح۔۔۔'' میں نے دیکھا لمحہ بھر میں ہی اُس کے چہرے سے غم کے بادل چھٹنے لگے تھے۔

میں نے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھا اور سیڑھیاں اُترنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔ میں نے خدا سے دعا کی اے خدا یہ کبھی میرے گھر نہ پہنچے۔

افسانہ ''عمارت'' کے کرنل صاحب کا دکھ بھی وہی ہے جو افسانہ ''بڑی فیملی'' کی خاتون کا دکھ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کرنل صاحب کو اولاد بھی ہوئی، مگر وہ اُن کے بڑھاپے اور بیمار ماں کو چھوڑ کر ممالکِ غیر میں آباد ہو گئی۔ مردم شماری کے کام کے سلسلے میں ناول کی مرکزی کردار جب کرنل صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوتی ہے تو حیران رہ جاتی ہے کیونکہ کرنل صاحب کی کوٹھی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ باغ، بڑے بڑے دلان، محلوں کی طرح سجاوٹ، نوکر چاکر، دیواروں پر آویزاں قیمتی پینٹنگ کے نمونے، اعلیٰ ترین فرنیچر، سب کچھ اُن کے اعلیٰ ترین ذوق کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ مردم شماری کے کام کی تکمیل کے بعد جب جاتے جاتے وہ کہتی ہے:

''کرنل صاحب بہت اچھا لگا آپ سے ملاقات کر کے۔ واقعی طبیعت خوش ہو گئی۔ آپ کا گھر بھی بہت اچھا ہے۔ بہت خوب صورتی سے سجایا ہے آپ نے۔ بہت بہت خوب صورت ہے آپ کا گھر۔ آپ تشریف رکھیں میں چلتی ہوں۔ یکا یک اُن کے جملے نے میرے مڑتے قدم جامد کر دلیے۔

''گھر۔۔۔؟ گھر کہاں۔۔۔؟ یہ تو بس ایک عمارت ہے۔''

کرنل صاحب کے چہرے پر اُبھرتی کرب کی لکیروں کی تاب نہ لاتے ہوئے میرے لبوں سے بس اتنا نکلا۔۔۔ خدا حافظ اور پھر میں واپس مڑ گئی۔ اچانک گلاب کی کیاریوں پر نظر پڑی، پانی کی زیادتی سے، بہت سی گلاب کی پنکھڑیاں جھڑ کر بکھر گئی تھیں اور اُن پر گیلی مٹی چڑھ چکی تھی۔''

اس اقتباس کا آخری جملہ نہایت معنی خیز ہے، پانی کی زیادتی، اور پنکھڑیوں کا بکھرنا دو ایسی علامتوں کا روپ دھارن کر لیتے ہیں۔ جہاں دونوں ہی قصوروار نظر آتے ہیں۔ گیلی مٹی کا اُن پر چڑھنا، اُمید کا احساس دلاتا ہے کہ اس مٹی کو صاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

نگار عظیم کے افسانے قاری کے حساس دل کو چھو لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت کا کردار دیگر افسانہ نگاروں سے قدرے مختلف ہے۔ اُن کے یہاں عورت کے ایک بولڈ مزاج کا تصور اُبھرتا ہے لیکن اُس کی بے باکی بے راہ روی کی سمت اختیار نہیں کرتی بلکہ وہ اپنے استحصال اور ظلم کے خلاف بھی آواز اُٹھاتی ہے لیکن اُس کا احتجاج اُس کے نسوانی مزاج اور مادرانہ شفقتوں کی دہلیز کو عبور نہیں کرتا، وہ اپنے فرائض منصبی سے کبھی منہ موڑتی نظر نہیں آتی۔ اُن کے افسانوں میں ''ایکوریم، ابورشن، اور احساس زیاں'' اس کی مثالیں ہیں تو افسانہ ''فریم'' میں ماں اپنی بہو کے لیے جو فریم تیار کرتی ہے نئی نسل میں کچھ ایسی لڑکیاں بھی ہیں جو خود ہی اپنے آپ کو اُس فریم میں فٹ کر لیتی ہیں تو افسانہ ''فرض'' میں قریبی رشتے بھی کیسے خود غرض اور مفاد پرست ہو جاتے ہیں، اس کا احوال ہے۔

اسی طرح افسانہ ''طنابیں'' میں وہ یہ بتاتی ہیں کہ عورت خواہ بیماری کی وجہ سے شوہر کی ضروریات کی تکمیل کی اہل نہ بھی ہو تو وہ شوہر اور خود کے بیچ کسی تیسری شخصیت کو برداشت نہیں کر سکتی، اگرچہ کہ وہ اُس کی خدمت گزار ہی کیوں نہ ہو، وہ نہایت سفاکی کے ساتھ اُسے کوڑہ کرکٹ کی طرح نکال پھینکتی ہے۔ تو افسانہ ''لمس'' اعلیٰ سوسائٹی کے مرد وخواتین کی دانشورانہ گفتگو اور ملاقاتوں میں ہونے والی بے تکلفی کے باوجود ضمیر کی وہ آواز ہے جو ہر عورت خود اپنے آپ کی جوابدہ ہے۔

نگار عظیم کے بہترین افسانوں میں ایک افسانہ ''حطّی کلمن سعفص'' بھی ہے۔ اس افسانے کا شمار بھی کرداری افسانوں میں ہی ہوگا۔ اس افسانے میں

اُنھوں نے ایک نہایت خوب صورت، معصوم اور نہایت بے لوث کردار 'تنویر' کا تراشا ہے۔اس کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ یہ کوئی فرضی کردار نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق یقیناً نگار عظیم کی زندگی سے وابستہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ جس طرح اسے رقم کرتے ہوئے اُن کی آنکھیں اشک بار ہوئیں ہونگی، قاری بھی اسی احساس سے گزرتا ہے۔

نگار عظیم ایک نہایت حساس افسانہ نگار ہیں۔اس لیے اُن کے بعض افسانوں کے موضوعات اتنے اچھوتے اور نازک ہوتے ہیں کہ جن کے مطالعہ سے قاری ایک ایسے لطف سے دو چار ہوتا ہے جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔مثلاً افسانہ ''تکمیل'' کی ہیروئین 'نکہت' ایک نوجوان کی مردانہ خوشبو سے اُس مقام پر معطر ہوتی ہے جہاں پاکیزگی، کردار اور خواب ایک جگہ ملتے ہیں۔اور جنس مخالف کی صرف چھون ہی ایک ایسے تجربے سے آشنا کرتی ہے جسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح اُن کا ایک اور افسانہ ''بے چہرگی'' ہے۔ یہاں ایزل پر عورت کی ایک مسخ شدہ پینٹنگ ، بار بار خاتون کے اطراف منڈلانے والا بھونرا، شوہر کی تنقید کہ کب تک اسی ایک خیال کو بار بار پیش کروگی۔ اور پھر شوہر کے ہاتھوں مارا جانے والا بھونرا۔کہانی کو اچانک وہی موڑ دے جاتے ہیں۔لیکن ایزل پر عورت بار بار وہی مسخ شدہ چہرہ اب اپنی ہیئت تبدیل کر رہا تھا گویا افسانے کا کلائمکس ایک دم تبدیل ہوگیا جو عورت کے بدلتے روپ کی طرف اشارہ کر رہا۔

نگار عظیم کے افسانوی کینوس پر اگر اعلیٰ سوسائٹی کے افراد نظر آتے ہیں تو وہ مڈل کلاس طبقے کی بھی افسانہ نگار ہیں۔اور ساتھ ہی وہ ناپسندیدہ افراد بھی ہیں جو سماج میں رہتے ہوئے بھی اپنی کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے، ان کی زندگیوں پر کبھی منٹو نے افسانے لکھ کر اُنھیں بھی سماج کا حصہ بنا دیا تھا۔اُس کی تقلید میں کچھ لکھنے والوں نے بھی اُن کی طرف توجہ دی، لیکن وہ خود، خود لذتی کے شکار ہوگئے۔ اُنھیں اُن کے جسم اور اُن کی ضروریات تو دکھائی دی لیکن اُن کے اندر سانسیں لینے والی پاکیزہ روح نہیں دکھائی دی۔نگار عظیم کا یہی کمال ہے کہ اُنھوں نے اُن کے جسم اور ضروریات میں اُس روح کی تڑپ کو بھی محسوس کیا اور اُسے اس انداز سے متعارف کروایا کہ پڑھنے والا بھی اُس درد سے بلبلا اُٹھا، اُن کے افسانوں میں ''عکس، مرد، بدلے کا سہاگ، ریڈ لائٹ، بیاہ، تعلق، بابا، بھوک'' وغیرہ وہ افسانے ہیں جن کا مطالعہ قاری کو بہت دیر تک بے چین رکھتا ہے اور وہ خود افسانوں کے کرداروں میں کہیں گم ہوجاتا ہے۔

افسانہ ''عکس'' کا موضوع اس قدر اچھوتا ہے کہ شاید ہی یہ کسی کے قلم کا حصہ بن پاتا، محبت کا ایسا خواب جو نہ جانے کتنی آنکھوں نے دیکھا ہوگا لیکن اسے بیان کرنے کی جسارت کوئی نہ کرسکا۔یہی وہ منٹو جیسی جسارت ہے جس نے نگار عظیم کو ایک منفرد افسانہ نگار بنا دیا۔افسانے میں مرکزی کردار ''مہر'' بیٹی ہے۔ جس کی اور بھی بہنیں ہیں۔والد شاعر ہیں، جو بظاہر نہایت سخت مزاج ، مذہبی رجحانات کے پابند اور اُصول پسند ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنی لڑکیوں کو ٹوکنے والے، بیوی پر بات بے بات غصہ اُتارنے والے، چاہتے ہیں کہ بیٹیاں پڑھیں، لیکن ادب کے سروکار کو اُن کے لیے پسند نہیں کرتے۔آخر ایک دن جب اُنھیں پتہ چلتا ہے کہ مہر افسانے لکھ رہی ہے تو کچھ ناراض ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی مشورہ بھی دیتے ہیں کہ چھپنے سے پہلے کسی کو دکھا دیا کریں، رفتہ رفتہ والد کا غصہ کم ہوجاتا ہے اور مہر اپنے والد سے بہت قریب ہوجاتی ہے۔وہ اُن کا ہر طرح خیال رکھتی ہے۔اور وہ باپ کی چہیتی بیٹی بن جاتی ہے۔

والد کا انتقال ہوجاتا ہے۔اس کے بعد گھر کا ہر فرد دعویٰ کرتا ہے کہ والد صاحب خواب میں آئے تھے لیکن وہ مہر، جس سے وہ بہت قریب تھے اُس کے خواب میں نہیں آتے، وہ اُنھیں کیسے کیسے یاد کرتی ہے۔اُن کا تصور باندھ کر سوتی ہے لیکن وہ خواب میں نہیں آتے۔وہ اُن کے لیے تڑپتی ہے:

''ابا۔۔۔کاش۔۔۔ایک بار مجھے بھی نظر آیئے۔۔۔کیسے ہیں؟ کہاں ہیں، آپ کی یاد میرے ذہن کے ٹکڑے ٹکڑے کیے دے رہی ہے۔۔۔ابا نظر آیئے۔۔۔ابا نظر آئے۔۔۔اُف میرے خدا۔۔۔یہ میں نے کیا دیکھ لیا ۔۔۔؟؟ میرا وجود بکھر رہا ہے۔۔۔یہ سب کیا ہے۔۔۔؟ابا کی پاکیزگی اور میری والہانہ محبت کا یہ انداز۔۔۔؟؟ابا اور میں اتنے قریب۔۔۔؟؟''

نگار عظیم نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے۔اس افسانے کو جس قدر پسند کیا گیا، اُسی قدر اس کی مخالفت بھی ہوئی لیکن ڈاکٹر قمر رئیس نے اس افسانے کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے واضح کیا کہ:

''نفسیات کا ایک اُصول ہے کہ لڑکی اپنے باپ یا بڑے بھائی کو مردانہ وجاہت کا ماڈل مانتی ہے اور اس آئینہ میں اپنے محبوب کے خط و خال دیکھتی ہے۔''عکس'' کی ہیروئین بھی اپنے باپ کو اپنا آدرش مانتی ہے لیکن خوابوں کی دنیا پر آدمی کا بس نہیں ہوتا۔وہاں جب مہربان باپ کا امیج محبوب کی شبیہ میں منقلب ہوتا ہے تو معصوم لڑکی کی وحشت اور حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔وہ ایک روحانی اذیت محسوس کرتی ہے اور نہیں جانتی کہ لاشعوری دنیا کی اپنی سچائیاں ہوتی ہیں۔ فنّی تکمیل کے نقطۂ نظر سے یہ نگار کی شاہکار کہانیوں میں سے ایک ہے۔''

(پیش گفتار۔ڈاکٹر قمر رئیس۔کتاب۔عکس۔ص۔۳)

افسانہ ''مرد'' میں اُنھوں نے مرد کے اُس اصلی جوہر کو پیش کیا ہے جہاں مردانگی کردار کی اعلیٰ سطحوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔اشرف علی خان ایک متمول خاندان کا خوبرو نوجوان ہے۔اُس کے بڑے بھائی اُن تمام لذّتوں کے پروردہ ہیں جو ایسے خاندانوں میں ہوتا آیا ہے۔گھر کی باندیاں ایسے رنگین مزاج لڑکوں کو نہایت آسانی سے رجھانے کا ہنر جانتی ہیں۔ان ہی باندیوں میں ایک باندی زمرد بھی ہے جو اشرف علی خان کو اپنی طرف راغب کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتی، لیکن وہ ہر بار کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر اور کبھی اُسے سمجھا بجھا کر بچ نکلتے ہیں۔ آخر اُس کی شادی طئے ہوجاتی ہے اور وہ نکاح سے پہلے کی رات اشرف علی کے

کمرے میں دلہن بنی داخل ہوتی ہے:

''زمرد تم یہاں؟ اس وقت؟'' ہلدی، اُبٹن اور زعفران کی ملی جلی خوشبو، اُن کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی اور وہ نظریں نیچی کیے ہوئے اُن کے سامنے کھڑی تھی۔

''زمرد۔۔۔!'' وہ مجسم سوالی تھے۔

''جی۔۔۔وہ۔۔۔میں نے نادانی میں آپ کو حاصل کرنے کی قسم کھائی تھی۔اب جب کہ میں جا رہی ہوں تو کیا میری قسم۔۔۔''

''زمرد۔۔۔'' کمرے کے در و دیوار جیسے لرز گئے ہوں، ''تم ہوش میں تو ہو۔۔۔تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔۔۔ورنہ۔۔۔ورنہ تم بدنام ہو جاؤ گی، کل تمہاری شادی ہے۔'' وہ بڑی مشکل سے جملہ پورا کر سکے۔اُن کی آنکھیں آگ اُگل رہی تھیں۔

''بدنام تو آپ ہو جائیں گے چھوٹے صاحب، کیونکہ۔۔۔کیونکہ میں کہہ دوں گی کہ آپ ہی نے۔۔۔''

اشرف علی کا غصہ ساری حدیں پار کر چکا تھا۔اُنھوں نے ایک زور دار تھپڑ اُس کے گال پر رسید کیا۔۔۔کمینی۔۔۔چلی جا یہاں سے۔۔۔'' ''اُف۔۔۔تم انسان نہیں ہو چھوٹے صاحب۔۔۔اور تم مرد بھی نہیں ہو۔۔۔'' اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔۔۔اور اشرف علی خان نے یہ آخری وار بھی سہہ لیا کیونکہ دراصل وہ اصلی مرد تھے۔''

افسانہ ''بدلے کا سہاگ'' ایک بیٹی کی شادی کی خاطر باپ کی قربانی کی داستان ہے تو افسانہ ''ریڈ لائٹ'' زمانے کی ہوس پرستی اور ایک باپ کی بے بسی کی کہانی ہے۔افسانہ ''بیاہ'' کے ذریعے نگار عظیم نے یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ بیاہ اصل میں دو جسموں کے ملن سے ایک نئی زندگی کی شروعات کا بہانہ ہے، لیکن سماج نے اُسے کس قدر مشکل بنا دیا ہے۔اس افسانے میں دو کہانیاں ہیں۔ پہلی کہانی شیلا کا بیاہ ہے۔جس میں ڈھیروں جہیز، باجے تاشے، ناچ رنگ، ہنگامہ سب کچھ ہے لیکن اس کے باوجود تو ہم پرستی اس بیاہ کے آڑے آجاتی ہے۔ ڈھیروں جہیز، روپیہ پیسہ خرچ کس لیے کیا جاتا ہے؟ محض زندگی کی ایک ضرورت کے لیے۔دوسری کہانی ریلوے اسٹیشن میں پان، بیڑی سگریٹ بیچنے والے ایک اپاہج رتّی اور ایک بھیک مانگنے والی لڑکی ہرنی کی ہے۔یہاں جسم کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کسی جہیز، ہنگامے کی ضرورت نہیں ہے۔کبھی بیس روپیہ دے کر تکڑ والا کنکٹا پوری کر دیتا ہے تو کبھی مندر کے سنت گورو بابا کا چیلا جھولی بھر پرساد دے کر۔رتّی بھی چھ روپیہ دے کر بیاہ کی اہم منزل سر کر لیتا ہے۔یہ افسانہ ایک گہرا طنز ہے۔

نگار عظیم جنسی موضوعات کو ممنوع نہیں قرار دیتیں۔اس لیے کہ وہ جانتی ہیں کہ جنسی جبلت اور جنسی خواہشات فرد کی ایک اہم ضرورت ہے، لیکن اُن کے افسانوں کا یہ کمال ہے کہ وہ جنسی موضوعات میں بھی معاشرت کی اعلیٰ قدروں کو پامال نہیں ہونے دیتیں۔ بہکے ہوئے قدم بھی تھم جاتے ہیں اور رشتوں کا تقدس اپنا اثر دکھانے لگتا ہے۔لڑکیاں جب گھر سے باہر قدم نکالتی ہیں تو خواہ مخلوط تعلیم گاہ ہو، یا ملازمتوں کے مقام، اچھی بُری صحبتیں اپنا اثر دکھاتی ہیں۔کبھی تو قدم بہک جاتے ہیں اور کبھی کردار مضبوط قلعہ بن کر ہر حملے کو ناکام بنا دیتا ہے، اور کبھی کبھی اعتماد بھی دھوکا دے دیتا ہے۔نگار عظیم کا افسانہ ''تعلق'' بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔کچی عمر کی گیارہویں جماعت کی طالبا ملکہ بھی ایسی ہی ایک بگڑی ہوئی لڑکی شبو کا شکار ہو جاتی ہے۔جو اُسے ایک دولت مند عیاش لڑکے کو اپنا بھائی بتا کر اسے پانچ ہزار روپیہ کے عوض پھنسا کر چلی جاتی ہے۔نگار عظیم نے اس افسانے میں اُسی نفسیاتی حربے کو استعمال کیا ہے جس طرح بلّی چوہے کا شکار کرنے کے بعد اُس پر ایک دم نہیں ٹوٹتی بلکہ اُس کے ساتھ خوب کھیلتی ہے۔اُسے بھاگنے کا موقع بھی دیتی ہے اور بھاگنے بھی نہیں دیتی۔وہ لڑکا بھی ملکہ پر ایک دم اپنا عندیہ ظاہر نہیں کرتا بلکہ اُس سے باتیں کرتا ہے۔اپنے عالیشان گھر کے ایک ایک حصے کو دکھاتا ہے۔یہاں تک کہ اپنے بیڈ روم میں لے کر جاتا ہے۔ٹیپ ریکارڈر پر موسیقی کا کیسٹ لگاتا ہے۔شراب کی چسکیوں کے درمیان شبو کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔اب ملکہ کی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کہاں پر آگئی ہے۔وہ اُس سے گڑ گڑانے لگتی ہے کہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔اُسے جانے دے، لیکن نوجوان شبو کو پانچ ہزار کی رقم دے چکا ہے۔وہ نہیں مانتا ہے، بلکہ اپنا موڈ بنانے کی خاطر اُس سے سوالات کرتا ہے کہ وہ کہاں رہتی ہے، اور کس کی بیٹی ہے۔جیسے ہی اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس کے اُستاد کی بیٹی ہے۔اُس کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے اور پھر اُس نے ملکہ کے گدّی سے بال پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا:

''پل بھر میں اُس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا، تڑاخ تڑاخ۔۔۔

ملکہ لرز گئی۔تو اب یہ مار مار کر اُسے قابو میں کرے گا، ''کیا کر رہے ہو؟'' وہ چیخی، ''پاگل ہو تم۔وہ اور زور سے چلائی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔۔۔تم یہاں۔۔۔کیا کرنے آئی ہو یہاں، بولو؟؟۔۔۔یہاں کیا کر رہی ہو تم؟؟'' اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا، ''اور۔۔۔اور وہ کمینی شبو؟؟۔۔۔تمہاری دوست؟۔۔۔دوست ہے وہ؟۔۔۔چلو نکلو یہاں سے۔۔۔نکلو۔۔۔گیٹ آؤٹ۔۔۔خبردار جو پیچھے مڑی۔۔۔'' وہ زور سے چیخا۔۔۔اور پھر ملکہ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا اور انتہائی غصے میں اپنی لال لال آنکھیں نکالتے ہوئے بولا، ''آئندہ تمھیں اُس کے ساتھ دیکھ لیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔سمجھیں۔۔۔''

نگار عظیم کا یہ افسانہ میرے نزدیک صرف اُن کا بہترین افسانہ نہیں ہے بلکہ یہ اردو کا ایک عمدہ نفسیاتی افسانہ ہے۔اگلے افسانہ میں نگار عظیم اپنے قاری کی ملاقات افسانہ ''بابا'' کے ذریعے شیر خان سے کرواتی ہے۔شیر خان کون ہے؟ ایک یتیم لڑکا جس کا بچپن فٹ پاتھ پر گالیاں اور جھڑکیاں کھاتے ہوئے گزرا، جس نے بوٹ پالش کیا، ٹھیلے گھسیٹے، محنت مزدوری کی پھر بھی آدھا پیٹ کھانے کو

ملا، چوریاں بھی کیں، جوابھی کھیلا، جوانی میں قدم رکھا تو بازاری عورتوں کے ساتھ راتیں بھی بسر کیں، غرض زندگی نے اُسے ہر قسم کے تجربات سے گزارا، پھر اُس نے کہیں بڑا ہاتھ مارا، اب اُس کے پاس کئی رکشے ہیں۔اب وہ ایک مقام پر ٹھہر گیا ہے۔لالہ کے ڈھابے پر کھانا بھی کھاتا ہے اور نکٹے لالہ کی لائی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ عیش بھی کرتا ہے۔اس افسانے کا ماحول، کردار پھر ایک بار قاری کو اُن لوگوں میں پہنچا دیتا ہے۔ جہاں دادا گری ہے، شراب کا اڈا ہے سستے کھانے کی ہوٹلیں ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو اس قسم کے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

لالہ دھندے کی خاطر ایک خوبصورت لڑکی ثمینہ کو موٹی رقم میں خرید کر لاتا ہے لیکن وہ لڑکی کسی گاہک سے رام نہیں ہوتی جو بھی آتا ہے ناکام لوٹ جاتا ہے۔شیر خان اپنی ضرورت اور نکٹے لالہ کی فرمائش پر کمرے پر دستک دیا، دروازہ کھلا اور شیر خان اُسے دیکھتا رہ گیا:

''مجسم حسن، اُداس اور خاموش۔تصویرِ غم، ایسا معصوم حسن اُس نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔صاف شفاف نہایا ہوا جسم، ہلکے آسمانی رنگ کا ہلکا سا سوتی سوٹ، فرش کو چھوتا ہوا بڑا سا آنچل، لمبے بالوں سے ٹپ ٹپ ٹپکتے شبنمی قطرے، کنگھا ہاتھ میں لیے وہ حیران کن نظروں سے ایک ٹک اُسے گھورے جا رہی تھی۔جیسے مدت کے بعد کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔۔۔یا پھر مدت کے بعد کسی خواب سے جاگی ہو، اُسے محوِ حیرت دیکھ۔۔۔شیر خان خود آگے بڑھا اور صوفے پر دراز ہو گیا۔''

وہ وہاں گھنٹہ بھر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور پھر واپس ہو گیا، نکٹے کو اس تاکید کے ساتھ کہ وہ کل پھر آئے گا لیکن وہ اُس کے پاس کسی دوسرے گاہک کو نہ بھیجے۔

دوسرے دن جب شیر خان وہاں گیا تو وہ لڑکی ''بابا'' کہتی ہوئی اُس سے لپٹ گئی۔اس لفظ بابا نے شیر خان کو یکسر بدل دیا، اُس نے اپنا ایک رکشہ بیچ کر اُس لڑکی کو اپنے گھر لایا، تمام بُرے کاموں سے توبہ کر لی، اور پھر اُس کی شادی کے لیے کسی لڑکے کی تلاش میں لگ گیا۔بظاہر یہ ایک عام سا پلاٹ ہے۔لیکن نگار عظیم نے کرداروں کی تشکیل، اور افسانے کے ماحول کو جس عمدگی سے ترتیب دیا ہے، اُس نے افسانے کو ایک کامیاب افسانہ بنا دیا ہے۔

نگار عظیم کے افسانوں میں ''کسک'' اور ''فرق'' دو ایسے افسانے ہیں، جنھیں پڑھ کر قاری ایک عجیب سا انبساط محسوس کرتا ہے۔

ایک افسانے میں بیٹا اپنی مرحوم ماں کا متلاشی ہے تو دوسرے افسانے میں ماں ایک خوبرو نوجوان لڑکے میں اپنے ننھے منے بیٹے کی جوانی دیکھتی ہے۔دونوں افسانوں میں تجسس، غلط فہمیاں افسانے کو آگے بڑھاتی ہیں۔اور کلائمکس پر وہ غیر متوقع راز منکشف ہو جاتا ہے جسے پڑھ کر قاری نگار عظیم کی فنکاری کو داد دیتا ہے۔

نگار عظیم نے اپنے افسانوں میں تکنیک کے تجربے بہت کم کیے ہیں۔اُن کے زیادہ تر افسانے تخلیقی بیانیہ ہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔زبان و بیان پر اُنھیں قدرت حاصل ہے۔اُن کے افسانوں میں علامتیں اور تشبیہات بھی ملتی ہیں لیکن ان کی وجہ سے اُن کے افسانے گنجلک نہیں ہو جاتے بلکہ ترسیل میں معاونت کرتے ہیں۔اُن کے متنوع افسانہ نگار ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، یہ بھی سچ ہے کہ اُن کا فن جہاں ناقدینِ ادب اور قارئین سے اعتبار سے حاصل کر چکا ہے وہیں اپنے معاصرین میں اُنھیں منفرد و ممتاز مقام پر پہنچا چکا ہے، لیکن اس کے باجود اُن میں نہ فنکار کی اکڑ ہے اور نا ہی وہ خود کے پروجیکشن میں دلچسپی لیتی ہیں۔ پھر بھی ممتا کی یہ مورت اپنے بے مثال فن، سچے خلوص اور بے لوث سلوک کے باعث ہر مقام پر عزت و احترام اور توقیر کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔


## Funny Holiday

پاکستان کے تیسرے وزیراعظم محمد علی بوگرہ اپنے تمام سٹاف کے ہمراہ ایک ماہ کے لئے دارالحکومت کراچی سے مری تشریف لائے۔

ایک روز ان کے پی اے علی نے وزیراعظم سے کہا کہ وہ کراچی واپس جانا چاہتے ہیں، چھٹی دی جائے۔

بوگرہ صاحب نے پوچھا، کیا کام ہے؟

پی اے علی نے کہا My wife is expecting a baby

ان کے دوسرے پی اے ڈیسوزا بھی ان کے پاس کھڑے تھے وہ جھٹ سے بولے کہ مجھے بھی چھٹی چاہئیے۔۔۔

وزیراعظم نے پوچھا کہ تمہیں کیا کام ہے؟

انہوں نے جواب دیا My wife is expecting me

یہ سن کر وزیراعظم بہت ہنسے اور دونوں کو چھٹی دے دی۔

# ''مادری زبان''

ڈاکٹر مولا بخش

(●)

ڈاکٹر نگار عظیم خواتین افسانہ نگار کے روپ میں اب ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہیں کہ ان کا تعارف ان کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں بن گئی ہیں، جن میں جنس، فطرت اور انسان کی نفسیاتی رموز کے تجزیئے بالخصوص افسانے کے متحیر کردینے والے انجام کے ذریعے کئے گئے ہیں۔ نگار دراصل یہ چاہتی ہیں کہ وہ کبھی کبھی یہ بھول جائیں کہ وہ خاتون افسانہ نگار ہیں اور یہ یاد رکھیں کہ وہ افسانہ نگار ہیں تاہم تانیثیت کے مسائل پر ان کے یہاں بہت سی کہانیاں مل جاتی ہیں جن میں ایکیوریم، عکس، بیل وغیرہ کا نام بطور خاص لیا جاسکتا ہے۔ غزال ضیغم کے یہاں جنسی اور صنفی سیاست کی کہانیاں ہیں۔ مثلاً نیک پروین، سوریہ وشی، چندرونشی، جیسے افسانوں میں انہوں نے اس کی مثال پیش کی ہے۔ ان کے یہاں بیدی کی طرح عورت مظلوم اور مرد اکثر ظالم نظر آتے ہیں۔ آپ غزال کی کہانی ایک بار پڑھنا شروع کردیں تو کہانی بغیر پڑھے رہ نہیں سکتے۔ ترنم ریاض (جنہیں یہ احساس ہے کہ مغربی تانیثیت، مغرب کے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کی پیداوار ہے، دیکھیں: چشم نقش قدم، ترنم ریاض، 2005، ص: 33) معصومیت اور فطرت کے متوازی عورت کو رکھتے ہوئے اپنی کہانیوں میں ایک فلسفیانہ ماحول خلق کرتی ہیں اور جنسی افتراق سے گریز کرتے ہوئے عورت کی صنفی شناخت اور اس کی تفہیم کا فنّی سیاق فراہم کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی سب سے بہتر کہانی ''رنگ'' کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جب کہ نگار عظیم مرد اور عورت کے تقابل میں یقین نہیں رکھتی ہیں، نہ کسی کے ساتھ وہ جانب دارانہ رویہ اختیار کرتی ہیں بلکہ وہ کہانی میں عورت اور مرد کو فطری انداز میں لاتی ہیں نیز انہیں آزادی دیتی ہیں اور ان کرداروں کے متعلق قاری از خود اپنی رائے قائم کرلیتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اپنے مضمون ''اردو کی خواتین باغی افسانہ نگار'' میں لکھا ہے:

''تخلیق کی سطح پر عورتوں کا قلم باغی اور وحشیانہ بن گیا ہے۔ تو یہ بھی مرد سماج کی ہی دین ہے۔ بشریٰ اعجاز، ثمینہ راجا، طاہرہ اقبال، نفیس بانو شمع، ترنم ریاض کے یہاں بغاوت نئی کہانی کا مرکز بن گئی ہے۔ غزال ضیغم لیسبین بن جانے کی صلاح دیتی ہیں تو کہانی 'عکس' میں نگار عظیم باپ بیٹی کے جنسی رشتے پر سوالیہ نشان کھڑا کرتی ہیں۔ عورت دراصل اپنے وجود کی نفرت میں جی رہی ہے۔''
(اردو کی خواتین باغی افسانہ نگار، مشرف عالم ذوقی، مباحثہ، پٹنہ، جلد:4، اکتوبر تا دسمبر 2005، شمارہ: 22، ص:42)

ڈاکٹر نگار عظیم کے اب تک دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں ''عکس'' اور ''گہن''۔ اس کے بعد انہوں نے نصف درجن ایسی کہانیاں لکھی ہیں جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں فن اور اسلوب نیز موضوعات کی سطح پر کچھ خوش آئند تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ان کہانیوں میں ایکیوریم، میڈی ٹیشن، مردار اور زیر غور افسانہ ''مادری زبان'' ہے۔

ڈاکٹر نگار عظیم کا افسانہ ''مادری زبان'' کی داخلی ساخت میں دراصل ایک ایسی بغاوت کا پیغام پوشیدہ ہے جس سے دنیا کے کسی خاص مذہب کے لوگوں کی کایا پلٹ ہوجائے۔ افسانے کی راویہ واحد متکلم مردم شماری کے لیے نکلتی ہے اور ایک متوسط درجے کی مسلمان فیملی کے جملہ امور سے متعلق خانے پوچھ پوچھ کر بھرتی جاتی ہے لیکن مادری زبان کیا ہے کا جواب عربی سُن کر اس گھر کی خاتون سے اصرار کرتی ہے کہ بی بی آپ اردو بول رہی ہیں اور آپ عربی کیوں بطور مادری زبان لکھوا رہی ہیں؟

آپ عرب سے نہیں آئی ہیں۔ آپ اردو لکھوایئے لیکن عورت بدتمیزی سے پیش آتے ہوئے راویہ جسے اردو زبان سے لگاؤ ہے، کو ڈانٹ کر زبان کے خانے میں عربی لکھوا ہی لیتی ہے۔ یہیں پر دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عورت اَن پڑھ ہے، وہ اپنے مذہب کی زبان کو ہی اپنی زبان سمجھتی ہے اور یا تو وہ یہ کہہ رہی ہے کہ اب سارے مسلمانوں کو ''عربی'' کو ہی اپنی زبان سمجھ لینا چاہیے اور عربی بولنا لکھنا اور پڑھنا چاہیے اور اگر ایسا ہے تو یہ ایک سنسنی خیز سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلی کا اشاریہ ہے۔

اس افسانے کا عنوان ''زبان'' بھی ہوسکتا تھا لیکن کہانی کا مزاج خالصتاً سیاسی ہوجاتا تہذیبی نہیں۔ کہانی کو ایسے میں بدلنا پڑتا۔ اس کہانی کا عنوان ''مادری زبان'' ایک ایسا عنوان ہے جسے قاری ہرگز افسانہ پڑھ کر بدلنا نہیں چاہے گا کیونکہ ایسا کون ہے جو اپنی مادری زبان سے محبت نہیں کرتا؟ ایسا کون ہے جو اس کی جگہ کسی اور زبان کو دینا چاہے گا لیکن ان جملہ حقائق کے باوجود کبھی کبھی کچھ سیاسی اور تاریخی حالات ایسے بھی پیدا ہوجاتے ہیں کہ جن سے مجبور ہوکر کسی ملک کے شہری اپنی اس پیاری سی شئے سے بھی دست بردار ہوجانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ایسا وہ خوشی سے نہیں کرتے اس کے عقب میں مختلف النوع اقسام کی مجبوریاں اور خوف کے سائے ہوتے ہیں۔ افسانہ ''مادری زبان'' میں ایک ایسی ہی خاتون کے مذکورہ بالا رویئے کو تاریخی اور سیاسی سیاق میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

افسانہ واحد متکلم کے صیغے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے کی راویہ بھی اس افسانے کا اہم کردار ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر افسانہ واحد غائب صیغے میں یعنی ہمہ دان بیانیہ کے سہارے لکھا گیا ہوتا تو ہم Census میں مصروف اس عورت کے بارے میں کچھ اور جان سکتے تھے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ واحد غائب کے صیغے میں بیان کنندہ، کہانی اور اس کے کرداروں سے ایک خاص طرح کا فاصلہ رکھتا ہے اور اپنے خیالات کو تھوپنے کی کوشش کم کرتا

ہے جیسا کہ راویہ نے چونکہ واحد متکلم کا صیغہ اختیار کیا ہے اس لیے کچھ جگہوں پر اس خاتون کے بارے میں اپنی رائے قائم کی ہے۔ اس لیے ان دونوں صورتوں میں افسانہ نگار کو معروضیت خلق کرنے کے لیے اپنے اپنے طریقے کے وسائل پیدا کرنے پڑے ہیں۔ چونکہ زیرِ غور افسانہ ''مادری زبان'' واحد متکلم میں بیان ہوا ہے اس لیے راویہ کا تجربہ، ذاتی تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ خاتون جس کے یہاں راویہ Census کے لیے جاتی ہے اور جو بولتی اردو ہے اور مادری زبان کے خانے میں عربی لکھوانے پر مصر ہے مردم شماری کا عمل پورا ہونے کے بعد راویہ نے اس خاتون کے رویئے پر جس قسم کی جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ اس خاتون کی تلخ اور تیکھی باتیں اس نے صرف مادری زبان کے لیے برداشت کی ہیں۔ لیکن اس کی وجہ نہیں بتائی ہے کہ کیوں وہ عورت سفید جھوٹ بولنے پر مجبور ہے؟ بتانا بھی نہیں چاہیے تھا کہ اس عمل سے افسانہ اوسط درجے کا ہوجاتا۔ اس لیے قاری افسانے کے متن سے اس کا جواب تلاش کرلیتا ہے۔ اگر راویہ نے اس کی وجہ راست طریقے سے بیان کردی ہوتی تو راویہ اس کہانی میں محض ایک راویہ بن کر رہ جاتی اور قاری اس کی جھنجھلاہٹ یا مادری زبان سے لگاؤ کے جذبے کو اپنا جذبہ نہیں سمجھتا۔ دراصل راویہ کی جھنجھلاہٹ اور کھسیاہٹ ہی کی وجہ سے قاری اس سفید جھوٹ بولنے والی عورت کے اندر کے اس خوف کو بھانپ لیتا ہے جس کا اظہار مکالموں میں ان جملوں کی شکل میں ہوگیا ہے۔ جن جملوں میں اس خاتون نے اس ملک سے اُسے کون نکالے گا جیسے خوف کا اظہار کیا ہے ایسے جملے کسی شخص کے منہ سے تب نکلتے ہیں جب وہ کسی قسم کی احساس کمتری میں مبتلا ہو جسے ہم نفسیات کی اصطلاح میں Defence Mechanism کے نام سے جانتے ہیں۔ مثلاً:

وہ عورت جس کے گھر راویہ Census کے لیے پہنچی ہے اس کے گھر کے دروازے پر کوئی کال بیل نہیں ہے۔ آواز دینے یا کھٹکھٹانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ گویا یہ ایک غریب مسلمان کا مکان ہے۔ Census میں یہ پتہ چلا کہ باپ بھی اَن پڑھ ہی ہے یعنی اشارہ اس طرف ہے کہ مسلم آبادی کا بڑا حصہ ابھی اَن پڑھ ہے اور غربت کی زندگی بسر کررہا ہے۔ راویہ مردم شماری کرنے ہی نکلی ہے لیکن اس کی توجہ سوالات و جوابات کے اس خانے پر ہے جس میں مادری زبان کیا ہے کا جواب لکھنا ہے۔ راویہ کی مادری زبان اردو ہے اور ہر شخص کو اپنی مادری زبان سے اتنا ہی لگاؤ ہوتا ہے جتنا اپنی ماں سے، کیونکہ مادری زبان دراصل ماں کی زبان یعنی ماں ہی کا لسانی روپ ہوتی ہے۔

راویہ ہزار ہا دقتیں برداشت کرتے ہوئے ایک بالغ لڑکی سے مردم شماری کے سارے خانے پوچھ پوچھ کر پُر کرلیتی ہے لیکن گھر کی مالکن کو راویہ سے سخت الجھن سی ہورہی ہے۔ وہ اپنی بالغ لڑکی کو بار بار گھر کے اوپر کی منزل سے ڈانٹ رہی ہے۔ دراصل وہ راویہ کو کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی۔ آخر کار وہ راویہ کے پاس آجاتی ہے اور وہ خاتون راویہ سے ایسے باتیں کرتی ہے جیسے وہ کوئی ملیچھ یا جاسوس ہو۔ اس مسلمان عورت کے خوف اور عدم تحفظ کے احساس سے متوحش ذہنی حالت کے تجزیئے کے لیے یا اندازہ کرنے کے لیے ذیل کے طویل اقتباس کا مطالعہ ضروری ہے۔ پیش ہے راویہ اور اس عورت کے مابین ہوئے مکالموں کے اہم حصے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''ایک شخص کے اُنتالیس کالم پورے کرنے کے بعد۔۔۔ میں دروازے پر کھڑے کھڑے کبھی ایک گھٹنے پر فارم رکھتی کبھی دوسرے پر۔۔۔ تبھی ایک خاتون غصے سے بپھرتی ہوئی زینہ کی اوپری سیڑھی سے چلائی۔

''اری او کمبخت اوپر آ۔ کیا کررہی ہے۔''

''امی ابھی آئی۔ نام لکھوا رہی ہوں۔

''کاہے کا نام؟ کس کا نام؟ میں نے منع کیا تھا نا؟ تیرے باپ گھر میں نہیں ہیں واپس بھیج دے۔ ہمیں کیا پتہ کیا لکھوانا ہے۔''

''زبان میں کیا لکھوایا ہے تو نے؟'' خاتون نے سیڑھیاں اترتے ہوئے بیٹی سے پوچھا۔

''جی اردو لکھ دیا ہے۔ میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ذرا مسکرا کر جواب دیا۔

''کیوں اردو کیوں لکھا؟ عربی لکھو'' وہ بگڑ گئی۔

''عربی؟ لیکن کیوں؟''

''زبان کا مطلب مادری زبان۔ آپ کی مادری زبان اردو ہے اردو لکھوایئے۔''

''اردو کیوں ہوتی؟ عربی لکھو۔'' خاتون کے تیور چڑھ گئے۔

''لیکن آپ تو اردو بول رہی ہیں۔''

''آپ عرب سے آئی ہیں کیا؟''

'آپ عربی بول کر دکھایئے' ان میں سے کسی ایک لڑکی نے الحمد کی سورۃ پڑھنا شروع کی تو وہ فوراً چہکی، بولی کہ نہیں بولی۔ اب تو بولی نہ عربی۔

اچھا جناب ٹھیک ہے ... عربی ہی لکھ دوں گی۔

''لیکن اب بساط پلٹ چکی ہے۔ وہ بری طرح بگڑ گئی۔''

''ہمارے پاس فالتو وقت ہے کیا۔ تمہارے نوکر ہیں کیا۔ ہمیں کیا فائدہ؟''

اس میں آپ کا بہت فائدہ ہے۔ آپ میری بات کا یقین کیجیے۔ آپ ہندوستان میں رہتی ہیں تو اس کا اندراج ضروری ہے۔ میں نے انہیں سمجھایا۔ چالیس برس سے رہتے ہیں۔ کون نکالے گا ہمیں؟

ذرا راشن کارڈ دکھا دیجیے۔ کیوں اس کا کیا کروگی ... نہیں ہے تو کیا کروگی۔''

''اچھا یہ بتایئے سب بچے ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک صحت مند ہیں نا؟ دیکھئے اس میں ایک خانہ ایسا ہے جس میں پوچھا ہے خدانہ کرے کوئی بچہ پاگل یا

اپاہج وغیرہ تو نہیں ہے؟''۔۔۔پاگل ہوگی تم! اپاہج ہوگی تم! ہمارے آدمی گنتی ہو۔ تمہارا کھاتے ہیں کیا۔ ہائے ڈالوگی۔ اتنی دیر سے کیا سترہ سترہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ رستہ لو اپنا۔۔۔

''چل ری چل اوپر۔۔۔ یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے۔ منع کیا تھا میں نے۔۔۔'' اس نے بیٹی کو پھٹکارا۔

''اس نے دھڑام سے میرے منہ پر دروازے کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔۔۔ مارے غصہ کے میرا سر بھنّانے لگا۔ دل چاہا کہ سارے کاغذات پھاڑ کر۔۔۔ لیکن میں ایسا کچھ نہیں کر سکی کیونکہ معاملہ مادری زبان کا تھا!''

مذکورہ بالا اقتباس کو پڑھنے کے بعد آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ اگر مادری زبان ہندی لکھوائی گئی ہوتی تو افسانے کی معنیاتی قدریں کچھ اور ہو جاتیں اور معنیاتی قدریں اردو اور ہندی کے لسانی جھگڑے تک ہی محدود ہو کر رہ جاتیں۔ مادری زبان اگر انگریزی لکھوائی گئی ہوتی تو معنی اور بھی محدود ہو جاتے لیکن مادری زبان عربی لکھوائی گئی ہے۔ اور یہیں سے افسانے کے اندر معنی فشانی کا مرکز یا ساختیہ عربی بن جاتا ہے اور تب افسانے کا قاری چونک جاتا ہے کہ ہندی نہیں انگریزی نہیں عربی کو ہی مادری زبان ثابت کرنے پر وہ عورت کیوں تلی ہوئی ہے؟ اس کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں:

۱۔ شاید اردو ہندوستان میں سیاست کے ہاتھوں ایک بدنام زبان یا ایسی زبان بن چکی ہے جو کسی مخصوص فرقہ یا کسی خاص اقلیتی فرقے سے وابستہ زبان تسلیم کر لی گئی ہے۔

۲۔ ایک ایسی زبان جس کا رشتہ روزگار سے ناکے برابر ہے۔

۳۔ ایک ایسی زبان جسے وہ روز استعمال کرتی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی کہ اس کی شناخت عربی سے نہیں بلکہ اردو سے وابستہ ہے اور عربی چونکہ اس کے مذہب کی زبان یا مذہبی فریضے کی ادائیگی کی زبان ہے یا اس کی مقدس کتاب کی زبان ہے اس لیے وہ عربی کو ہی اپنی مادری زبان سمجھ رہی ہے یا عورت چونکہ خاتون خانہ ہے اور کسی حد تک راوی کے بیان کے مطابق اَن پڑھ ہے اس لیے وہ اس عورت کو نہیں سمجھ پاتی جو Census کرنے آئی ہے اور اگر سمجھتی بھی ہے تو اس کے اندر ایک خوف بسا ہوا ہے جس کی تہہ تک پہنچنے کے بعد اندازہ ہوگا کہ یہ خوف ہمارے ملک میں نت نئے روز آنے والی آفات کی پیدا کردہ ہے جو کبھی مذہب، تو کبھی خطے، کبھی علاقے کے نام پر نازل ہوتی رہتی ہیں۔ یہ آفتیں دراصل فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعے آتی ہیں اور جن کی گونج سیاسی گلیاروں میں برسوں تک رہتی ہے اور اب تو ان باتوں کو ایک اَن پڑھ انسان بھی سمجھتا ہے اس لیے ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عورت ''عربی'' کو اپنی پناہ گاہ سمجھتی ہو یا ایسی زبان سمجھتی ہو جو سیاست سے عاری ہے یعنی (A-Political) ہے یا پھر یہ عورت ''عربی'' کو ہی مسلمانوں کی زبان بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی زبان ثابت کرنا چاہتی ہو اور اگر ایسا ہے تو یہ ایک انتہائی انقلابی قسم کا خیال ہے۔

گاندھی جی نے تعمیری پروگرام کے تحت ۱۹۴۸ء میں کہا تھا:

''ہماری اپنی مادری زبان کی نسبت انگریزی زبان سے زیادہ پریم کرنے کے کارن پڑھے لکھے اور سیاسی رجحان رکھنے والے، اونچے طبقے اور عام لوگوں کے بیچ ایک کھائی پیدا ہوگئی ہے اس کی وجہ سے ہندوستان کی زبانیں غریبی کا شکار ہوئی ہیں ...جس سوراج کی بنیاد اَہنسا پر ہو اس میں یہ بات لازمی ہے کہ ہر شخص آزادی کی تحریک میں براہ راست ذاتی طور پر حصہ لے۔ جتنا یہ کام پورے طور پر اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک اسے ہر قدم اس کی اپنی زبانوں میں نہ سمجھایا جائے۔'' (ہریجن سیوک 9/نومبر 47، بحوالہ کتاب، گاندھی جی اور قومی زبان کا مسئلہ: ص:222)

برسوں پہلے جو کچھ کہا گیا تھا وہ اب غائب ہو چلا ہے اور حاضر یہ ہے کہ آج اردو اور سنسکرت کے بارے میں بات کرنا جیسے سیاست کے بارے میں ہی گفتگو کے مصداق ہے۔ اردو کا نام آتے ہی سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ اردو کا علاقہ یا خطہ کہاں ہے؟ کس مذہب کی زبان ہے؟ یا کس کی زبان ہے؟ کس طرح کے ملک کی زبان ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک کثیر تہذیبی اور کثیر لسانی ملک کی زبان ہے جسے جملہ زبانوں کے ساتھ نباہ کرنا ہے۔ کسی ملک میں جو کثیر لسانی بھی ہو کسی ایک زبان کو بطور سرکاری زبان بنانے کی ضرورت دراصل تصور وطنیت کی پیدا کردہ ہے جس کی وجہ سے دوسری زبانیں خود کو حاشیے پر کھڑی محسوس کرتی ہیں یا ان کے بولنے والوں کو احساس کمتری میں مبتلا دیکھا جا سکتا ہے۔ اس افسانے کی مذکورہ خاتون کی جھنجھلاہٹ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے۔

1933 میں جی ڈی ساور کر نے کہا تھا کہ بھارت ان کا ہے جو پیتری بھو سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جن کے باپ دادا یہیں کے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے تو عرب ہے۔ خاتون ایسے میں عربی کو مادری زبان کیوں بتا رہی ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ سداسیوا نے کہا تھا کہ مسلمان تو اس ملک میں زیادہ سے زیادہ ایک مہمان کی طرح ہیں۔ تبھی تو وہ عورت اس بات پر زور دیتی ہے کہ ''کون نکالے گا ہمیں!'' جب بھارت آزاد ہوا تو اردو یہاں کی قومی زبان تھی اور آزادی کے بعد جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو یہی اردو ہندوستان میں حاشیے پر چلی گئی اور وہاں اردو مرکز میں آ گئی جہاں اس وقت 5 فیصد لوگ بھی اس زبان کو بولنے والے نہیں تھے۔ گویا وہاں اردو نے بہت سی زبانوں کو حاشیے پر لا کھڑا کیا۔ اِدھر ہندوستان میں ہندوستانی کو قومی زبان بنانے کا نعرہ Dead Horse ثابت ہو گیا اور اردو نظر انداز کر دی گئی۔ اُدھر پاکستان میں مرکز میں اردو جیسے ہی آئی وہاں کے اس خطے میں جسے بنگلہ دیش کہا جاتا ہے صاف طور پر کہا گیا کہ اردو قومی زبان ''ہوبے نا ہوبے نا'' اور ہندوستان میں اسے بدیسی زبان کہہ کر پالیسی سازوں نے نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور ہندوستان کے صوبہ جات میں اردو کی حیثیت باسی بھات میں خدا کا سانجھا کی ہوگئی۔

اس افسانے کی راویہ نے مردم شماری کے تحت خالی خانوں میں جو

بھی تفصیلات مختلف گھروں سے حاصل کی تھیں ان سب کو اس عورت کے گھر سے نکل کر چاک کر دینے تک کا فیصلہ صرف اس لیے کر لیتی ہے کیونکہ اس گھر کی عورت جس کی زبان اردو ہے وہ آخر کیوں اپنی مادری زبان عربی لکھوانے پر مصر ہے اور راویہ کو بھلا برا کہتی ہے، بے عزت کر کے گھر سے نکال دیتی ہے لیکن راویہ ایسا اس لیے نہیں کر پاتی کیونکہ سوال مادری زبان کا ہے اور یہیں پر اس زبان اور اس زبان سے جڑے حساس لوگوں کی بے چارگی کا شدید احساس قاری پر بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اردو جہاں پیدا ہوئی تھی وہاں حاشیے پر چلی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ خاتون اس ملک کی زبان سے متعلق سیاست کا تلازمہ بن گئی ہے۔

تانیثی راویہ جو صنفی سطح پر اس افسانے میں ایک کردار کا رول ادا کر رہی ہے دراصل اس عورت کے وجود کو بچانے میں لگی ہے جس کے نام سے اس کا کلچر آباد ہوا ہے یعنی وہ زبان جس میں خود وہ عورت سانس لیتی ہے اور اس کے تقدس اور اصلیت کو مجروح ہونے سے بچاتی ہے۔

اس افسانے کی ابتدا سے لے کر انتہا تک مرد کردار صرف گفتگو کی سطح پر ابھرتے ہیں۔ افسانے میں بچوں اور ان کی ماں اور راویہ ہی نظر آتی ہے۔ گویا اس افسانے کے ہیئتی ڈیزائن میں مصنفہ نے موجودہ معاشرے کے مزاج اور مستقبل کو سامنے رکھ دیا ہے۔ مادری زبان کے تحفظ کی ذمہ داری ایک عورت کے ہی کاندھوں پر رکھی گئی ہے۔ گویا آج بارود کے ڈھیر پر بیٹھی اس دنیا کو صرف اور صرف اب عورت ہی بچا سکتی ہے۔ دوسری طرف وہ عورت ہے جو اپنی مادری شناخت کی انکاری ہے۔ یہ سماج کا ایک اور چہرہ ہے جو افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔

کتنا بڑا المیہ ہے کہ دنیا کا ہر ماہر تعلیم ''ذریعہ تعلیم مادری زبان ہی ہو'' پر زور دیتا رہا ہے لیکن تیسری دنیا کے ممالک میں بالخصوص ہندوستان اور پاکستان میں ہم نے اس ''ماں'' کو کالونیل جبر اور اس کے سیاسی غلبے کی صورت میں جھٹلا دیا نیز اس تصور کو کہ ماں یعنی اس کی زبان میں بچے کی تعلیم ہو کو ایک مذاق بنا ڈالا۔ اس اعتبار سے ان ماؤں کو ہی نظر انداز کر دیا جنہوں نے بچوں کی ذہنی ساخت اور اس کی افتادِ طبع کی تشکیل میں حصہ ہی نہیں لیا بلکہ اظہار کے لیے اپنی زبان دی جس کا بدل کوئی دوسری زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسے میں یہ کہانی تانیثیت کے ایک ایسے مسئلے سے جڑ جاتی ہے جس پر غور نہیں کیا گیا ہے۔ یہاں مصنفہ نے دو سطح پر اس کہانی کی بافت میں بحث کے لیے مواد فراہم کیا ہے اور وہ یہ کہ سامراج وادی قوموں کے جبر و استحصال نے بہت سے ممالک میں بولی جانے والی زبانوں کو حاشیے پر لا کھڑا کیا ہے بلکہ پس پشت ڈال دیا ہے یعنی ان کی فطری سوچ پر پہرہ بٹھا دیا ہے اور ہمارے کالونیل آقاؤں نے یہ سمجھا دیا ہے کہ مادری زبان کے چکر میں جاہل لوگ ہی پڑے رہتے ہیں۔

اگر اس افسانے کو کسی مضامین کے مجموعے میں چھاپ دیجیے تو عنوان پڑھ کر آپ اندازہ کریں گے کہ اس مضمون میں مادری زبان پر ماہر تعلیم اور اہل لسانیات کی رایوں کا محاکمہ کیا گیا ہوگا۔ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہی ہو اس کا نعرہ بلند کیا گیا ہوگا۔ گویا افسانے کا عنوان نثر کی مقبول صنف مضمون نگاری سے ماخوذ ہے۔ اس طرح افسانے کے شارح اور قاری کو ایک کھلا سیاق فراہم کیا گیا ہے۔ افسانہ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون اور افسانے کے تاثر یا تاثیر میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے C e n s u s کے فارم میں مذکور سوالات کا Device منتخب کیا ہے اس لیے افسانہ Dialogic ہو گیا ہے اور بیانیہ سے زیادہ مکالموں کا سہارا لیا گیا ہے۔ مکالمہ اگر زیادہ ہو اور بیانیہ حصہ کم ہو تو افسانے میں اختصار کا حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن اگر مکالموں کو برجستہ بنانے میں چوک ہوئی تو افسانہ خراب بھی ہو جاتا ہے۔ چند ایک مقامات کو چھوڑ کر مکالمے کو فطری اور برجستہ بنانے کی خوبصورت کوشش اس افسانے کا ایک اہم وصف ہے۔ اس افسانے کی وہ خاتون جو اپنا تشخص چھپا رہی ہے کہ اس کی مادری زبان اردو نہیں عربی ہے حالانکہ اس کی مادری زبان اردو ہی ہے تو اس کا یہ عمل افسانہ میں دو طرح کے معانی کو بہ یک وقت ذہن میں لاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ سیاسی جبر کے تحت لوگ اپنے تشخص پر پردہ ڈال دیتے ہیں یہیں پر یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ ''عورت'' کس طرح خطرناک قسم کی ملکی سیاست کے جبر تلے زندہ ہے اور وہ نہیں نظر آ رہی جو راوی کے مطابق آنی چاہیے۔ یہ محض مادری زبان کو مخفی رکھنا نہیں بلکہ اشارہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ مردوں نے معاشرے اور ملک کو ایسے مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں نہ عورت محفوظ ہے نہ اس کے نام پر بولی جانے والی زبان۔

یہ کہانی عورت مرکزی Paradigm کے حوالے سے لکھی گئی ہے اور عورت کا کرب عنوان سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اردو کی جگہ عربی کو مادری زبان بتانے والی عورت کے وجود میں سرسراتا ہوا خوف ریاست کی سیاست کا اشاریہ بن گیا ہے۔ عورت کی اپنی شناخت کچھ بھی نہیں، اس کی مادری زبان بھی نہیں، یا وہ اگر اسے چھوڑنا چاہے تو بھی آزاد نہیں۔ کچھ اس طرح کے سوالات محترمہ کملا داس نے اپنی ایک نظم میں اٹھائے ہیں۔

Why not leave
Me alone, critics, friends, visiting cousins'
Everyone of you? why not let me speak in
Any language I like?
(See: Kamladas, Need for Re-assessment, Dr. Sharad Rajimwale
Feminist Engligh literature edited by Man Mohan K. Bhatnagar 2002 P:4)

باقی صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ کیجیے

# ''معجزہ یہ بھی دکھایا میں نے''

نسیم سحر
(راولپنڈی)

ڈاکٹر نگار عظیم ہندوستان سے تعلق رکھنے کے باوجود پاکستان کے ادبی حلقوں میں جانی پہچانی جاتی ہیں، وہ افسانہ نگار بھی ہیں، شاعرہ بھی اور تنقید نگار بھی۔ کسی کثیر الجہات قلمکار کے بارے میں اس کی تمام اصناف میں تحاریر کا تفصیلی جائزہ لینا اور اُن تمام کا احاطہ کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی جملہ تخلیقی وتنقیدی جہات کا جائزہ لیا جائے، اس لیے میں اختصار سے ان سبھی پر اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔

افسانہ نگار کے طور پر نگار عظیم اب ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہیں کہ ان کا تعارف ان کے مختصر افسانے بن گئے ہیں، جن میں جنس، فطرت اور انسان کی نفسیاتی رموز کے تجزیئے بالخصوص افسانے کے متحیّر کردینے والے انجام کے ذریعے کئے گئے ہیں۔ وہ اگرچہ تانیثیت کی حدود میں رہنے کی قائل نہیں، تاہم تانیثیت کے موضوع اور مسائل پر اُن کے یہاں بہت سے افسانے مل جاتے ہیں۔ عمومی طور پر وہ مرد اور عورت کے تقابل پر یقین نہیں رکھتی ہیں، بلکہ اپنے افسانوں میں عورت اور مرد کو فطری انداز میں لاتی اور انہیں اتنی آزادی دیتی ہیں کہ قاری ان کے کرداروں کے متعلق ازخود رائے قائم کرلیتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ماضی قریب میں ان کے یہاں فن اور اسلوب کے علاوہ موضوعات کے حوالے سے بھی کچھ خوش آئند تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ان کے حالیہ افسانوں میں سے ایک بہت ہی قابلِ ذکر افسانہ ''مادری زبان'' ہے جس کی داخلی ساخت میں دراصل ایک ایسی بغاوت کا پیغام پوشیدہ ہے جس سے دنیا کے کسی خاص مذہب کے لوگوں کی کایا پلٹ ہوجائے۔ اگرچہ یہ افسانہ نسبتاً طویل ہے مگر نگار عظیم کی گرفت اُس پر کرداروں کے رویّوں اور مکالموں کے ذریعے اس قدر مضبوط ہے کہ قاری اسے ایک ہی نشست میں اول تا آخر پڑھنا چاہتا ہے۔ افسانے کی راویہ واحد متکلم مردم شماری کے لیے نکلتی ہے اور ایک متوسط درجے کی مسلمان فیملی کے جملہ امور سے متعلق کوائف پوچھ پوچھ کر بھرتی جاتی ہے لیکن ''آپ کی مادری زبان کیا ہے؟'' کے جواب میں جب خاتون کہتی ہے ''عربی''، تو وہ کسی قدر حیران ہوکر خاتون سے اصرار کرتی ہے کہ بی بی آپ بول تو اردو رہی ہیں، عربی کو مادری زبان کیوں لکھوا رہی ہیں؟ جس پر راویہ کی مخاطب خاتون کسی قدر کھردرے انداز میں اصرار کرکے مادری زبان کے خانے میں عربی ہی لکھواتی ہے۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے اس افسانے کا اصل پیغام یہی ہے کہ ہندوستان میں اُردو زبان کو نظر انداز کرنے اور اُردو بولنے والوں سے نفرت کی جو فضا ہے اُس میں وہ مسلمان عورت اپنے مذہب کی زبان کو ہی اپنی زبان سمجھتی ہے اور بقول ایک نقّاد کے ''یا تو وہ یہ کہہ رہی ہے کہ اب سارے مسلمانوں کو 'عربی' کو ہی اپنی زبان سمجھ لینا چاہیے اور عربی بولنا لکھنا اور پڑھنا چاہیے، اور اگر ایسا ہے تو یہ ایک سنسنی خیز سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلی کا اشاریہ ہے''۔ افسانہ ''مادری زبان'' میں اس خاتون کے مذکورہ بالا رویّے کو تاریخی اور سیاسی سیاق وسباق میں مجموعی ماحول میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ افسانہ پڑھنے اور اس پر غور کرنے کے بعد قاری سمجھ لیتا ہے کہ اگر مادری زبان ہندی لکھوائی گئی ہوتی تو افسانے کی معنوی قدریں کچھ اور رخ اختیار کرجاتیں جن کا رُخ اردو اور ہندی کے لسانی جھگڑے کی طرف مُڑ جاتا۔ اِسی طرح اگر مادری زبان انگریزی لکھوائی گئی ہوتی تو افسانے کا تاثّر محدود ہوجاتا، لیکن جب ہندوستان میں رہنے والا کوئی کردار اردو یا انگریزی کی جگہ عربی کو مادری زبان لکھواتا ہے، تو یہیں سے افسانے کے اندر معنی فشانی اور لسانی عصبیت کا ایک جہانِ معنی کا مرکزہ عربی زبان کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور افسانے کا قاری کے سامنے یہ سوال کھڑا ہوجاتا ہے کہ وہ خاتون اردو، ہندی یا انگریزی کے بجائے عربی کو ہی مادری زبان ثابت کرنے پر کیوں بضِد ہے؟ اس کی کئی ایک وجوہات ہوسکتی ہیں اور ہندوستان میں یا کہیں بھی رہنے والا اردو بولنے والا ان وجوہات کی گہرائی میں بآسانی اُتر سکتا ہے۔

نگار عظیم نے راٹھور ونش کے ایک جاگیردار گھرانے میں جنم لینے والی مِیرا کے بارے میں ''مِیرا: احتجاج کی پہلی آواز'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اُس کا آغاز ہی یوں کرتی ہیں کہ پڑھنے والا چونک جاتا ہے، کہتی ہیں: ''کس کو پتہ تھا کہ جودھ پور میں راٹھور ونش کے ایک جاگیردار شاہی گھرانے میں پیدا ہونے والی مِیرا صرف راجستھان یا برج کی گلیوں میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر نکل کر عالمی سطح پر ایک تاریخ ساز شخصیت کے روپ میں جانی اور پہچانی جائیں گی''۔ اپنے مضمون میں انہوں نے میرا کی زندگی پر لکھتے ہوئے آخر میں جو سوال اٹھائے ہیں عورت کے حوالے سے وہ اتنے اہم ہیں کہ اس کا اقتباس پیش کرنا ضروری ہے اور اس لیے بھی ضروری ہے کہ نگار عظیم یقیناً میرا کی شخصیت اور اس کے احتجاجی یا مزاحمتی رویّوں سے متاثر تھیں، اسی لیے انہوں نے اپنی شاعری اور نثر میں یہی سوال اٹھائے ہیں۔ انہوں نے اس مضمون میں جو سوال اٹھائے ہیں یہاں مختصراً وہی پیش کیے جارہے ہیں۔

''آج بہت سارے سوال سامنے ہیں۔ کیا آج عورت ستی نہیں ہوتی؟ کیا آج بھی پتی اس کے لیے پرمیشور نہیں؟ کیا آج بھی پیار کرنے والی عورت زہر کا پیالہ نہیں پی رہی؟ کیا آج عورت کو اس کے تمام حقوق حاصل ہیں؟ کیا آج بھی عورت آگ میں نہیں جلائی جارہی؟ کیا آج مرد سماج کی اجارہ داری نہیں؟۔۔۔گلوبلائزیشن کے اس دور میں جب عورت صرف ایک اشتہار بن گئی ہے، اس کا اصل وجود اس کی پہچان کہیں گم ہوگئی ہے۔ ایسے میں کیا مِیرا کو ازسرِنو پڑھنے

کی ضرورت نہیں؟ ضرورت ہے، کیونکہ میرا اسمبل ہے احتجاج اور خود اعتمادی کا، شالینتا اور پیار کا۔ اوراس کے لیے مذہب دیش ذات اور ملک کی کوئی قید نہیں''۔

بطور تنقید نگار، نگار عظیم نے سعادت حسن منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا جو جائزہ لیا ہے وہ بھی نگار عظیم کی اپنی کیفیات اور خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی تجزیاتی صلاحیت اس تنقیدی مضمون میں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے، اور اس افسانے کا تجزیہ کسی حد تک تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے خلاف جاتا ہے، جسے پڑھنے کی اور جس کا اعتراف کرنے کی ہمت شاید ہی کسی پاکستانی میں ہو، مگر جو ہوا وہ تو سبھی جانتے ہیں۔ اور جو ہوا وہ خود سعادت حسن منٹو نے بھی تو اپنے انداز میں بیان کیا ہے اور جو اُس نے بیان کیا ہے وہ نگار عظیم کے تجزیے سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں، اس لیے پاکستانی ناقدین اور قارئین کو نگار عظیم کو دوش دینے کی بجائے سعادت حسن منٹو کے اس افسانے میں بیان کردہ المیوں پر غور کرنا چاہیے۔ ایک نقاد نے اس پر کیا خوب لکھا ہے کہ ''سیاسی منہ زوریوں اور طاقت کے سبب تاریخ سے بھلے ہی کھلواڑ کیا جائے لیکن ادب ہمیشہ زندہ اور محفوظ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اس بات کا ذکر کر رہے ہیں کہ ماضی کا ورثہ حال اور آنے والے وقت پر کتنا اثر انداز ہوا اور ہوسکتا ہے''۔ خود نگار عظیم اس مضمون میں سعادت حسن منٹو کے بارے میں کہتی ہیں: '' منٹو نے اِس زہر کو کچھ اس طرح پیا کہ اس کا کچھ حصہ تو قلم کے ذریعہ کاغذ پر نقش ہوا لیکن بیشتر ان کے وجود میں اتر گیا''۔ انہوں نے اس مضمون کو منٹو کے افسانے کے بعض اقتباسات دے کر مضمون کو خوبی سے بڑھاوا دیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

'بٹوارے کے دو تین برس بعد جب ہندوستان اور پاکستان دونوں حکومتوں کو اس بات کا خیال آیا کہ:

''اخلاقی قیدیوں'' کی طرح پاگلوں کا بھی تبادلہ ہونا چاہیے، یعنی مسلمان پاگل پاکستان اور ہندو اور سکھ پاگل ہندوستان کے حوالے کر دینا چاہیے۔ یہ خبر پاگل خانے پہنچی تو پاگلوں میں بڑی چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ انھیں پاگلوں میں ایک پاگل بشن سنگھ تھا جو پندرہ برس سے اسی پاگل خانے میں تھا نہ سوتا تھا، نہ لیٹتا تھا بس کبھی کبھی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا چونکہ زیادہ تر کھڑا رہتا تھا تو اس کے پاؤں بھی سوجے رہتے تھے کسی سے بولتا بھی نہیں تھا۔ بس ہمیشہ ایک بے ترتیب سا جملہ کچھ ادل بدل کے ساتھ دہراتا رہتا تھا۔ ''اوپر دی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین۔''

نگار عظیم نے منٹو کے اس افسانے کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے تقسیم ہند کے پس منظر اور اس عمل کے نتیجے میں جو ہوا ان سب کا احاطہ کسی قدر غیر جانبداری سے کیا ہے، اور تسلیم کیا ہے کہ بعد میں جو حالات رونما ہوئے اس میں سب سے زیادہ نقصان فسادات اور نقل مکانی سے ہوا۔ اس نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ ہزاروں افراد اس کی زد میں آئے، جانیں گئیں، گھر سے بے گھر ہوئے، عصمتیں لٹیں، بچوں بوڑھوں کا سفاکانہ قتل ہوا۔ زمین سے رشتہ ٹوٹا، سیاست کے مہرے چلے اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ انسان کا انسان سے بچھڑنا، رشتوں کا ٹوٹنا، ذہنوں کو مفلوج کر گیا اور تقسیم ہند کا سانحہ کبھی نہ مٹنے والا داغ بن گیا اور اس کا زخم دکھ درد ہر دور میں تازہ رہا۔ نگار عظیم اس المیے کو سمیٹتے ہوئے کہتی ہیں: '' لکھنے والا یعنی قلمکار نہ ہندوستانی ہوتا ہے نہ پاکستانی، نہ ہندو نہ مسلمان، اُسے تو بس فرد اور سماج کا درد بے چین کرتا ہے اور اس کا واحد علاج اور ہتھیار بس اس کا قلم ہوتا ہے سچا اور کھرا''۔ اور پھر اس المیے کا عہدِ موجود کے تناظر میں بیان کرتے ہوئے یہ اہم سوال اٹھاتی ہیں ''اگر اس کہانی کو ہم آج کے پس منظر میں دیکھیں تو کیسا لگے گا؟ سوال منہ اٹھائے کھڑے ہیں۔ جمہوریت کے معنی فوت ہو رہے ہیں۔ جمہوریت کا مقصد بدل رہا ہے۔ اپنا تشخص اپنی پہچان کا مسئلہ آج بھی سامنے ہے۔ پاکستان میں بھی یہاں بھی۔ ۔۔آج صرف فرد ہندو اور مسلمان نہیں ہے کھانا پینا لباس، زبان، مرغا، بکرا، بھینس— حد یہ ہے کہ پھول بھی ہندو اور مسلمان ہو گئے ہیں۔ ہم عصر قلمکار اس سے بے بہرہ نہیں، بہری اور گونگی تو سیاست ہے۔ سیاسی پاگلوں کا پاگل پن، عروج پر ہے۔ سوالات کا دائرہ جتنا بڑا ہوا رہا ہے خوف بھی اتنا ہی بڑھ رہا ہے کہ اس پاگل پن کے نتائج کیا ہوں گے؟''

نگار عظیم کی افسانہ نگاری اور تنقید نگاری پر بات اختصار کی کوشش کے باوجود کسی قدر طویل ہوگئی کہ کہیں کہیں خود اُن کی تحریر سے اقتباس دیئے بغیر بات نہیں بنتی تھی۔

اب ان کی تیسری تخلیقی جہت یعنی ان کی شاعری کی طرف آتا ہوں۔ شاعری ہو یا نثر، تخلیق کار ان میں اپنے نظریات، تجربات اور مشاہدات کا اظہار کرتا ہے۔ عموماً شاعری کو داخلی کیفیات کا ترجمان کہا جاتا ہے، مگر نگار عظیم کی شاعری میں داخلی و خارجی دونوں کیفیات جگمگا رہی ہیں اور شاعری میں بھی اپنے دل کی کیفیات یا غمِ جاناں کے علاوہ انہوں نے وہ موضوعات بھی عمدگی سے بیان کیے ہیں جو ان کی نثر میں پائے جاتے ہیں۔ وہ مجموعی طور پر غزل یا نظم میں تمام روایتی اور غیر روایتی موضوعات کو تخلیقی ہنرکاری سے بیان کرتی ہیں۔ عشق و محبت کے افسانے، ہجر و فراق کی اذیتیں، سبھی کچھ ان کے قلم سے بیان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اُن کی نظم ''جشنِ آزادی'' لیجیے جس میں انہوں نے اس ماحول اور اس ذہنیت کی پوری ترجمانی کر دی ہے جس میں ہندوستان میں رہنے والے مسلمان چاہے کتنے ہی اپنے وطن سے وفادار ہوں انہیں غدار سمجھا جاتا ہے:

جھگیوں پر ٹاٹ کے پردے پڑے تھے
فٹ پاتھ پر قطار پہ قطار ڈھانچے پڑے تھے
کالے پیلے آسیب زدہ چہرے کھڑے تھے
پھٹے پرانے جسم پر لتّے پڑے تھے
دھول سے ان کے چہرے اٹے پڑے تھے
ہاتھ خالی

پیٹ خالی
روٹیوں کے لالے پڑے تھے
میرے ملک کے یہ بچے متوالے بڑے تھے
بھارت ماں کی جے کے نعرے لگے تھے
کہ یہ بچے
جشنِ آزادی منا رہے تھے

نظموں کی طرح وہ غزلوں میں بھی اس صورتِ حال کو یوں بیان کرتی ہیں:

اپنے اشکوں سے بنا دیتے بیاباں کو چمن
کیا کریں ہم کو تو رونے کی اجازت ہی نہیں
معتبر بھی وہی اربابِ نظر میں ٹھہری
جس کہانی میں کوئی حرفِ صداقت ہی نہیں
گئی رتوں کا ابھی تک نشان باقی ہے
گلی میں ایک شکستہ مکان باقی ہے
اک آشیانے پہ بجلی گری تو رونا کیا
ہمارے واسطے سارا جہان باقی ہے

غزلوں میں انہوں نے دل کی واردات کو بھی جمالیاتی انداز میں بیان کیا ہے:

پہلی سی چاہتوں کے وہ منظر نہیں رہے
عاشق تو بے شمار ہیں دلبر نہیں رہے
دل کے نگر میں قید ہیں چاہت کی بلبلیں
وہ موسمِ بہار کے منظر نہیں رہے
میں نے نگارؔ سانسیں بھی کر دیں تھی جن کے نام
وہ ایک پل کو بھی مرے ہو کر نہیں رہے
جب بھی ملتے ہیں چمک اٹھتی ہیں آنکھیں ان کی
اور دعویٰ ہے انھیں ہم سے محبت ہی نہیں
گلشنِ دل پہ خزاؤں کا تسلط ہے نگارؔ
کوئی خواہش کوئی ارماں کوئی چاہت ہی نہیں
کسی کے پیار کا شعلہ بجھا دیا تھا نگارؔ
وہ شعلہ پھر سے جلانا عجیب لگتا ہے

ان کی غزلوں میں جہاں سہلِ ممتنع کی خوبی پائی جاتی ہے وہیں کچھ غزلوں میں غزلِ مسلسل کی کیفیات بھی ملتی ہیں جس سے ایک ہی موضوع پر ایک غزل کے سبھی اشعار موتیوں کی طرح پروئے ہوئے لگتے ہیں مگر اس نزاکت کے ساتھ کہ یہ غزلِ مسلسل نظم کے علاقے میں داخل نہ ہو۔ ان کی شاعری میں تکرار کا حسن بھی نکھار پیدا کرتا ہے۔ ان کیفیات کے عکاس چند شعر ملاحظہ ہوں:

میری اَنا نے راہ میں دیوار کھینچ دی
اس بار بھی سفر مرا آساں نہیں ہوا
اس بار بھی بہار نئے زخم دے گئی
اس بار بھی وہ درد کا درماں نہیں ہوا
میں نے بھی اپنی پلکیں بھگوئیں نہیں نگار
وہ بھی بچھڑتے وقت پریشاں نہیں ہوا

نگار عظیم مختصر بحر میں بھی عمدہ غزل کہتی ہیں اور ان کی ایسی غزلیں کفایتِ لفظی کے باوجود ابلاغی صلاحیت سے مالا مال ہیں:

صرف خاکہ ابھر رہا ہے ابھی
کوئی چہرہ کہاں بنا ہے ابھی
کن رتوں کا حساب دوں اس کو
سبز موسم کہاں ملا ہے ابھی
کیا ملیں تجھ سے تو نے خود کو نگارؔ
معتبر ہی کہاں کیا ہے ابھی
معجزہ یہ بھی دکھایا میں نے
اپنے قاتل کو رلایا میں نے
خود ہی زخموں سے سجایا دل کو
اور پھر جشن منایا میں نے
زیست بے نور ہوئی جاتی تھی
پھر لہو دل کا جلایا میں نے
چاند اور پھول ہی کیا ہر شے میں
بس ترا عکس ہی پایا میں نے
تیری یادوں کو سجا کر دل میں
اک صنم خانہ بنایا میں نے

ان کی اس غزل کے دعائیہ اشعار پر اس مضمون کا اختتام کرتا ہوں:

دل کے موسم کو کسی طور سہانا کر دے
زندگی کرنے کا کوئی تو بہانا کر دے
ہم کو یہ شہر ہوس کاٹ رہا ہے کب سے
ہم فقیروں کا کہیں اور ٹھکانا کر دے
جو فسانوں کو حقیقت میں بدل دیتا ہے
یہ بھی ممکن ہے حقیقت کو فسانہ کر دے
فکر کو میری وہ تاثیر عطا کر یارب
میرے شعروں کو جو مقبول زمانہ کر دے
زندگی اپنی تو گزری ہے حوادث میں نگار
میرے بچوں کے مقدر کو سہانا کر دے

# ''گئی رُتوں کا فسانہ''

معین شاداب
(دہلی)

نگار عظیم ایک آرٹسٹ ہیں، سو کسی آرٹسٹ کا فکری کینوس یک رنگ کیسے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ان کی شخصیت کی طرح ان کے قلم میں کئی رنگ کی روشنائی ہے۔ ان کی نمایاں شناخت افسانہ نگار کی ہے۔ افسانہ نویس بھی ایسی کہ لفظوں کے ہجوم میں ان کے قلم سے پھوٹنے والی عبارت فاصلے سے پہچانی جاسکتی ہے۔ سفرنامہ بھی انھوں نے لکھا، ناقدانہ بصیرت سے بھی وہ آسودہ ہیں۔ شاعر باپ کی بیٹی نگار عظیم ذوق شعری سے لبریز ہیں۔ نصف صدی کو محیط عملی زندگی میں انھوں نے فوٹو اسٹوڈیو بھی چلایا اور مختلف مکاتب میں علم کے اجالے بھی منتقل کئے۔ اپنے طلبا کو صرف نصابی کتابیں نہیں پڑھائیں بلکہ انھیں درسِ حیات و کائنات بھی دیا۔ امور خانہ داری میں ماہر نگار عظیم نے اسکول میں انتظامی امور بھی اس شان سے سنبھالے کہ گھر اور اسکول کے باہر بھی کئی تنظیموں کی منتظم بن گئیں۔ خواتین کے ذریعے، خواتین کے لئے، خواتین کی بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم 'بنات' کو بھی سنبھال رکھا ہے۔ خواتین کے گروہ کو کسی خاتون کے ذریعے سنبھال لینا یقیناً کسی عجوبے سے کم نہیں ہے۔ وہ اپنے بعض احباب کے ساتھ 'بزم قلم' بھی چلاتی رہی ہیں۔ 'مشیرانہ' صلاحیتوں سے مالامال ہیں۔ دلبرداشتہ لوگ ہوں یا دل ہارے ہوئے، معاشرے کے ستائے ہوئے لوگ ہوں یا زندگی گزیدہ۔۔۔ ان کے اندر سب کا دکھڑا سننے کا کلیجہ ہے۔ زخموں پہ مرہم پٹّی رکھنا انھیں خوب آتا ہے۔۔۔ قلب کی نازک کیفیت سے دوچار اداس طبیعت اور افسردہ ذہن لوگوں کی باتوں باتوں میں، شعوری یا لاشعوری طور پر وہ کونسلنگ کردیتی ہیں۔ کمال یہ ہے کہ دوسروں کی تکلیف سنتے سنتے، غیروں کے آنسو پونچھتے پونچھتے وہ اپنا سارا دکھ درد بھول جاتی ہیں۔ اپنی مصروفیات اور صحت کے ساتھ ناانصافی، بلکہ کھلواڑ کر کے انسانیت، خلوص، پیار دوستی اور محبت کے نام پر خود کو دوسروں کے لئے وقف کردینا جیسے ان کی طبیعت کی مجبوری ہے۔ گھر کے دروازے، کیا اپنے، کیا پرائے، سب کے لئے 'ٹوئینٹی فوران ٹوسیون' کھلے ہیں۔

زمانے بھر میں فکشن رائٹر کے طور پر اپنی شناخت درج کرانے والی نگار عظیم کے بارے میں بہت سے لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ وہ شاعرہ بھی ہیں، لیکن یہ شاید کم ہی لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ شاعرہ پہلے ہیں، افسانہ نگار بعد میں۔ ان کا اولین تخلیقی اظہار شعر کی شکل میں ہی ہوا تھا۔ عشق آباد کے مشہور و معروف استاد شاعر 'سحبان الہند' ثروت میرٹھی کے آنگن میں انھوں نے آنکھیں کھولی۔ چاروں طرف شعروادب کا ماحول تھا۔ شعروشاعری کی صدائیں سماعتوں سے ہم آہنگ ہوچکی تھیں۔ ہوش سنبھالتے ہی شعری ذوق پروان چڑھنے لگا... پھر وہ وقت بھی آیا کہ شعر کہنے لگیں۔ لیکن جس سماج میں وہ پیدا ہوئیں وہاں خواتین کو شعر کہنے کی اجازت نہ تھی۔ گھر کی عزّت، خاندان کا ناموس اور سماج کا لحاظ اور لوک لاج شعر گوئی کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ وہ حالات خواتین کی شاعری کے لئے مناسب یا موافق نہیں تھے۔ فن کار اپنے فن کا اظہار چاہتا ہے۔ شاعر کو جتنا سکون شعر کہہ کر ملتا ہے، اس سے کہیں زیادہ اطمینان شعر سنا کر حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جس ماحول میں لڑکیوں کو شعر کہنے تک کی اجازت نہ ہو وہاں (کسی نشست یا مشاعرے میں) شعر سنانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا... قصہ مختصر نگار عظیم کو اپنی فطری صلاحیت اور ذوق کا گلا گھوٹنا پڑا۔۔۔ اور پھر جب موقع ملا تو ان کی خداداد تخلیقی اہلیت افسانہ نگاری کی صورت میں برآمد ہوئی۔ باکمال سخن ور کی بیٹی نگار عظیم کو ورثے میں دل و دماغ اور جذبہ و احساس کی وہ تمام صلاحیتیں اور خوبیاں میسر آئیں جو کسی باپ سے اس کی اولاد کو حاصل ہوسکتی ہیں۔

نگار عظیم عقد کے بعد جب دہلی وارد ہوئیں تو انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع میسّر ہوا اور مچلتی ہوئی نگارشات مختلف رسائل میں چھپنے لگیں۔ کہانیوں کے علاوہ انھوں نے اپنی شاعری بھی شائع کرائی۔ ایک دن دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری اور اکادمی کے ترجمان رسالے 'ایوان اردو' کے مدیر مخمور سعیدی نے ان سے پوچھا ''آپ شاعری کرتی ہیں تو مشاعرے کیوں نہیں پڑھتیں؟'' نگار عظیم نے جواب دیا ''اجازت نہیں ہے۔ ابّا نے ممانعت کی تھی۔'' اس پر مخمور سعیدی نے کہا'' اب تو آپ کے ابّا نہیں ہیں، اب تو اپنے خاوند عظیم صدیقی صاحب سے اجازت لیجئے۔'' اور پھر وہ عظیم صدیقی صاحب سے مخاطب ہوئے ''کیوں عظیم صاحب!'' عظیم صاحب کا جواب، جو خود بھی اچھے آرٹسٹ اور قلمکار تھے، مثبت اور حوصلہ افزا تھا ''میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔'' کچھ دنوں بعد مخمور سعیدی نے انھیں اکادمی کے تحت ہونے والے 'اساتذہ کے مشاعرے' کا دعوت نامہ بھجوادیا۔ اس طرح یہ کفر ٹوٹا اور نگار عظیم نے کلام کی اشاعت کے ساتھ مشاعرے بھی پڑھنے شروع کردیے۔ لیکن پروقار، معیاری اور ادبی نوعیت کے مشاعروں میں ہی وہ جانا پسند کرتی تھیں۔ دلّی کے علاوہ بیرون شہر کے مشاعروں میں بھی ان کی شرکت ہونے لگی۔ گذرتے وقت کے ساتھ اب یہ سلسلہ کم تو ہوگیا ہے لیکن تھما نہیں ہے۔ اب وہ 'بنات' کے پروگراموں میں، اساتذہ کے مشاعروں میں یا پھر وہ کسی بہت خاص مشاعرے یا نشست میں اپنا کلام سناتی ہیں۔

نگار عظیم اپنے والد سے جذباتی طور پر بے انتہا قریب تھیں۔ ثروت میرٹھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ثروت صاحب کے بہت سے اوصاف و شمائل نگار عظیم کے وجود کا حصہ ہیں۔ شاعری بھی انھیں وراثت میں ملی۔ شعر کہنے پر پابندی کے بعد انہوں نے افسانے میں ہاتھ آزمایا اور اس میدان میں وہ ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ چنانچہ انھوں نے شاعری پر بہت کم بلکہ برائے نام ہی توجہ دی۔ نگار عظیم کے افسانے دراصل ان کے شعری اظہار کی متبادل صورت ہیں۔ ان کے

افسانوں کا اختصار اور ایجاز بھی ان کی شعری ذہانت کا ہی مرہون منّت ہے۔
نگار عظیم کے افسانے دراصل شاعری کی ہی ایک شکل ہے۔ان کی کہانیوں کا مزاج وہی ہے جو ان کی شاعری کا ہے۔یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی شاعری میں وہی زندگی، وہی عزم، وہی حوصلہ اور احتجاج کی وہی لے ملتی ہے جو ان کے افسانوں کا بنیادی وصف ہے۔ان کا نسائی لہجہ گھر آنگن کے مسائل، خواتین کے معاملات کے علاوہ معاشرے میں مختلف سطحوں پر ہونے والی شکست وریخت اور ناخوشگوار واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔گھروں میں بیٹی بیٹوں میں تفریق کے خلاف انھوں نے ہمیشہ آواز بلند کی ہے۔جس کی بازگشت ان کی شاعری، خاص طور سے ان کی نظموں میں بھی سنائی دیتی ہے۔نگار عظیم کے افسانوں کی سوچ ہی ان کی شاعری کا فکری رویہ اور نظموں کا مرکزی خیال ہے۔اپنی نظموں میں ذاتی مسائل کے ساتھ انھوں نے فلسفۂ حیات کی گتھیاں سلجھانے میں سر کھپایا ہے۔معاشرے کے حاشیے پر پڑے نفوس کے خالی شکموں کی آنچ نے ان کو جلا دیا ہے۔نگار عظیم مہذب سماج کی اجتماعی امنگوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ایک خاص بات یہ ہے کہ نگار عظیم کا لہجہ نسائی ضرور ہے لیکن وہ 'فیمینسٹ' نہیں ہیں۔وہ ہر نحیف آواز کو سہارا دیتی ہیں خواہ وہ کسی کی بھی ہو۔وہ مرد وخواتین، اطفال وبزرگاں، ادنی واعلیٰ ،سب کے دکھ میں شریک ہیں، سب کی وکیل ہیں۔اور ہر فرد کے حق خودارادیت اور خود مختاری کی بات کرتی ہیں۔بنیادی طور پر ان کی فکر ترقی پسند نظریت ور جحانات سے متاثر ہے۔یہ رویے خال خال ان کی غزلیہ شاعری میں بھی ہیں۔

نگار عظیم کی غزلیں ان سبھی موضوعات سے ہم آہنگ ہے جن سے غزل مانوس ہے یا جنھیں دامن غزل بے جھجک قبول کر لیتا ہے۔ان کے اشعار کے بین السطور مشکبار ہوائیں، چٹکتی کلیاں، محبتوں کے نکھرے نکھرے پھول، پربتوں کی نغمہ سرا فضائیں، راگنی گاتی ندی، شبنمی کھیتیاں، روشن صبح، سناٹوں بھری دوپہر، ملگجی شام۔۔۔کے مناظر باصرہ نواز ہوتے ہیں۔ان کے افکار کا یہ مزاج ان کی شاعری میں تغزل آمیز فضا بناتا ہے۔

نگار عظیم کے سخن کی بولتی ہوئی آنکھوں کے روزن سے کبھی کبھی کوئی دلبر جھانکتا دکھائی پڑ جاتا ہے۔۔۔غزل کی ان گہری آنکھوں میں کوئی لمحۂ انتظار آن بسا ہے جو انھیں کبھی خشک کر دیتا ہے اور کبھی بھگو جاتا ہے۔انتظار کی یہ کیفیت جب شدت اختیار کر لیتی ہے تو 'دل سینے سے نکل کر آنکھوں میں دھڑکنے لگتا ہے:

رات آدھی گذر چکی ہے مگر
اک دریچہ کھلا ہوا ہے ابھی
شمعیں سب بجھ گئیں خموش ہے رات
اور دل ہے کہ جاگتا ہے ابھی

شبِ انتظار کے پیچھے ایک لطیف سی خلش کے ساتھ یادوں کے جشن کا سماں بھی ہے:

شامیں اداس راتیں بھی بے نور ہیں بہت
وہ مدتوں سے بزم نگاراں نہیں ہوا
اس کی یاد آئی ہے مت چھیڑ مجھے باد صبا
تجھ سے پھر بات کروں گا ابھی فرصت ہی نہیں

نگار عظیم کے اشعار میں عشق کی وہ منزل بھی ہے جب لمحۂ ترکِ تعلق کے انجذاب کا ہنر آجاتا ہے:

میں نے بھی اپنی پلکیں بھگوئی نہیں نگار
وہ بھی بچھڑتے وقت پریشاں نہیں ہوا

نگار عظیم کی شاعری محض حدیث ذات ہی نہیں بلکہ کیفیتِ کائنات بھی ہے۔بشر کا تہذیبی خسارہ نگار عظیم کو بے چین کرتا ہے تو وہ ماضی کا نوحہ اور گئے موسموں کا مرثیہ سنانے لگتی ہیں۔فرد، خاندان، معاشرہ، وطن اور دنیا بھر کے ٹوٹتے بکھرتے ارمانوں کے خشک پتّوں کی ایک دل آویز سرسراہٹ ان کے اشعار میں گھل جاتی ہے۔جس سے ابھرنے والی درد بھری موسیقی میں اک عجب سا سوز ہے جو پلکیں نم کر جاتا ہے:

گئی رتوں کا ابھی ترجمان باقی ہے
گلی میں ایک شکستہ مکان باقی ہے
گذر گیا جو زمانہ عجیب لگتا ہے
گئی رتوں کا فسانہ عجیب لگتا ہے
پہلی سی چاہتوں کے وہ منظر نہیں رہے
عاشق تو بے شمار ہیں دلبر نہیں رہے
اس عہدِ نو میں اور تو سب کچھ ملا مگر
شرم و حیا کے قیمتی زیور نہیں رہے

صحن گلشن کو وہ سیراب کرنے کی خواہاں ہیں اور آب پاشی کے لئے اشکوں کا نذرانہ پیش کرتی ہیں:

اپنے اشکوں سے بنا دیتے بیاباں کو چمن
کیا کریں ہم کو تو رونے کی اجازت ہی نہیں

نگار عظیم کے اشعار میں اعتبار، اعتماد اور یقین کی لہران کے لہجے کا وقار اور ان کی ذات کا سرمایہ ہے۔اپنے ہی دم پہ زندگی کرنے کا آہنی حوصلہ ان کی شناخت ہے۔یہ ہنر سیکھنے کے لئے انھیں آتش ریاضت اور مشق قناعت سے گذرنا پڑا ہوگا:

آئے گا وہ ضرور مری انجمن میں پھر
دل میرا اس لئے بھی ہراساں نہیں ہوا
زندگی میں نے قناعت کا ہنر سیکھ لیا
اب ترے ناز اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں
ہر ایک زخم مرا پھول بن گیا شاید
کہ اب بہار کا آنا عجیب لگتا ہے

الجھی، سلجھی لکیروں سے بنائے گئے مکمل نامکمل خاکے، کھلی ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھے گئے کچّے، پکّے خواب، ان کی فکر کو درد کی تصویر بنا دیتے ہیں۔ بے شمار ذہنوں میں پنپتا ایک ننھے سے گھروندے کا تصور کتنے لوگوں کی نیند اڑا دیتا ہے:

صرف خاکہ ابھر رہا ہے ابھی
کوئی چہرہ کہاں بنا ہے ابھی
کن رتوں کا حساب دوں تجھ کو
سبز موسم کہاں ملا ہے ابھی
ریزہ ریزہ بکھرتی آنکھوں میں
گھر کا سپنا بسا ہوا ہے ابھی

لفظوں پر پابندی ہو تو خیال بولنے لگتا ہے، لب مقفل کر دیے جائیں تو آنکھیں گفتگو کرنے لگتی ہیں:

جنونِ دل کا ابھی ترجمان باقی ہے
لبوں پہ مہر لگی ہے زبان باقی ہے

نگار عظیم کی شاعری میں حیرانیوں کی فضا ایک سحر انگیز ماحول بنا دیتی ہے:

لائی تھیں جتنی سیپیاں سب بانجھ ہو گئیں
حیران ہوں کسی میں بھی گوہر نہیں رہے

نگار عظیم کے اشعار برنگ نغمہ گونجتے ہیں، برنگ خوشبو پھیلتے ہیں، برنگ دھنک بکھرتے ہیں:

جب بھی ملتے ہیں چمک اٹھتی ہیں آنکھیں ان کی
اور دعویٰ ہے انھیں ہم سے محبت ہی نہیں

اس بار بھی بہار نئے زخم دے گئی
اس بار بھی وہ درد کا درماں نہیں ہوا

کبھی زمانے کی ہر شے سے پیار تھا مجھ کو
ترے بغیر زمانہ عجیب لگتا ہے

چاند اور پھول ہی کیا ہر شے میں
بس ترا عکس ہی پایا میں نے

ڈبو دیا تھا کبھی جس کو تند طوفاں نے
اسی سفینے کا ایک بادبان باقی ہے

ایک آشیانے پر بجلی گری تو رونا کیا
ہمارے واسطے سارا جہان باقی ہے

معتبر بھی وہی اربابِ نظر میں ٹھہری
جس کہانی میں کوئی حرفِ صداقت ہی نہیں

- بقیہ -

## مادری زبان

یہ افسانہ نہ کہ اردو زبان کو بطور مادری زبان زندہ رہنے کے سلسلے میں کیا کیا مسائل درپیش ہیں، سے جو جھتا نظر آتا ہے بلکہ اس افسانے کے ذریعے عالمی سطح پر عورت، بچہ، دلت اور دنیا کے پسماندہ اقوام کی زبان اور اس کے تشخص نیز اس زبان سے وابستہ تہذیبی تشخص پر منڈلاتے ہوئے گلوبلائزیشن کے بادلوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کو آپ کیونکر بچا سکتے ہیں یا یہ کہ آپ کیونکر ان پسماندہ لوگوں کے دلوں سے خوف نکال سکیں گے تا کہ وہ اپنی تہذیب اور اپنی زبان کے بارے میں آزادانہ طور پر سوچ سکیں۔ یہ افسانہ اس مجبوری کو بھی سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے کہ انسان نئی منزلوں کی تلاش میں ضرور نکلے مگر اپنی تہذیب اور زبان کو ہرگز فراموش نہ کرے۔ تاریخ گواہ ہے کہ سامراجی طاقتوں نے سمندروں کو پھلانگ کر نئے ممالک میں دولت اور طاقت کا نیا کھیل تو کھیلا لیکن انہوں نے اپنی تہذیب اور زبان کو اکثر تھوپنے کی کوشش کی یا اپنی زبان کے نشے میں پسماندہ زبانوں کو روند ڈالا۔

نگار عظیم کا یہ افسانہ ایسے بہت سے مسائل کو قاری کے ذہن کا حصہ بنا دیتا ہے جن کا اظہار پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے۔ ایک اچھے افسانے کی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ اُسے پڑھ کر ہر آدمی اپنے اپنے طور پر از سرِ نو لکھنا شروع کر دے اور اس کی مختلف تعبیریں پیش کرے یا افسانہ ایک ایسے لمحۂ فکریہ کا مرکز بن جائے کہ ہر قاری پڑھنے کے بعد اس کی توضیح و تشریح اپنے اپنے ڈھنگ سے کرنے لگ جائے۔ اپنے عنوان اور اپنے موضوع کے اعتبار سے نیز زبان و بیان اور اپنے مخصوص رجسٹر کے اعتبار سے یہ ایک اہم اور قابل قدر افسانہ ہے۔

## ''زندگی کیا ہے؟''

۔ جستجو ۔

شاہدانوار (کراچی)

### رفتار

زندگی اپنی رفتار سے چل رہی تھی
ایک دن
ہواؤں نے زور پکڑا
طوفان آ گیا
باغ کے سارے پیڑوں کو ہلا گیا
ہوائیں شائیں شائیں کرتی رہیں
چھوٹے بڑے پودے چنگھاڑتے رہے
پیڑ جھوم جھوم کو نڈھال ہو گئے
اور آخرکار
تھک کر بے حال ہو گئے
اچانک زور کی چرچراہٹ ہوئی
باغ کا سن رسیدہ درخت
زمیں بوس ہو گیا
اندھیرا چھٹنے لگا
بجلی کڑکنے لگی
پھوہار پڑنے لگی
اور۔۔۔آہستہ آہستہ
زندگی۔۔۔اپنی رفتار پر چلنے لگی

○

### جشنِ آزادی

جھگیوں پر ٹاٹ کے پردے پڑے تھے
فٹ پاتھ پر قطار پہ قطار ڈھانچے پڑے تھے
کالے پیلے آسیب زدہ چہرے کھڑے تھے
پھٹے پرانے جسم پر لتّے پڑے تھے
دھول سے ان کے چہرے اٹے پڑے تھے
ہاتھ خالی
پیٹ خالی
روٹیوں کے لالے پڑے تھے
میرے ملک کے یہ بچے متوالے بڑے تھے
بھارت ماں کی جے کے نعرے لگے تھے
کہ یہ بچے
جشن آزادی منا رہے تھے

○

### خواہش

اندھیری رات
دور تک کہر ہی کہر
ہوائیں مست بدمست
کہ راہ میں۔۔۔
ایک چراغ ٹمٹماتا سا
دھڑکتا سا۔۔۔لہراتا سا
کاش۔۔۔کہ اس کی لَو بڑھ جائے
اور۔۔۔بچا لے وہ۔۔۔
کسی راہ گیر کو بھٹکنے سے

○

## فرق

میں بھی پیدا ہوئی
وہ بھی پیدا ہوا
میں آئی تو خوشیاں بہت تھیں مگر
وہ آیا تو شادیانے بجے
میں فکرماں باپ تھی
وہ فخرماں باپ تھا
میں غمخوار تھی
وہ جلالی بہت تھا
میں فرماں بردار تھی
وہ باغی بہت تھا
میں زمیں تھی
وہ آسماں تھا
میرا بچپن چھینا گیا
اس کو بچہ سمجھا گیا
میں خطاوار تھی۔۔۔اور
بے خطا اس کو سمجھا گیا
مجھ کو پردے میں رکھا گیا
اس کو آزاد چھوڑا گیا
مجھ کو چوکا برتن ملا
اس کو گیند اور بلا ملا
میں بھی پڑھتی تھی
وہ بھی پڑھتا تھا
میں ناقص العقل تھی
وہ دانا بہت تھا
بزم عالم میں اس کا درجہ سوا
تھا
کیونکہ۔۔۔میں عورت تھی
اور۔۔۔وہ مرد تھا

○

## فلسفہ حیات

زندگی کیا ہے؟
پیار ہے۔محبت ہے
حسن ہے۔حقیقت ہے
عشق ہے۔عبادت ہے
علم ہے۔دانائی ہے
قلندری ہے۔سکندری ہے
نعمت ہے۔اور رفعت ہے
آئینہ ہے۔سراب ہے
کل ہی کی تو بات ہے
زندگی زندگی سے مل رہی تھی گلے
آج موت سے ہمکنار ہے
زندگی کیا ہے؟
ایک۔۔۔فلسفۂ حیات ہے

○

- افسانہ -

# ''حادثے یونہی نہیں ہوتے''

نگار عظیم

پھول پور واقعی پھول پور تھا۔ جمنا ندی کے کنارے بسے اس چھوٹے سے قصبے میں میلوں تک رنگ برنگے خوشنما گلابوں کی فصلیں لہلہاتیں، پرندے چہچہاتے، قمریاں گیت گاتیں، تتلیاں رقص کرتیں اور بچے ان تتلیوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے بچپن سے جوانی تک کا سفر یوں ہی طے کر لیتے۔

پھول پور قصبے کی کل آبادی بیس ہزار کے قریب تھی۔ اعلیٰ ذات ہندوؤں جن میں برہمن کائستھ اور اگروال شامل تھے، ان کے علاوہ بہت سے دلت خاندان بھی آباد تھے لیکن اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ حالانکہ اس کا احساس کبھی کسی کو نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ پھول پور کی سب سے بڑی خوبی محبت اور آپسی میل جول تھا۔ یہاں گھر گھر پیار بستا تھا۔ تیج، رام نومی، جنم اشٹمی، عید، محرم، ہولی اور دیوالی سب مل جل کر مناتے تھے۔ کرشن اور رام لیلاؤں کے اسٹیج بھی ہر برس سجتے تھے۔ میلوں ٹھیلوں کا ذوق بھی اس قصبہ کی پرانی روایت میں شامل تھا۔ ایسے موقع پر آس پاس کے گاؤں سے بھی چھوٹے موٹے دکاندار ریڑھی، خوانچہ، کرتب اور جھولے والے آکر اس پھول پور کی رونق کو اور بڑھا دیتے تھے۔

جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد پھول پور کی یہ کھیتی مسلمانوں کے حصہ میں آئی تھی جو شیخ تھے۔ سیدھے سادے ایماندار اور محنتی۔ ان کی محنت اور ایمانداری کی بدولت کاشتکاری کا یہ پیشہ اب ان کی تیسری نسل کو منتقل ہو چکا تھا، جس کے وارث تین بھائی میر عبداللہ، شاہ عبداللہ اور شیخ عبداللہ تھے۔ تینوں بھائیوں کی محنت میں جدید تکنیک شامل ہونے سے پھولوں اور اناج کی ان فصلوں سے ہُن برسنے لگا تھا۔ سیکڑوں لوگ جن میں مسلم، ہندو اور دلت شامل تھے، کی روٹی روزی اس کھیتی سے جڑی ہوئی تھی۔

پھول پور میں رہنے والے برہمن اور کائستھ زیادہ تر کاروباری تھے۔ چھوٹی بڑی صنعتیں اور سونے چاندی کی دکانیں قصبے کے علاوہ شہروں میں بھی تھیں۔ کئی کی اولادیں پڑھ لکھ کر شہر میں بس گئی تھیں۔ کئی خاندانوں کی گوشالائیں تھیں۔ قصبے کے بازار میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی اشیا کی دکانیں زیادہ تر اگروال لوگوں کی تھیں۔ کچھ خاندان کے مرد سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی پھیری کے لیے شہر کا رخ کرتے اور سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اپنے آشیانوں کو واپس لوٹ آتے۔

پھول پور میں محبت، پیار اور بھائی چارے کی بے مثال نشانی یہاں کا مرلی بازار ہے۔ کچھ برس پہلے جب آبادی کم تھی اور دور تک جنگل آباد تھا جنم اشٹمی کے میلے میں کہیں سے بانس کی مرلی بنانے اور بیچنے والے چودہ پندرہ برس کے دو لڑکے آتے تھے جو مرلی بنانے کے ساتھ ساتھ مرلی بجانے کے ہنر میں بھی ماہر تھے۔ پورا قصبہ ان کی مرلی سے لطف اندوز ہوتا۔ بچے تو دیوانے ہو جاتے۔ آہستہ آہستہ وہ ہر میلے میں آنے لگے۔ قصبہ والوں سے ان کی اچھی جان پہچان ہوگئی۔ پھر انھوں نے بانس کی ایک جھونپڑی بنا کر یہیں ڈیرہ ڈال لیا اور بس یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کئی برس بعد پتہ چلا کہ وہ بھائی نہیں بلکہ دوست ہیں۔ ایک کا نام اکبر اور دوسرے کا مرلی۔۔۔ اب قصبے کا یہ جنگل چھوٹی چھوٹی دکانوں سے بڑا بازار بن چکا تھا اور مرلی بازار کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ پچھلی ایک دہائی سے قصبے میں تیزی سے ترقی ہوئی تھی۔ مندر، مسجد اور اسکولوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ سرکاری ڈسپنسری بھی کھل گئی تھی، جس سے قصبے والوں کو بڑی راحت ہوگئی تھی۔ آہستہ آہستہ ترقی کے راستے شہر کی راہوں سے ہموار ہونے لگے تو پھول پور کی قسمت ہی جاگ گئی۔ اب اعلیٰ ذات ہندوؤں کے علاوہ کاشت کاروں اور دلتوں کے بچے بھی اسکولوں میں پڑھنے لگے تھے۔ کئی تو اسکول کے بعد شہر کے کالجوں میں بھی پہنچ گئے تھے۔

خوشیوں اور خوشبوؤں سے لہلہاتے اس بھرے پُرے پھول پور میں کب کیوں اور کیسے شہر کی گرم ہوا داخل ہوگئی، کسی کو پتہ ہی نہیں چلا۔ بار بار جب مندر کے اونچے چبوترے سے تقریروں کی آوازیں کانوں میں پڑیں تو گرم ہواؤں کی شدت کا احساس ہوا۔

'ہم نے یہ سبھا اس لیے بلائی ہے کہ آپ کو پرستھی سے اوگت کرا سکیں۔ ہم آپ کو بتا سکیں کہ آپ بھی اس دیس کا ابھن انگ ہیں۔ آپ نے سدیو سماج کی سیوا کی ہے۔ اس دیس کے لیے ہی سارے خطروں کا ڈٹ کا مقابلہ کیا ہے۔ لیکن بدلے میں کیا ملا؟ سوتنترتا آپ کا بھی حق ہے۔ آپ اب بھی چاکری کر رہے ہیں، غلاموں کا جیون ویتیت کر رہے ہیں۔ دلت ورگ ہمارا کندھا ہے۔ ہم نے ورشوں کی اس غلامی کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ آج جبکہ دلت اور ہندو دونوں ہی خطرے میں ہیں، ہمیں اور نکٹ آنے کی آوشیکتا ہے تا کہ موجودہ خطروں سے نپٹا جا سکے۔ آزادی کے اتنے ورش بیت جانے کے بعد بھی ہم غلام ہیں۔ ملیچھوں نے ایک ہزار ورش سے ہم سب کو بندی بنا رکھا ہے۔ یہ لہلہاتی کھیتیاں اور پھولوں کی فصلیں جہاں آپ مزدوری کرتے ہیں، آپ کی ہوتیں، آپ کی۔ اب سے آگیا ہے اپنا حق چھین کر حاصل کریں یا پھر انھیں اکھاڑ پھینکیں۔ ہمیں شدھ واتاورن چاہیے۔ ہندو دھرم کا رکھشک ہونے کے ناطے ہماری ذمّہ داری بنتی ہے کہ آپ سب کی رکھشا کریں۔ آپ کا ادھیکار آپ کو دیں۔ ہم ایک دوسرے کی طاقت ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کو ہر طرح کی مدد ملے گی۔ سرکار کا وعدہ ہے، ہندوستان ہمارا ہے۔'

موہن پٹیل اپنی تقریر ختم کر کے چبوترے سے نیچے اُتر آئے۔

مسکرا مسکرا کر لوگوں کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے گاڑی تک پہنچے تو موہن پٹیل زندہ باد، موہن پٹیل زندہ باد کے نعرے گاڑی اوجھل ہونے تک سنائی دیتے رہے۔ پھول پور کو شہر سے ملانے والی سڑک پر لال کوٹھی میں دس بارہ برس سے موہن پٹیل رہتے تھے۔ کئی برس تک تو کسی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ کوٹھی کب بن گئی اور اس میں کون موہن پٹیل کہاں سے آ کر بس گئے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ بات سامنے آئی کہ قصبے کی ترقی کے سارے کام سرکار سے انھوں نے ہی کرائے ہیں۔ تب قصبے کے سارے لوگ ان کی عزت بھی کرنے لگے اور اپنی پریشانیاں بھی جا کر بتانے لگے۔ پچھڑے دلت طبقے پر ان کی خاص نگاہ تھی۔ پارٹی کے لوگوں میں دلت طبقے کے انت رام بھی شامل تھے تاکہ وہ اپنے لوگوں کی پریشانیاں پٹیل جی کو جا کر بتائیں اور پٹیل جی ان کی مدد کر سکیں۔

لیکن جب مندر کے اونچے چبوترے سے مسلمانوں کو ملیچھ کہہ کر ان کی کھیتیوں پر قبضہ کرنے یا پھر اُکھاڑ پھینکنے کی باتیں سنیں تو مسلمانوں کے ہوش اُڑ گئے۔ انھیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ محبت سے لبریز دل، پیار کی میٹھی زبان اور محنت کش ہاتھوں والی جس نسل نے پھول پور کو اپنے خون پسینے سے سینچا تھا کیسے یقین کریں کہ ان کے خلاف سازشیں کی جا رہی ہیں۔ برسہا برس سے اپنے اجداد کی کھیتی سنبھالتے میر عبداللہ کو لگا مانو ان کے ہاتھ پیر کاٹ کر الگ کر دیے ہیں۔ قصبے کے کچھ معتبر افراد کو جمع کر کے دونوں بھائیوں کے سامنے میر عبداللہ نے اس زہریلی آندھی کے نتائج پر غور کیا تو مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ پھول پور ہمیشہ سے ان کے لیے ایک بڑے خاندان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس خاندان میں رہتے بستے سارے لوگ ان کے دکھ درد اور خوشیاں سب کچھ ان کا اپنا تھا۔ ان کے خلاف کیسے سوچا جا سکتا تھا۔ انھوں نے کوشش کی کہ آپس میں بات چیت کر کے پیدا کردہ غلط فہمیوں کو دور کر لیا جائے۔ دو تین مرتبہ کچھ معتبر لوگوں کو لے کر وہ قصبے کے معزز گھرانوں میں گئے تو ایسی تکلیف دہ اجنبیت کا احساس ہوا۔ تب وہ پہلی مرتبہ بڑی بے دلی سے موہن پٹیل کی لال کوٹھی پر پہنچے۔ وہ سمجھ چکے تھے۔ پھول پور قصبے کی طاقت اب کئی حصوں میں بٹ گئی ہے اور وہ کمزور ہو چکے ہیں۔

موہن پٹیل: 'آؤ میر عبداللہ ہمارے بھاگ، آپ اس نردھن کی کٹی میں پدھارے۔ کیسے یاد آ گئی ہماری؟'

میر عبداللہ: 'ہاں بھائی آنا ہی پڑا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے پھول پور کی خوشبو کچھ لوگوں کو راس نہیں آ رہی اور وہ آب و ہوا کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی شکوہ شکایت ہے تو آپس میں بیٹھ کر بات کرنے سے مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور پیار محبت کا ماحول بھی بنا رہے گا جو اس قصبہ کی خوبی ہے۔ محبت ہمارا ایمان ہے اور ہم اس کے شیدائی ہیں۔'

موہن پٹیل: 'نہیں مائی باپ آپ تو اس قصبہ کے مالک ہیں۔ میری کہاں مجال جو کسی معاملہ میں ٹانگ اُڑاؤں اور کوئی سیوا میرے لائق ہو تو سر کے بل حاضر ہو جاؤں گا۔

میر عبداللہ نے بات اور بات کی دھار کا اندازہ بخوبی لگا لیا تھا۔ جب وہ لال کوٹھی سے باہر نکلے تو فروری کی سرد شام میں بھی اندر تک پسینہ سے شرابور تھے۔ پہلی مرتبہ انھیں احساس ہوا کہ ان کے چاروں طرف رنگ برنگے خوشبودار گلاب کی فصلوں میں صرف کانٹے ہی کانٹے رہ گئے ہیں۔ بہت تیزی سے برسوں سے شناسا چہرے ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے چلے گئے۔ فاصلے بڑھے تو رشتے ناطے اور ان کے بندھن ریشم کی ڈور کی طرح پھسلتے چلے گئے۔ ہولی، دیوالی اور تمام تہواروں کے رنگ بدل گئے۔

پھر ایک دن شور مچا کہ بڑے مندر کی سیڑھیوں پر کسی نے گوشت پھینک دیا ہے بس پھر کیا تھا۔ اس گوشت پھینکنے والے کو گھر گھر تلاش کیا گیا۔ کچھ نہ ملنے پر ہر ملیچھ کے گھر ہولی جلائی گئی۔ چیخ پکار، آہیں، سسکیاں کچھ شور میں گم ہوئیں تو کچھ جل کر راکھ ہو گئیں۔ مخالف سمت سے چلنے والی یہ آندھی اتنی تیز تھی کہ مقابل کے پاس اسے روکنے کا کوئی سامان تھا نہ کوئی ذریعہ۔

پھول پور کی زمین اور ہوا شدھ ہو گئی۔ اونچ نیچ اور ذات پات کے تمام فرق مٹ گئے۔ جیت کے دیے روشن کر کے جشن منائے گئے لیکن بستی کو یہ ہوا راس نہیں آئی۔ گدھوں نے ڈیرہ ڈال لیا۔ جہاں دور دور تک کھیتیاں لہلہاتی تھیں ناگ پھنی نے پھن پھیلا لیے تھے۔ مرلی اور اکبر کی بانسری بھی خاموش ہو گئی تھی اور پھر ہوا ہوں کہ۔۔۔ جن کو اشدھ سمجھا جاتا تھا وہ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگے۔ ملیچھوں کا لوٹا ہوا سامان اور زر زمین پا کر ان کے جینے کا ڈھنگ بدلنے لگا۔ آہستہ آہستہ سیاسی میدان میں بھی ان کے قدم جمنے لگے۔ اب طاقت ان کے ہاتھ میں تھی اور اس طاقت کا نشہ ان کے سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔

اعلیٰ ذات ہندوؤں نے اس کی بو سونگھ لی تھی۔ دلت طبقہ ان کے لیے اب ایک لمحۂ فکریہ بن گیا تھا۔ بدلتی ہواؤں کا رُخ پٹیل جی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ ان کا ماتھا ٹھنک گیا۔ خفیہ میٹنگیں ہونے لگیں۔ موہن پٹیل نے دلت پارٹی کے نیتا انت رام کو بلا کر بدلتے حالات پر تبادلۂ خیال کیا۔ پرانے تعلقات کی دہائی دی۔ انت رام نے بھی جی حضوری میں کوئی کمی نہیں کی۔ وہ جو کچھ تھا انھیں کی بدولت تھا۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ حالات پر قابو رکھے گا۔ لیکن موہن پٹیل کے باقی ساتھی انت رام کی میٹھی میٹھی باتوں سے مطمئن نہیں تھے۔

ایک دن اعلیٰ ذات ہندوؤں کے کچھ لوگ پٹیل جی کے پاس پہنچے اور انھیں باہر کے حالات سے آگاہی دی اور مدد بھی چاہی۔

'پٹیل جی، اب تو ان کی ہمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرتے ہیں۔ کندھا اونچا کر کے چلتے ہیں۔ چاروں طرف غنڈہ راج چل رہا ہے۔ بہو بیٹیوں کا باہر آنا جانا مشکل ہو گیا ہے۔ ہر روز کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ ان کی کنیائیں اونچے کل کے لڑکوں کو اپنے چنگل میں پھنسا لیتی ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں پچھلے تین ورش میں پانچ کیس اسی طرح کے ہو چکے ہیں۔ اپنا کُل بچانا

مشکل ہورہا ہے۔سرکاری رعایت کی وجہ سے پہلے ہی ہرمیدان میں ان کا بول بالا ہے۔آپ کی ڈِھلائی سے ان کے قدم اور جم گئے ہیں۔ذرا سوچئے! پٹیل جی، ہمارے بچوں کا بھوشیہ کیا ہوگا! کچھ کریئے پٹیل جی کچھ کریئے۔انھیں پاٹھ پڑھانا ضروری ہوگیا ہے۔یہ ہم پر حاوی ہوتے گئے تو کایا پلٹ سکتی ہے۔آنے والا کل بہت بھیانک اور خطرناک ہوگا۔یہ افسر ہوں گے اور ہماری سنتانیں ان کی چاکری کریں گی۔اس سے تو پہلے ہی ٹھیک تھے۔'

اتنی ساری باتیں سن کر پٹیل جی کے ماتھے پر فکر کی لکیریں کچھ اور گہری ہوگئیں لیکن انھوں نے لوگوں کو یقین دلایا:

'وہ ہرطرح ان کی حفاظت کریں گے، حالات سے مقابلہ کے لیے کوئی نہ کوئی اپائے اوشیہ کریں گے' آپ چنتا نہ کریں سنتشٹ رہیں، ورنہ حالات اور بگڑ سکتے ہیں۔آپ کی بہو بیٹیاں میری بہو بیٹیاں ہیں۔بس آپ سب اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔'

دوسرے ہی دن پٹیل جی نے پارٹی کے لوگوں کی خفیہ میٹنگ بلائی۔ حالات پر قابو رکھنے کے لیے کڑے منصوبے بنائے اور سب کو اپنا اپنا کام کرنے کی ہدایت دی۔اس سے پہلے کہ پٹیل جی کے منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچتے، انت رام کا حکم صادر ہو چکا تھا۔

پورے قصبے میں جنگل کی آگ کی طرح یہ بات پھیل گئی کہ موہن پٹیل کی اکلوتی بیٹی کا اپہرن ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قصبہ پولیس چھاؤنی میں تبدیل ہوگیا۔قصبے سے شہر جاتی شاہراہ پر بیٹی کی نچی کھسٹی لاش ملی تو پٹیل جی یہ صدمہ برداشت نہ کرسکے۔ان کو سیویر ہارٹ اٹیک آیا۔ایک طرف بیٹی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے جارہی تھی تو دوسری طرف ایمبولینس پٹیل جی کو لے کر شہر کی طرف فل رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ٹی وی پر بار بار بریکنگ نیوز چل رہی تھی 'پھول پور کے جانے مانے نیتا موہن پٹیل کی بیٹی کا اپہرن، بلاتکار اور ہتیا۔'

اُف گردش دوراں۔۔۔دودو ارتھیاں۔۔۔ ایک ساتھ۔۔۔لیکن حیرانی اس بات پر تھی کہ اگلی صبح ہر روز کی طرح اِدھر مسجدوں میں اذانیں ہوئیں تو اُدھر مندروں میں گھنٹیاں بجیں۔سورج طلوع ہوا۔دیکھا ہر کوئی مرلی بازار کی طرف بھاگا جارہا ہے اور بھیڑ ہے کہ بڑھتی جارہی ہے۔لوگ وہاں کا منظر دیکھ کر ششدر تھے کہ اکبر اور مرلی اپنے بوڑھے کنٹھ سے بانسری لبوں پر ٹکائے ایسا سریلا جادو بکھیر رہے تھے مانو ساکشات کرشن دھرتی پر اُتر آئے ہوں۔قصبے کی اس بھیڑ میں میر عبداللہ، شاہ عبداللہ اور شیخ عبداللہ بھی آنکھیں بند کیے مرلی کے سرور میں مست تھے۔

## سائیکل

ایک ملٹی نیشنل بینک کے سی ای او نے معاشی ماہرین کو اس وقت سوچ میں ڈال دیا جب اس نے کہا کہ:

سائیکل ملکی معیشت کیلئے تباہی کا باعث ہے۔

اس لئے کہ سائیکل چلانے والا کار نہیں خریدتا، وہ کار خریدنے کے لئے قرض بھی نہیں لیتا۔

انشورنس نہیں کرواتا۔پیٹرول بھی نہیں خریدتا۔اپنی گاڑی سروس اور مرمت کے لئے نہیں بھیجتا۔کار پارکنگ کی فیس ادا نہیں کرتا۔

وہ ٹال پلازوں پر ٹیکس بھی ادا نہیں کرتا۔

سائیکل چلانے کی وجہ سے صحت مند رہتا ہے موٹا نہیں ہوتا!! صحت مند رہنے کے باعث وہ دوائیں نہیں خریدتا۔؟

ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے پاس نہیں جاتا۔حتیٰ کہ ملک کے جی ڈی پی میں کچھ بھی شامل نہیں کرتا۔

اس کے برعکس ہر نیا فاسٹ فوڈ آؤٹ لیٹ اپنے ملازمین کے علاوہ کم از کم 30 طرح کے لوگوں کے لئے روزگار کا سبب بنتا ہے۔

جن میں ڈاکٹر، امراض قلب کے ماہر، ماہرِ معدہ وجگر، ماہر ناک کان گلہ، دندان ساز، کینسر سپیشلسٹ، حکیم اور میڈیکل سٹور مالکان وغیرہ شامل ہیں۔

چنانچہ یہ بات ثابت ہوئی کہ سائیکل معیشت کی دشمن ہے اور مضبوط معیشت کے لئے صحت مند افراد سخت نقصان دہ ہیں۔

☆

# ''میرا''

## ( احتجاج کی پہلی آواز )

نگار عظیم

کس کو پتہ تھا کہ جودھ پور میں راٹھور ونش کے ایک جاگیردار شاہی گھرانے میں پیدا ہونے والی میرا صرف راجستھان یا برج کی گلیوں میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر نکل کر عالمی سطح پر ایک تاریخ ساز شخصیت کے روپ میں جانی اور پہچانی جائیں گی۔ فرد کو شخصیت بننے میں اس کے آس پاس کے ماحول رہن سہن اور خاندانی پس منظر کا بہت ہی اہم رول ہوتا ہے۔ میرا کے ایک منفرد شخصیت بننے کے اسباب اور عناصر انہیں خاندان اور سماج سے ہی میسر ہوئے۔ میرا کے پتا راؤ رتن سنگھ اپنی بہادر اور دلیری کے سبب کافی مشہور تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی جنگیں لڑیں اور کامیابی حاصل کی۔ میرا کی ماں بھی راجپوت گھرانے کی بیٹی تھیں، لہٰذا میرا کو دلیری اور خود اعتمادی ورثے میں ملی۔ لیکن ابتدا سے ہی محرومیوں نے اس شدت سے میرا کا دامن پکڑا کہ یہ ورثہ ایک حقیر شے بن گیا۔ نہ کھیل نہ کود نہ گڑیاں نہ گڈے۔ بلکہ ماں کے آنچل سے محرومی ان کے حصے میں آئی۔ پتا میدان جنگ کے کارناموں سے جڑے رہتے۔ میرا کے نہ کوئی بہن نہ بھائی صرف تنہائی۔ ایسے میں میرا کی پرورش دادا راؤ دادا جی کی دیکھ ریکھ میں ہوئی۔ انہیں کے زیر سایہ میرا نے چھوٹی عمر سے ہی رقص اور موسیقی کے ساتھ ساتھ مذہبی کتابوں کو اپنا ساتھی بنایا۔ میرا کے دادا راؤ دودا جی وشنو بھگت تھے لہٰذا میرا کے اندر بھگتی کے جراثیم بڑی خاموشی سے داخل ہوگئے۔ ان جراثیم کو پنپنے کے لیے مناسب ماحول اور آب وہوا راج گھرانے میں ہی ست سنگت سے میسر ہوگئی۔ میرا ابھی صرف بارہ برس کی تھیں کہ دادا راؤ دودا کا بھی انتقال ہوگیا۔ میرا کی تنہائیوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورے ہندوستان میں بھگتی تحریک زور شور سے چل رہی تھی۔ سورداس، لیبھن داس، نندداس، پریم آنند وغیرہ وغیرہ نے اس تحریک کو خوب ہوا دی۔ گلی گلی اور گھر گھر بھجن کیرتن کی آوازیں اور سماجی ڈھانچہ نہ صرف کمزور تھا بلکہ لرز رہا تھا۔ خاص طور پر خواتین کی زندگی جہالت اور فرسودہ رسم ورواج کے مختلف دائروں میں گھوم رہی تھی۔ ہندو سماج منواسمرتی کے اصول پر قائم تھا۔ عورت جب تک والدین کے گھر رہے گی ان کے آدھین یا غلام رہے گی جب سسرال چلی جائے گی تو ان کی غلام بن کر رہے گی۔ اس کی اپنی منشا، مرضی یا اختیارات کا کوئی دخل نہ ہوگا۔ اس کی اپنی آرزوئیں، تمنائیں سسک سسک کر دم توڑ دیتی تھیں۔ ان کی زندگی اپنی ہوتے ہوئے بھی اپنی نہیں ہوتی تھی۔ میرا کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ان کے اندر بچپن سے ہی بغاوت کے عناصر موجود تھے جو کبھی ضد میں بدلتے تو کبھی سرکشی میں۔

میرا جب بہت چھوٹی تھیں تب کسی شادی میں دولہا کو دیکھ کر انہوں نے اپنی ماں سے سوال کیا تھا کہ ''ماں میرا دولہا کون ہے'' تو ماں نے کرشن بھگوان کی مورتی کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیا کہ 'یہ ہے' بس میرا کے معصوم دل نے کرشن کو پتی کے روپ میں اپنے من مندر میں بسالیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میرا کے یہاں آنے والے سادھو سنتوں میں کسی کے پاس کرشن کی مورتی تھی اور میرا نے اسے لینے کی ضد کی۔ ان کی ضد اور ہٹ کے سبب اس سنت کو وہ مورتی میرا کو دینا پڑی اور پھر ہمیشہ میرا نے اس مورتی کو اپنے پاس رکھا۔ میرا جتنی تن سے خوبصورت تھیں من سے اس سے بھی زیادہ خوبصورت تھیں۔ ان کی اس خوبصورتی، سچائی اور معصومیت پر تنہائی اور اکیلا پن حاوی ہوگیا۔ تب میرا نے خود کو پریم ساگر میں ڈبو دیا۔ میرا کو اس میں ایسا سرور اور نشہ حاصل ہوا کہ انہوں نے دنیا اور سماج سے سارے رشتے توڑ لیے۔ اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو میرا نے پیار میں بدل دیا۔ یہ پیار بھگتی، عشق اور پھر جنون میں تبدیل ہوگیا۔ عشق بیچاں کی نازک بیل میں وہ لپٹتی چلی گئیں۔ دردِ عشق پیدا ہوا تو تخلیقی صلاحیتیں بھی اجاگر ہوئیں اور بغیر کسی شرم وحیا کے بلا جھجک میرا کی شاعری میں پریم رس سمانے لگا۔ کرشن کی چاہت نے انہیں یہ کہنے پر مجبور کیا:

''مہاراں ری گردھر گوپال دوسرا ڑاں یاں
دوسرا ڑاں کو یاں سادھاں سکل لوک جو یاں''

اتنا ہی نہیں میرا گھنٹوں کرشن کی مورتی کے آگے کھڑی رہتیں اور گذارش کرتی رہتیں کہ ہے میرے گردھاری میری لاج رکھ لینا، میری پکار سن لینا۔ اگر مجھے درشن نہیں دیئے، مجھے قبول نہیں کیا تو میں جنم جنموں تک کنواری ہی رہوں گی۔

''ٹھاڑی عرج کراں گردھاری راکھیاں لاج ہماری
میرا رے پربھو ملشیو مادھو جڑم جڑم ری کنواری''

عشق کی تپش اور ضد سے جو شعلہ بھڑکا اس نے میرا کے وجود کو ہی مکمل احتجاج بنا دیا۔ سماج کے سامنے وہ خود ایک سوال بن گئیں۔ عشق پاک اور سچا ہو اور چاہت بے غرض تو پھر انہونی بھی ہونی بن جاتی ہے۔ لہٰذا شری کرشن نے نہ صرف میرا کو درشن دیئے بلکہ چھپن کروڑ باراتیوں کے ساتھ انہوں نے میرا کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنی پتنی قبول کیا اور عورت کی عزت، آبرو، اعتماد، اعتقاد، ناموں اور خودداری کو تحفظ عطا کیا۔ میرا تو دھنیہ ہوگئیں۔ انہیں یقین ہوگیا کہ ان کے پیرتم سانوریا ان کے ساتھ ہیں۔ اب انہیں کسی کا ڈر نہیں حالانکہ یہ ڈر انہیں پہلے بھی نہیں تھا لیکن انہیں تقویت ضرور حاصل ہوئی۔ راج ونش کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ ست سنگت کرتیں ویڑاں بجاتیں، بھجن کیرتن گاتیں اور پیروں میں گھنگھرو باندھ کر گھنٹوں اپنے پریتم کے سامنے رقص کرتیں۔ اب ان کے پتا کو بیٹی کی چنتا ہوئی۔ بڑے بڑے یدھوں میں جیتنے والا راجونشی پتا بیٹی سے ہار گیا۔ جب رانا سانگا کے بڑے بیٹے بھوج راج سے میرا کی شادی ہوئی تو میرا کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ میرا نے اس شادی کے لیے احتجاج کیا یا نہیں اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔ عمر کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن بھی نہیں لگتا۔ ہاں انہوں نے اس کا قصوروار اپنے پتا

کو ضرور ٹھہرایا۔انہوں نے بڑی سچائی سے کھلے الفاظ میں اس کا بیان بھی کیا:

لگن مہاری سیام شوں لاگی
نینا نرکھ سکھ پائے
ساجاں سنگار سہنا گاں سجڑیں پریتم ملیاں دھائے
ورڑاں بریاں باپورو۔ جڑمیاں جڑم ڑسائے
بریاں ساجڑاں سانورو۔ مہاری چڈلو امر ہوجائے
میرا رے پربھو ہری اویڑاسی۔ کبرے ملیو جائے

میرا کا تمام کلام ان کے دل کی آواز ہے۔اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک لائن میں دہکتا الاؤ ہے۔شری کرشن کے دیدار سے وہ پریم ساگر میں ڈوب کر دھنیہ ہوجاتی ہیں تو جدائی کے لمحوں میں تڑپتی ہیں اور دیدار کی تمنا کرتی ہیں۔خود اعتمادی اور بھگتی نے میرا کو غیر معمولی طاقت عطا کی۔وہ سسرال تو چلی گئیں لیکن بھوج راج کو انہوں نے کبھی اپنا پتی قبول نہیں کیا۔وہ سولہ سنگار ضرور کرتیں لیکن اس سماجی روپ والے پتی کے لیے نہیں بلکہ ''گردھاری'' کے لیے۔ وہ سسرال میں بھی نڈر ہوکر بھگتی اپاسنا اور ست سنگ کرتیں۔وہ تو جہیز میں بھی کپڑوں اور زیورات کے بجائے اپنے گردھر گوپال کی مورتی لے کر آئی تھیں۔میرا نے اپنی ساس کی خواہش اور رسم ورواج کے مطابق اپنے سہاگ کی سلامتی اور لمبی عمر کے لیے دیوی کی پوجا نہیں کی۔ان کے سسر رانا سانگا نے کل کی مریادا کا واسطہ دیا نند نے بھی ست سنگ کو پاپ کہہ کر سمجھانے کی کوشش کی۔سکھیوں نے بھی میرا کو راہِ راست پر لانے کا جتن کیا لیکن میرا پر رتی برابر بھی اثر نہیں ہوا۔بلکہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئیں کہ

''میرؔ گردھر ہاتھ بکاڑیں۔لوگ کہیو بگڑی''

میرا کو اپنی سسرال میں طرح طرح کی پابندیاں اور طعنے سہنا پڑتے لیکن ان کے پتی بھوج راج شاید ان کی اٹوٹ بھگتی یا روحانی عشق سے متاثر ہوگئے تھے کہ انہوں نے میرا کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔پتی کے ظلم وستم کا کوئی اشارہ میرا کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔لیکن اسے بھی میرا کی بدقسمتی کہئے یا محبت کا امتحان کہ میرا کے پتی بھوج راج کا جلد ہی انتقال ہوگیا اور ان کا دیور وکرمادتیہ گدی پر بیٹھا۔تب میرا تنہا خاندان، راج اور سماج کے نشانے پر تھیں۔ان کو کلنکنی اور چرتر ہین کہا گیا۔دراصل میرا نے نہ تو وِدھوا کا روپ لیا اور نہ ستی ہوئیں۔وکرمادتیہ اور ساس کے ذریعے رَچے گئے شڈیَنتر میرا کا بال بھی بانکا نہ کرسکے۔اس کے باوجود میرا میں اتنا صبر وضبط تھا کہ ان کی زبان نے کبھی شاہی مریادا ترک نہیں کی۔ان کے اندر نہ کوئی کھوٹ تھا نہ پروپیگنڈہ۔نہ کوئی آندولن نہ نعرے بازی۔وہ تو ایک خاموش احتجاج تھیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ راج گھرانے میں پلی بڑھی میرا سارے عیش تیاگ کر آخر اس آگ کے دریا میں کیوں کود پڑیں؟

انہوں نے پتی میں پرمیشور پانے کے بجائے پرمیشور میں پتی کیوں تلاش کیا؟ دراصل میرا نے عورت کے وجود اس کی آزادی اس کی خودمختاری اور غلامی سے نجات کا بڑے چیلنجنگ ڈھنگ سے اعلان کیا۔میرا نے فرسودہ سماجی نظام کو للکارا، نشانہ بنایا۔میرا ایک چھترانی تھیں۔اپنے مستحکم ارادوں اور اٹل فیصلوں کے لیے لڑنا یا دراستیصال کے خلاف آواز اٹھانا ان کا دھرم تھا۔اپنی معصوم اور سچی چاہتوں کا کھلے دل سے اعتراف کرنے والی میرا نہ راج گھرانے کے قوانین اور اصولوں سے ڈریں نہ سماج سے۔نہ زہر اور سانپ سے اور نہ ہی کانٹوں بھری سیج سے۔میرا نے جب تک چاہا جیسے چاہا اپنی زندگی گزاری۔خود قربان ہوکر میرا نے عورت کو راہ دکھائی کہ وہ کسی کی غلام نہیں۔میرا کی پوری زندگی صرف عورت ہی نہیں مرد سماج کے لیے بھی مثال اور مشعل راہ ہے۔

آج بہت سارے سوال سامنے ہیں۔کیا آج عورت ستی نہیں ہوتی؟ کیا آج بھی پتی اس کے لیے پرمیشور نہیں؟ کیا آج بھی پیار کرنے والی عورت زہر کا پیالہ نہیں پی رہی؟ کیا آج عورت کو اس کے تمام حقوق حاصل ہیں؟ کیا آج بھی عورت آگ میں نہیں جلائی جارہی؟ کیا آج مرد سماج کی اجارہ داری نہیں؟ کیا میرا کے پیٹ میں میرا کا قاتل نہیں ہورہا؟؟ گلوبلائزیشن کے اس دور میں جب عورت صرف ایک اشتہار بن گئی ہے، اس کا اصل وجود اس کی پہچان کہیں گم ہوگئی ہے۔ایسے میں کیا میرا کو از سرِ نو پڑھنے کی ضرورت نہیں؟ ضرورت ہے، کیونکہ میرا سمبل ہے احتجاج اور خود اعتمادی کا، شالینتا اور پیار کا۔اور اس کے لیے مذہب دیش ذات اور ملک کی کوئی قید نہیں۔

## دکان داری

ایک آدمی سرِ راہ اپنے ڈاکٹر سے ملا تو حیرت سے پوچھا!
جناب کلینک بند کر کے چپکے سے کہیں چلے گئے اور کسی کو بتایا تک بھی نہیں۔
ڈاکٹر نے حیرت سے کہا: نہیں تو میرا کلینک ابھی بھی وہیں ہے۔تمہیں کس نے بتایا؟
کلینک کے نیچے چاول کی دکان والے نے اور اس کے برابر بیٹھے قصاب نے۔
ڈاکٹر صاحب سیدھا اس چاول اور قصاب کی دکان پر گئے اور پوچھا؟
بھائی، تمہارے اور میرے بیچ ایسی کون سی بات ہوگئی ہے کہ تم میرے مریضوں کو اوپر میرے کلینک میں جانے دینے کی بجائے بتاتے ہو کہ میں یہاں سے کلینک بند کر کے کہیں اور چلا گیا ہوں۔ایسا کیوں کر رہے ہو؟
ان دونوں نے کہا: ڈاکٹر صاحب، آپ بھی تو جو مریض آتا ہے اسے کہتے ہو کہ چاول نہ کھاؤ، بڑے کا گوشت نہ کھاؤ اب اگر کام کرنا ہے تو مل کر کریں گے۔۔۔
ورنہ دکان داری بند ہوگی تو سب کی ہوگی۔

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

فیملی فوٹو

محترمہ قرۃ العین حیدر کے ساتھ

جناب اظہار اثر کے ساتھ

گجرال صاحب اور نارنگ صاحب سے ایوارڈ لیتے ہوئے

جشن محمد حسن، پروفیسر ابن کنول کے ساتھ

جناب ہرن چرن چاولہ کے ساتھ

جناب گلزار دہلوی کے ساتھ

جناب طارق شمیم کے ساتھ

سلطانہ مہر، طاہر تونسوی، ابوالفیض سحر، سلیم اختر، شمع افروز

جناب آل احمد سرور کے ساتھ

پروڈیوسر اشتیاق خان کے ساتھ فلم شہید کے ایک کردار میں

کینیڈا میں پروین شیر اور قمر رئیس کے ہمراہ

افسانوی مجموعہ ''گہن'' کی رسم اجرا کے موقع پر مدعو احباب

اداکار فاروق شیخ سے محو گفتگو

علی سردار جعفری کے ساتھ

محترمہ شیلا دکشت کے ساتھ

نور ظہیر کے ساتھ

ڈاکٹر اسلم پرویز کے ہمراہ

ادبی محفل میں احباب کے ساتھ

جناب مقصود الٰہی شیخ کے ہمراہ

از بیک گھرانے میں محفل ضیافت کا ایک منظر

ہر چرن چاولہ فن اور شخصیت پر ایوارڈ لیتے ہوئے

الیاس شوقی، شاداب رشید، جاوید صدیقی اور قاسم امام کے ہمراہ

ابن کنول، فاروق بخشی، تسنیم کوثر اور علی احمد فاطمی کے ہمراہ

اقبال مرزا اور عبدالاحد ساز کے درمیاں

تاشقند میں ہندی روس کے موقع پر تقسیم انعامات

# جمالِ مدینہ

## نعت رسولِ مقبولؐ

یہ دیکھا ہے ہم نے کمالِ مدینہ
جھلکتا ہے ہر سُو جمالِ مدینہ

بچھڑ کر مدینے سے، رہتا ہے سب کو
خیالِ مدینہ ، ملالِ مدینہ

اگر نور کے کوئی پوچھے گا معنی
تو دوں گا اُسے مَیں مثالِ مدینہ

وہاں سے پلٹ کر تو آیا ہوں لیکن
نہیں بھولتے ماہ و سالِ مدینہ

عجب یہ سفر ہے کہ دل میں مکیں ہے
مدینے سے پہلے خیالِ مدینہ

جمالِ مدینہ میں جلوے انہی ﷺ کے
اُنہی سے ہے قائم جمالِ مدینہ

وہی میرے آقا، وہی میرے مولا
وہی یعنی وہ خوش خصالِ مدینہ

اسی کے لیے وقف میرا قلم ہے
وہی ہستیِ بے مثالِ مدینہ!

نسیم سحر (راولپنڈی)

## اظہارِ تشکر

خدا کا شکر
کہ میں
بنی اسرائیل کے قبیلے کا جواں نہیں ہوں ورنہ
میرا رب مجھ پر رحمتوں کی برسات کرتا لیکن
مری زباں سے کبھی کلماتِ شکریہ ادا نہ ہوتے
خدا کا شکر
کہ میں
صلیبی قوم کا بھی جواں نہیں ہوں ورنہ
ابنِ مریم کو ابنِ خدا کہتا
خدا کا شکر
کہ میں
بت پرستوں کی جماعت سے الگ ہوں ورنہ
وحدانیت کے تصور سپرے
خیالی دیوتاؤں کے آگے
سرنگوں ہو کر توہینِ سجدہ کرتا
خدا کا شکر
کہ میں
اس نبی کا امتی ہوں
جسے خیرالبشر
شاہِ عرب
تاجدارِ حرم
کے القاب سے نوازا گیا
خدا کا شکر
کہ میں
اس نبی کا امتی ہوں
کہ
جسکے در کی غلامی
ہزاروں بیگھا زمیں کی شاہی سے عظیم تر ہے۔

افق فریدی (دہلی)

# غم گسار

آغا گل

(کوئٹہ)

وہ اجنبی نمبر دیکھ کر کال نہ لیتا۔ کیونکہ ابتک افسری کا نشہ کچھ کچھ باقی تھا۔ وقت کی ترشی نے یہ نشہ اتارا تو نہ، ظاہر ہے کہ چالیس برس پہ محیط وہ نشہ جب انسان اس کے سامنے سائل بن کر آتے۔ اپنا حق مانگنے والا ہر شخص اس نظام میں فریادی اور سائل ہوا کرتا ہے۔ اس کا پی اے کاغذ کی چٹ بھجواتا۔ تا کہ ملاقاتی کو ذرا خوار کیا کرے۔ سائل کا جوش و جذبہ انتظار میں ہی بیٹھے بیٹھے دھیما پڑ جائے جیسے ٹرین سریاب سے ہی دھیمی ہونے لگتی ہے۔ سائل سلام کر کے سامنے آ بیٹھتا۔ جبکہ کچھ مؤدب سے کھڑے رہتے کہ حکم ملے تو بیٹھیں۔ وہ بے معنی فائلوں پہ نظریں جمائے سائیلین کی جھاگ بٹھا دیا کرتا۔ ایئرپورٹوں پر اس کا بریف کیس تھامنے والے کھڑے ہوتے۔ ریسٹ ہاؤسوں میں وہ برستا کہ ٹیبل لیمپ کیوں کام نہیں کر رہا ہے۔ مگر ریٹائر ہوتے ہی فضاؤں میں تیرتا غبارہ زمین پہ آ گرا اور وقت کے قدموں تلے روندا گیا۔ کٹی پتنگ کی طرح، جسے لوٹنے والے بھی نہ تھے۔ رفتہ رفتہ اسے علم ہوا کہ وہ نیکولائی گوگول کی طرح زندگی کی اندھیری قبر میں جاگ اٹھا ہے۔ جہاں سے نکل بھاگنے کا کوئی بھی راستہ نہیں اور نہ ہی اس کی آواز لوگوں کو متوجہ کر سکے گی۔ متوفی یا ریٹائرڈ افسر کی پکار ہی لوگوں کو ہراساں کر دیتی ہے۔ وہ لاحول پڑھتے ہوئے دور ہو لیتے ہیں۔ اس کے دوست بھی ایک ایک کر کے چلتے بنے۔ بہتر حوروں غلمان۔ شراب طہور، خالص شہد کی ندیوں کے دیس میں جہاں بغیر ویاگرا کی گولیاں پھانکے ہر مرد حوروں۔ غلمانوں پر حاوی رہتا ہے۔ جنت کے مزے کا سوچ کر اسے تسلی تو ہوتی ورنہ فنا کا خوف ہی اسے مارے ڈالتا۔ جب انسان کی عمر زیادہ ہو تو رشتہ دار بھی پریشان ہوتے ہیں کہ آخر مرتا کیوں نہیں۔ اگر وہ ریٹائرڈ جج ہوتا تو اس سے کنواریاں بھی شادی کو مچلتیں کیونکہ بیوہ کو جج کی پوری تنخواہ ملا کرتی ہے۔ ایک حسین عورت کو نو دس لاکھ روپیہ پینشن ماہانہ ملے تو کس قدر اور حسین ہو جائے۔ کتنے ہی خوبرو اس سے شادی کے لیے بیکل ہو جائیں۔ اس نے اجنبی فون اٹھا ہی لیا کہ چلو کسی انسان سے ہی بات ہو جائے۔ مخاطب نے نام کی تصدیق چاہی تو اس نے تصدیق کر دی۔ آواز اجنبی تھی۔ مخاطب کی آواز میں کوئی جذبہ نہ تھا۔

''انور انکل بڑی ہی مشکل سے آپ کا نمبر ملا، میرے والد یوسف، آپ کے بچپن کے دوست یوسف فوت ہو گئے ہیں''

ٹرپل ون بریگیڈ جیسے گیٹ دروازے پھاند کر وزیر اعظم کے دفتر میں آ کودا ہو۔ اسکا دل دھک سے رہ گیا۔ زندگی کی فلم تیزی سے الٹا چلتی اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی۔

''کب فوت ہوئے'' اس نے خود کو سنبھالا۔

''پرسوں، دراصل پریشانی رہی، نمبر بھی نہ مل سکا تھا۔ ان کے بچپن کے دوست صرف آپ ہیں۔ آپ کو اطلاع دینا ضروری تھا۔ آج نماز ظہر کے بعد ان کا سوئم بھی ہے۔ ضرور آئیں''

دوسری جانب سے فون بند ہو گیا۔ مگر اسکا موبائل بدستور کان سے چپکا ہی رہا۔ اپنی محویت سے چونک کر اس نے ندامت سے موبائل ہٹایا۔

یوسف کا خاندان بھی بٹوارہ گزیدہ تھا۔ تقسیم کرنے والوں نے اپنی فوج پولیس استعمال کی کہ ہندو مسلم کو الگ الگ ملکوں میں رکھا جائے۔ گھروں پر سرکار حملے کرواتی۔ محلے جلا ڈالتی۔ نہ تو مسلم فوج نے مسلمان کو بچایا اور نہ ہی ہندو فوج نے کسی ہندو کو بچایا۔ وہ بالکل ہی لاتعلق رہے البتہ مسلمانوں کو ٹرکوں میں بھر بھر کے پہنچاتے رہے کسی بھی ہندو یا مسلم سپاہی نے اپنے لوگوں کے لیے ایک ہوائی فائر تک نہ کیا۔ پولیس تو ۱۹۲۹ء سے ہی ہندو مسلم فسادات کرانے لگی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گوداموں کے چوکیدار دو سو برس کی غلامی میں منجھ گئے تھے۔ DieorDo کی مالا جپتے، کب کے انسانی قدروں سے دور ہو چکے تھے۔ یوسف کا گھرانہ بھی بچتا بچاتا دھکے کھاتا کوئٹہ چلا آیا تھا۔ اس محلّے میں بھارت سے آنے والوں کا قبضہ تھا۔ ان کا ماضی دو قومی نظریہ چاٹ گیا اور مستقبل موہوم تھا۔ یوسف کے دادا کو بازار میں ایک چھوٹی سی دکان مل گئی۔ ہندو جو ٹرنک بنایا کرتا وہ تالہ لگا کر بھاگ نکلا تھا کہ امن امان ہو گا تو لوٹ آئے گا۔ جانے وہ ریلوے اسٹیشن بھی پہنچ پایا ہو۔ یوسف کے دادا نے دکان کا تالہ توڑ کر قبضہ کر لیا۔ کرتار پور میں بھی ٹرنک ہی بنایا کرتا تھا۔

ٹرنکوں کے اصل خریدار فوجی ہوا کرتے ہیں۔ جن کی سوچیں اور زندگیاں بھی ٹرنکوں جیسی فولادی ہوا کرتی ہیں۔ جو صرف Monochrome میں دیکھ سکتے ہیں۔ جن کی زندگی میں بھی صرف دو ہی رشتے ہوا کرتے ہیں۔ اپنا اور غیر۔ دوست اور دشمن۔ یہی دونوں رشتے ٹرنک کی Rivets کی طرح ان کے دماغ میں ہتھوڑے مار مار کے ٹھونک دیئے جاتے ہیں۔ اپنوں سے محبت کرتے ہیں اور دشمنوں کو مارنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ تھوڑی سی تنخواہ کے لیے وہ حکم ملتے ہی انسانوں پہ گولیاں برساتا ہے۔ چاہے جان سے جائے حکم عدولی نہیں کرتا۔ اپنے جسم و جان کا سودا کرتا ہے۔

یہ بھی اتفاق ہے کہ یوسف کا سال پیدائش بھی ۱۹۵۱ء ہی تھا۔ جس کے باعث وہ ہم عمر بھی تھے۔ جس طرح گاہک ٹرنک کندھے پہ اٹھا کر چل نکلتے۔ اس کے دادا کو بھی ملک الموت دام ادا کیے بنا ہی لے کر چلتا بنا تو یوسف کے والد نے دکان سنبھال لی۔ اس کی اپنی زندگی بھی کسی ٹرنک کی طرح ایک ہی ڈھنگ کی تھی۔ صبح وہ نکلتا اور دکان پہ جا بیٹھتا۔ اسکا شاگرد دوپہر میں کھانا لینے آتا۔ شام میں اسکا والد وہی ٹفن کیریئر لیے چلا آتا۔ جیسے کوئٹہ پسنجر ٹھکتی ہوئی Roll-Pitch دھیرے دھیرے چلی جاتی ہے۔ اس اسٹیشن پہ بھی رکتی جہاں کا پلیٹ فارموں صدیوں سے ویران پڑا ہو۔ یوسف بڑا ہوا تو اسے بھی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس دور کی اخلاقی قدروں کی مانند اس کے والد نے ٹیچر کو گارنٹی بھی دی۔

''یہ ہے تو میرا منڈا۔ مگر آپ کو اختیار ہے کہ اسے پڑھائیں۔ نہ پڑھے تو ماریں اسکی ہڈیاں ہماری ہیں۔ کھال آپ کی''

گویا ہڈیاں نہ توڑیں بیدوں سے مار مار کر کھال چاہے اتار دینا۔

استاد کے بید کو اس دور میں مولا بخش کہا جاتا تھا۔ مشہور تھا کہ آسمانی کتابوں کے علاوہ یہ مولا بخش بھی آسمان سے اترا ہے۔ جسے کوئی بات سمجھ نہ آئے۔ مولا بخش با آسانی سمجھا دیتا ہے۔ سرکار نے بھی یہی اصول اپنایا۔ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت توڑی بھابھڑہ میں 350 شہری قتل کر ڈالے۔

اسپیشل اسکول کے پہلو میں ہی راحت سینما تھا اور قریب ہی عصمت سینما۔ نرگس، مدھوبالا، گیتا، ثریا، جس کے دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے اور چمکتی آنکھوں والی شیاما۔ سارے لڑکے ان کے اسیر ہوتے چلے گئے۔ یہی نہیں کہ ان سے لیاقت بازار کی ون وے ٹریفک کی طرح یک طرفہ محبتیں بھی کرنے لگے۔ یوسف نرگس پہ مرمٹا۔ نرگس کی فلم دیکھنے کیلیے وہ تین بجے ہی راحت سینما پہنچ جاتا۔ چونکہ کم عمر تھا اور قد بھی چھوٹا تھا۔ اس کی بند مٹھی ٹکٹ کھڑکی تک نہ پہنچ پاتی۔ جسکے باعث وہ صدیق گینڈے سے ٹکٹ لیا کرتا۔ صدیق ہر فن مولا تھا۔ اٹھائی گیر، نچلے درجے کا چور، اور ٹکٹ بلیک کرنے والا۔ ٹکٹ گھر والے سے سانجھا تھا۔ جب صدیق بیس ٹکٹوں کی قیمت مٹھی میں بند کر کے سلاخوں میں ہاتھ داخل کرتا تو اس کا ساتھی بیس ٹکٹ پکڑا دیتا۔ ٹکٹ کلرک کے لیے صدیق دائیں کلائی پہ سرخ رومال باندھے رہتا۔ یہی اسکا ٹریڈ مارک تھا۔ جس کے باعث اسکا ہاتھ پہچانا جاتا۔ گینڈا یوں کہ وہ اس قدر موٹا تھا۔ گردن تھی ہی نہیں۔ یا کسی اور نمبر کی لگ گئی تھی۔ یوسف اور انورل کر ہی فلم دیکھا کرتے۔ ہر ہفتے ٹکٹ کے پیسے ملنا مشکل ہوتا۔ کبھی تو یوسف اپنے والد کے دخل سے پار کرلاتا اور باقی دوستوں کو بھی فلم دکھاتا۔ یوں تو ان کا ٹکٹ آدھا لگتا مگر ہر ہفتے بارہ آنے کا ٹکٹ خریدنا ممکن نہ ہوتا۔ سینما مالکان نے زنانہ شو کا رواج دے رکھا تھا۔ جس میں بارہ آنے آدھا ٹکٹ لیا جاتا۔ اور بچوں سے 6 آنے۔ مٹھی میں چھ چھ آنے دبائے وہ کسی ہمدرد عورت کے برقعے کا دامن تھام لیتے۔

''خالہ مجھے بھی لے جاؤ، ماسی مجھے بھی لے جاؤ''

ماسیاں خالائیں لڑکوں کو گیٹ کے اندر دھکیلتیں۔ گیٹ کیپر منمناتا۔

''آپ پشتون ہیں کہ پنجابی آپ کے بیٹے کیسے ہیں؟''

خواتین آنکھیں دکھا کر بچوں کو ہال میں لے جاتیں۔

یوسف اور یونس کو گھر سے ڈیوٹی ملی کہ اسکول کے بعد کواری روڈ کی ڈیری سے خالص دودھ لایا کریں۔ راہ میں کاریز گزرتی تھی۔ جس کے باعث وہ شاوکشارو ڈ سے گزرتے۔ ان دنوں غازی سینما کی جگہ میدان پڑے تھے۔ یوسف اور یونس خاصے سیانے تھے۔ وہ تین تین سیر کی بجائے اڑھائی سیر فی کس لیتے اور آدھ سیر کے پیسے روزانہ بچالیا کرتے۔ یوں سینما کا خرچ بھی بخوبی چلنے لگا۔ موڑ پر آکر وہ میونسپلٹی کے نلکے سے تھوڑا تھوڑا پانی بالٹیوں میں ڈال کر کمی پوری کرلیا کرتے۔ ویسے پیتل کی یہ چھوٹی چھوٹی بالٹیاں کرمنڈلیاں کہلاتی تھیں جنہیں پیانو، ہارمونیم، بانسری کی طرح ہندو بھاگتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ اس روز شائد پانی کا دباؤ زیادہ تھا نلکا کھولتے ہی پانی کا فوارہ نکل آیا۔ کرمنڈلی ہٹاتے ہٹاتے بھی لبالب بھر گئی۔ اس لسّی کو لے جانا بھی خطرناک تھا۔ یونس نے رائے دی کہ دونوں دودھ باہم ملا لیتے ہیں۔ یوں گاڑھے ہو جائیں گے۔ دونوں کو باہم الٹا پلٹا تو نتیجہ نہ نکلا۔ یوسف کی والدہ نے جو پتلا دودھ دیکھا تو آگ بگولہ ہوگئی۔ جھٹ اپنا خیمہ نما سفید برقع سر پہ رکھا۔ یوسف کو ساتھ لیا اور ڈیری والے کے جا پہنچی۔ بجائے سلام دعا کے جاتے ہی برس پڑی۔

''بھائی تم کو شرم نہیں آتی میں روزانہ تین سیر دودھ منگواتی ہوں۔ تم یہ پانی بھیج دیتے ہو۔ اللہ کے نور میں پانی ملاتے ہو؟''

اس نے جو بالٹی میں جھانکا تو فرمایا۔ ''بہن غور سے دیکھو کم از کم ساڑھے پانچ سیر ہے۔ اور یہ دونوں لڑکے تو ڈھائی ڈھائی سیر لے جاتے ہیں آدھا سیر پانی ہر بالٹی میں کاریز سے ملاتے ہوئے میں نے بھی دیکھا ہے۔ مجھے تو تمہارے گھر کا پتہ نہ تھا ورنہ آکر بتاتا''

اسکی والدہ نے جھٹ پاؤں سے بڑا سا سلیپر نکالا جو وہ غصّے میں شوہر کا پہن آئی تھی۔ یوسف تو چھلاوہ تھا یہ جا وہ جا کاریز پھاند کر نکل لیا۔ شام کو ڈھونڈھیا پڑی تو سارا محلّہ نکل پڑا ماں پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اسپیشل اسکول کی دیوار پہ چڑھ کر وہ گھنے درختوں کی ٹہنیوں میں چھپا بیٹھا تلاش کرنے والوں کو دیکھتا رہا۔ آخر عام معافی کے وعدے پر نیچے اتر آیا۔ طے پایہ کہ ہفتے میں ایک فلم دیکھنے کے لیے پیسے گھر سے دیے جائیں گے۔ دودھ میں پانی ملانا بھی چھوڑ دے۔

انہی دنوں معین کے والد نے محلّے میں مکان خرید لیا۔ ان کا سارا خاندان ہی نئے گھر میں منتقل ہوگیا۔ شاید روحوں کو روحوں نے پہچان لیا۔ یوسف اس کا گہرا دوست بن گیا۔ وہ بھی ایسا کہ جیسے روحانی بزرگ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ مادھولال جو شاہ حسین کے لیے مسلمان ہولیا اور شاہ شمس جو رومی کی محبت میں اس کے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ امیر خسرو جو نظام الدین اولیاء کے ساتھ ہی قبر میں مدفون ہونے کا متمنی تھا۔ اسکول جانا بھول کر بستہ اٹھائے تھڑے پہ آبیٹھتا۔ معین بستہ لیے نکلتا تو اس کے ساتھ ساتھ تعمیر نو اسکول تک جاتا۔ انگلی میں M والی انگوٹھی بھی پہنے رہتا۔ چھٹی کے وقت بھی وہ اسکول کے سامنے آ بیٹھتا۔ معین کو ہاتھوں لیتا۔ دونوں بستے اٹھائے لوٹ آتے۔ یوں یوسف کا نام اسکول سے کٹ گیا۔ جبکہ بستہ لے کر نکلنا اور دوپہر میں بستہ بدست لوٹنا یوسف کا معمول رہا۔ محلے میں لڑکوں کے مختلف نام رکھے ہوئے تھے۔ صدیق ڈوئی، رمضان میر بکری، صدیق گینڈا، وڈھانتھا انور کرنگ، اشرف گھوڑا۔

یوسف کا قد جانے کیوں نہ بڑھ پایا جس پر اسے ٹنڈا یوسف یا خالی ٹنڈا کہا جاتا۔ انور نے ایک بار آواز لگائی تھی۔ ''ٹنڈے'' ان دونوں لڑکے دروازے پہ آوازیں لگا کر دوستوں کو باہر بلایا کرتے۔ بجائے ٹنڈے کے اس کی والدہ چلی آئی۔

''شرم نہیں آتی میرے منڈے کا نام بگاڑتے ہو۔ تم ان سپٹرنی کے لڑکے ہو اس لیے چھوڑ دیا۔ آئندہ ٹنڈا مت کہنا''

انور کے والد چونکہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر تھے۔ اسکی والدہ کو محلّہ انس پٹرنی پکارا کرتا۔ انور بھی مہا ڈھیٹ تھا۔

''خالہ غلطی ہوگئی۔ اب تو بلا دو''

یوسف کو اسکول یا تعلیم سے دلچسپی نہ تھی۔ اسے حسرت ہی رہی کہ وہ بمبئی چلا جاتا تو بڑا نام پاتا۔ نرگس سے ملتا۔ اس کے ساتھ ہیرو آتا۔ دوستوں کو تاؤ چڑھتا۔

''گوڈے جتنا ہیرو بھی کبھی ہوا ہے''

یوسف تنگ کر جواب دیتا۔ ''آن فلم والا مقری بھی تو چھوٹا ہے۔''

اس کے والد نے تنگ آ کر یوسف کو دکان پر بٹھا لیا۔ ٹرنک بنانے کے اسرار و رموز سکھائے۔ اور کہا۔

''پتر کماؤ تے کھاؤ۔ محنت کرو تو تم فلم سٹار نرگس کو جا کر مل بھی سکتے ہو۔ بلکہ اپنی فلم بھی بنا سکتے ہو''

یوسف کے دل کی کامنائیں دم توڑ گئیں جب ۱۹۶۵ء کی جنگ ہوئی وہ دونوں ڈیلائیٹ سینما میں آخری فلم دیدار دیکھ رہے تھے۔ کہ اگلے ہی روز اعلان ہوا بھارتی فلمیں بند کر دی گئی ہیں۔ نہ دلیپ کمار ان کے درپن سے لڑا۔ نہ ہی نور جہاں نے نرگس کے بال نوچے۔ یہ تو سپاہی تھے جو باہم لڑے۔ جیسے لوڑی ہمیشہ ڈھول ہی پیٹتا ہے۔ مراثی تالیاں ہی بجاتا ہے۔ سپاہی کا تو کام ہی ہے لڑنا۔ اشارہ ملتا ہے۔

''اوئے پے جا'' تو ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس کا کوئی دشمن نہیں ہوتا۔ مگر وہ حکم کا پابند ہوتا ہے۔

دوستوں کو صدمہ پہنچا کہ انہیں فلمی جنت سے نکالا گیا۔ نرگس کی ناکام محبت سے یوسف کا دل ہی ٹوٹ گیا۔ جس کے باعث یوسف کی شادی کا سب سے پہلے منصوبہ بنا۔ کہتے ہیں کہ اس کی ماں نے زنانہ شو میں فلم کرتار سنگھ دیکھی اور اسکا ایمان افروز نغمہ ''ویر میرا گھوڑی چڑھیا'' سنا تو واپسی پر ٹانگے میں ہی عہد کر لیا کہ اپنے پتر کو بھی گھوڑی چڑھائے گی۔ یوسف نے بیہری دولتیاں جھاڑیں مگر ایک نہ سنی گئی۔ عزیزوں کے ہاں رشتہ بھی طے ہو گیا۔ یوسف کو خوف تھا کہ آزادیاں سلب ہو جائیں گی۔ مگر ایک نہ سنی گئی۔ چونکہ اسکا قد چھوٹا تھا دوستوں نے سوچا کہ گرم کر کے کندھوں اور پیروں سے کھینچا جائے۔ اسے سیّ لے جا کر تپایا جائے۔ تو شاید پھیل کر قد بڑا ہو جائے۔ مگر گھوڑے نے دو قیمتی مشورے دیئے اول یہ کہ کسی ماہر ہزارہ سے اونچے سول کا بوٹ بنوایا جائے جو زمین سے چار انچ اونچا ہو۔ دوئم ماجھے نائی سے اس کے بال اوپر اٹھا دیے جائیں۔ جب بال بڑے کیے اور ماجھے نے کوئی سپرے مارا تو بال گویا دوسری منزل بن گئے۔ جن میں چڑیا بھی انڈے دے سکتی تھی۔ بوٹ بھی بن کر آ گئے یوں اس کے قد میں مجموعی طور پر سات انچ کا اضافہ ہو گیا۔ اسی سات انچ اضافی قد کے ساتھ لائل پور روانہ ہوئے۔ ماجھے کی وصیت تھی کہ شادی سے قبل یوسف صرف منہ ہی دھوتا رہا ورنہ بالوں کی چھت رخِ روشن پہ آن گرے گی۔ ساتھ ہی ماجھے نے بطور حفظ ماتقدم وہ سپرے کا ڈبہ بھی دیا تھا کہ بارش ہوئی تو دوبارہ بالوں پہ سپرے مارا جائے۔ ورنہ جھونپڑی بیٹھ جائے گی۔

خیر بارش تو نہ ہوئی۔ وہاں رواج تھا کہ دولہا گھوڑے پر بیٹھ کر بارات لیے آتا۔ لڑکی والوں نے شادی والا گھوڑا تیار کر رکھا تھا۔ یہ سدھایا ہوا مریل سا گھوڑا ہوا کرتا ہے۔ سول حکومت کی طرح آنکھوں پہ پٹی بندھوا کر دلیپ کمار کے اشاروں پہ چلنے والا۔ جو ''کتنا حسیں ہے موسم۔۔۔'' کتنا حسیں سفر ہے'' گیت میں مینا کماری کو لیے جا رہا تھا۔ وہ بمشکل ہی مینا کماری کا وزن سہار رہا تھا۔ ویسا ہی گھوڑا یوسف کے روبرو پیش کیا تو کمبخت کی رکاب یوسف کے کندھے کے برابر تھی۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک دہلیز دکھائی دی۔ آخری سیڑھی پہ دولہا کو کھڑا کر کے گھوڑا لایا گیا تو وہ اچک کر شاہسوار بنا۔ شادی تو بخیریت ہو گئی۔ مگر پھر یوسف نے نہ تو ایسے بال بنوائے اور نہ ہی وہ بوٹ پہنے۔ دلہن نے اسی منّے کو من مندر کا دیوتا مان لیا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ زندگی بدلتی چلی گئی۔ پہلے امیر غریب مل کر ایک ہی محلّے میں رہا کرتے۔ پھر جو دو قومی نظریئہ کی یلغار ہوئی تو پورا ملک ہی دو قوموں میں بدل گیا۔ امیر غریب، جوتے مارنے والے۔ جوتے کھانے والے۔ لوٹنے والے۔ لٹنے والے۔ امیر سارے ڈیفنس کالونیوں میں چلے گئے۔ جو کھمبیوں کی طرح خود رو تھیں۔ عوام جلتی بلتی گلیوں میں ہی جیون بھوگنے کو رہ گئے جہاں اداسی بال کھولے سوئے رہتی۔ ان کے ہاں سب سے بڑی انڈسٹری تو سیاست اور عقیدے کی چھابڑی تھی۔ سیاست میں لاٹھی چارج میں زخمی ہونے والا، پولیس کی گاڑی سے وی فار ویکٹری والی انگلیاں بنانے والا۔ خوب کماتا۔ جبکہ عقیدے کا خوانچہ چائنہ کی تسبیح۔ سفید ٹوپی کی لاگت سے شروع ہوتا۔ داڑھی ذاتی سرمایہ ہے۔ بچپن کے دوستوں میں کوئی بھی اس Gold Rush کی جانب راغب نہ ہوا۔ بلکہ کاروبار اور سرکاری ملازمتوں میں ڈومی سائل کے سہارے جھانکتے پھرے۔ یوسف چٹا ان پڑھ تھا۔ وہ نہ تو ٹرنکوں کا ڈیزائن بدل سکا۔ نہ ہی اس پینٹر کو جو ٹھیکے پر ٹرنکوں پر رنگین برش چلاتا۔ شادی کے بعد اس کے معمول میں فرق نہ پڑا البتہ کندھے پہ تولیہ ہاتھ میں صابن دانی لیے صدیق نائی کے حمام میں داخل ہونے کا عمل بڑھ گیا۔ سارے ہی دوستوں کو ضربات حادثات نے حدید سے تلوار بنا دیا۔ ہر کوئی رزق کی فصل کاٹنے لگا۔ فصل کم تھی اور کاٹنے والے زیادہ۔ معین کلرک لگ گیا۔ فرید جسے بیدا کہا جاتا محبت میں گرفتار ہوا تو لیّے نے ریلوے میل سروس میں کہہ سن کر سارٹر لگوا دیا کہ خود ہی کماؤ کھاؤ۔ باپ کے روپے پہ عشق کیسا۔ ابّا تو پہلے ہی مہربان کے گھوڑے کی طرح خاندان کا تانگہ کھینچے ہانپے جاتا تھا۔ ضمیر اوورسیئر لگ گیا۔ اشرف ریلوے میں کلرک۔ انور نے مقابلے کا امتحان دیا تو وہ حادثاتی طور پر کامیاب ہو گیا۔ اور افسر بن بیٹھا۔

''شاید میرے پرچے بدل گئے ہوں، یا ممتحن کی عینک ٹوٹ گئی ہو''

''مبارک باد دینے والوں سے اس نے خود ہی سیر حاصل تبصرہ کیا۔

غلام حسین نے نئی کار خریدی تھی عید کے اگلے ہی روز پانچوں دوست کرولا میں نکلے بوستان تک دوڑائی، پھر سرانان سے روسٹ کھا کر لوٹے۔ شیخ ماندہ پہ کار روک کر تصویر بھی بنوائی۔ سہ پہر کے زرد سورج میں بائیں جانب تکتو اور دور کوہ زرغون کا سلسلہ۔ جبکہ کرولا۔ چلتن کے گولڈن کو برا کی طرح لائٹیں مار رہی تھی۔

وہ اکثر ٹیڈی پیسہ بوٹ پہ فلاش بھی کھیلا کرتے۔ غرض تفریح تھی نہ کہ روپیہ۔ پھر وہ ٹیڈی پیسہ چونی میں تبدیل ہو لیا۔ کچھ عرصہ بعد روپیہ ہو گیا۔ جبکہ سینما کے مالک کا بیٹا ظفر چال میں دس دس روپے پھینکنے لگا۔

''چال ڈبل ہوتی ہے، ایک سے دو اور دو سے چار یہ تم ایک پر دس کیسے پھینکتے ہو یہ کونسی فلاش ہے؟''

ان دنوں بھٹو کی حکومت تھی۔ اس نے بابا بلھے شاہ کے مطالبے؛ کلّی۔ گلی۔ جلی (کپڑا۔ روٹی۔ مکان) کو اردو میں بدل دیا تھا۔ روٹی، مکان، کپڑا۔ پاکستانیوں پر یہ نعرہ دن بھر برستا رہتا دوسرا لفظ تھا عوامی۔ یہ ایک مروجہ سابقہ تھا۔ عوامی

سوٹ،عوامی بوٹ،عوامی کھانا۔ظفر نے اسکا فائدہ اٹھایا''یہ عوامی فلاش ہے''

پھر وہ دوست فلاش سے تائب ہوگئے،اپنے بچپن کے دوستوں سے روپیہ اینٹھنا کون سا کمال ہے۔بلکہ تکلیف دہ ہی لگتا۔وہ سکریبل کھیلنے لگے۔یوسف ان پڑھ تھا وہ سکریبل تو نہ کھیل سکتا۔البتہ دلجمعی سے ساتھ نبھاتا۔نمبر کاپی میں لکھتا اور نعرہ بازی میں شامل ہوتا۔ہارنے والے دوست لڈن کباب کے تھڑے پہ کباب کھلاتے۔انور بھی افسری سکریبل کی گتھلی میں بند کر آتا۔ایک بار کسی نے اعتراض بھی کیا کہ آپ گریڈ اٹھاراں کے افسر تھڑوں پہ بیٹھتے ہیں۔انور نے اسے بتایا کہ تھڑوں پہ بیٹھنا کوئٹہ کا کلچر اور کوئٹہ وال کی علامت ہے۔انور گریڈوں کی شٹنگ کرتا کنٹری ہیڈ بن گیا۔پھر ڈھاڈر کے پکے ہوئے بیر کی طرح ٹھپ سے زمین پہ آرہا۔ریٹائر ہوکر وہ یوسف کی دکان کے کسی بھی ٹرنک پہ بے تکلفی سے بیٹھ کر چینکی چائے کا لطف لے سکتا تھا۔

پھر ان کے والدین''کان بوکراڑیں آ''جیسی بس والے کی آواز پر رخصت ہونے لگے۔یوسف کی وہ مہرباں ماں جس نے بچپن میں ٹنڈا کہنے پہ ڈانٹا تھا اور بعد میں اس لیے کہ انور نے دروازے پہ گھنٹی بجائی تھی۔تو سراپا محبت دروازے پہ چلی آئی۔

''ننھے تم کو شرم نہیں آتی غیروں کی طرح بیلیں بجاتے ہو۔اندر آجاؤ''

وہ ٹڈا سننے والا غصّہ نہ تھا۔اپنائیت تھی۔انور نے وضاحت کی۔

''دراصل پردے کی وجہ سے۔۔۔۔''

وہ فقرہ پورا نہ کر پایا۔

''تمہاری بہنیں ہیں۔ان کا تم سے کیا پردہ''

پوری جنریشن جسے مسلم پولیس اور مسلم فوج نے تحفظ نہ دیا۔ٹرکوں میں ٹرینوں میں بھر بھر کے ادھر لا پھینکا۔وہ مٹی میں دفن ہوئی جاتی تھی۔پھر ماں ٹرنک بناتے یوسف کو چھوڑ کر چلی گئی جو اس ملک کا نان لوکل تھا۔دوست یوسف کو تسلی دیتے رہے۔

عورت کے لیے تو جنت میں حوروں کی بجائے 72 سوکڑیں ہوتی ہیں اور وہی پرانا گھسا گھسایا کھڑکا ہوا شوہر۔نہ کوئی چوڑی گلی،نہ ہی کوئی بیوٹی پارلر،نہ ہی گولڈسٹی کہ شاپنگ کا شوق پورا کریں۔

پھر صرف ان دوستوں کی جنریشن باقی بچی۔اس کے بعد ان کے بھی سر اترنے لگے۔اشرف،ضمیر،معین،فرید،فیضو اور پھر یوسف! اس کے بچپن کا آخری دوست بھی بچھڑ گیا۔

ہوائیں سائیں سائیں کرنے لگیں۔دور دیسوں سے چلی آئیں،اس نے عید کے دوسرے روز کرولا پہ اتاری گئی تصویر نکالی۔سبھی ختم ہو چکے تھے۔اپنی مسکراہٹوں عید والے کپڑوں سمیت،دوست کے مرتے ہی زندگی کا وہ حصّہ بھی مرجاتا ہے۔اس دور حیات کا حصّہ اس کا گواہ چلا جاتا ہے۔جب وہ یوسف کے ہاں پہنچا تو سارے ہی چہرے اجنبی تھے۔وہ صرف یوسف کے بیٹے ہی کو پہچان پایا۔جسکا وہی چوکھٹا تھا۔قد البتہ نارمل تھا۔اس نے گھسے پٹے تعزیتی فقرے فضاء میں اچھالے۔میکانکی انداز میں ملاں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ملاں مسلسل عربی میں دعا کیئے جارہا تھا جسکا مفہوم کوئی نہیں جانتا تھا۔بس اتنا اندازہ تھا کہ جنت کا ٹکٹ کٹانے کی بات ہورہی ہے۔ملاں تو صرف دعا ہی مانگتا ہے پوپ تو صدیوں جنت کا الاٹمنٹ آرڈر ہی اپنے دستخطوں سے جاری کرتے رہے۔اس نے محسوس کیا کہ ملاں کے علاوہ سبھی موبائل پر میسجنگ کر رہے ہیں۔کوئی تعزیت کے لیے آتا تو موبائل چھوڑ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیتے۔فضاء میں بے دلی تھی لاتعلقی تھی۔وہ بوجھل قدموں سے اٹھ آیا۔

شام کے سائے پھیل چکے تھے۔وہ اپنا غم کسی سے کہنا چاہتا تھا۔اس کی بیوی دلچسپی سے ٹی وی پر شادی شادی والا ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔

''آج میرے بچپن کا دوست یوسف چل بسا''

اس کی بیوی ہیروئن کے آنسوؤں میں بہے جارہی تھی۔

''افسوس ہوا یہ سین دیکھ لوں پھر بات کرتے ہیں''

اس کی زبان بند ہوگئی۔

ملازم اپنے کاموں میں مگن تھے۔وہ کس سے بات کرے؟اس نے مایوسی سے سوچا۔کون ہوگا؟

معاً اسے چیخوف کا افسانہ Misery یعنی Tocka یاد آیا۔

اسے یوں لگا کہ جیسے افسانے کے مرکزی کردار Potapov Iona کی طرح کوئی بھی اس کی بات سننے کے لیے موجود نہیں،نہ ہی ذہنی طور پہ آمادہ ہے۔وہ کسی قدر غیر اہم ہو چکا ہے۔Iona تو پھر بھی گھوڑے سے غم بیان کرنے لگا تھا۔وہ پورچ میں نکل آیا۔ملگجی روشنی میں اس کی جیپ کھڑی تھی۔مگر وہ تو لوہے کی بے جان چیز تھی۔Iona کا گھوڑا تو پھر بھی حیوان تھا۔جاندار تھا۔احساسات کو سمجھتا ہی ہوگا۔لوہے کی جیپ بھلا کب سن سکتی ہے۔اس نے ہاتھ رکھا جیپ سرد تھی! سرد اور بے جان Chekhov Anton نے یہ افسانہ 1886 میں لکھا تھا۔137 برس قبل لوگ گھوڑوں سے غم بیان کر سکتے تھے مگر اب تو گھوڑے بھی نہیں رہے۔اس نے جیپ کو مخاطب کیا۔

''میرے بچپن کا دوست فوت ہوگیا۔تم تو میرے ساتھ رہتے ہو،تمہیں تو میرے دکھ کا اندازہ ہوگا''

اس نے جیپ کو پیار سے تھپتھپایا جیپ ویسی ہی سرد لاتعلق بے مہر تھی۔

''یوسف میرے بچپن کا دوست تھا،یوسف کے ساتھ ہی میری زندگی کا وہ دور بھی ختم ہو کے رہ گیا۔۔۔''

وہ ایک بے جان جیپ سے ہم کلام تھا۔

**عظمت**

بعض لوگ پیدائشی عظیم ہوتے ہیں،بعض جدوجہد کر کے عظیم بنتے ہیں اور بعض لوگوں پر عظمت مسلط کر دی جاتی ہے۔

ولیم شیکسپیئر

# ''اپاہج''

(ناول کا باب)

صادقہ نواب سحر

(بنگلور)

چھوٹے سے بنگلے کے دالان میں برتن، کپڑے دھونے کی موری کے پاس لکڑی کی چوکی پر ہاتھ میں چھری لئے ہوئے بیٹھا چاند اپنی سوچ میں گم تھا۔دور آسمان پر پرندوں کی لمبی قطار ہوائی جہاز کی شکل میں ایک لیڈر کی قیادت میں بڑے مزے سے اپنی منزل کو لوٹ رہی تھی۔چاند کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔آسمان کے گلابی رنگ میں وہ کھو گیا۔اچانک اسکے ہاتھ سے چھری پھسل گئی۔

''سی۔۔۔''اس کے منہ سے نکلا،اس کی نظر چھری پکڑے ہوئے ہاتھ سے چہرے تک پہنچ گئی، چچی مسکرا رہی تھیں۔

''کیوں رے اتنی سی ادرک بھی تجھ سے چھیلی نہیں گئی،کھانا نہیں کھانا ہے کیا؟؟۔۔۔تو اسے چھیلے گا،مسالہ پیسے گا،تب کھانا بنے گا نا؟؟''،انھوں نے چاند کے ہاتھ میں چھری تھما دی، پھر اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیلی چاند کے ہاتھ میں دے دی۔

''یہ لے گوشت!۔۔۔''درانتی پر میڈیم ٹکڑے کر کے دے۔''

اس کی نظریں آسمان سے سیدھے اپنی انگلیاں پر مرکوز ہو گئیں،جن کے جوڑوں؟؟؟پر چھری کے پچھلے حصے کی لکڑی کی موٹھ برس رہی تھی۔درد دے رہی تھی۔

''سی۔۔۔!''

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔سب تیار ہو رہے تھے چاروں بیٹوں نے اپنے جوتے چاند کے بستر کے قریب لا کر رکھ دئے تھے۔

''چاند بھیّا،ذرا یہ پالش کر کے رکھنا''سب سے چھوٹے بیٹے نے نرمی سے فرمائشی لہجے میں کہا،''کل پیر ہے۔اسکول ہے۔یہ جوتے پہننے ہیں۔یہ لیں پالش اور برش۔ذرا اچھا چمکا دینا۔''چاند جانتا تھا،یہ حکم ہی تھا۔

''اِس وقت کہاں جا رہے ہو بھائی؟؟''بڑے دونوں لڑکوں کو نئے ٹی شرٹس میں کمرے سے نکلتے دیکھ کر چاند نے دھیرے سے پوچھا۔

''فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔''

''میں بھی چلوں؟؟اتنے بڑے گھر میں۔۔۔میں اکیلا۔۔۔میں۔۔۔؟؟''

''کیا بھوت پکڑ لے گا تجھے؟؟۔۔۔''سب ہنسنے لگے۔

''پکڑ لیا تو بھوت بھوت کھیل لینا۔''

''مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''ہم بھی تو اکیلے رہتے ہیں۔''

''اب عادت ڈال لے۔تو لڑکا ہے یا لڑکی۔۔۔؟؟''

دھیرے دھیرے آسمان اندھیرے کی چادر اوڑھ کر سونے لگا۔اکیلے گھر میں چاند عجیب سا محسوس کرنے لگا۔اس نے دروازے کے پاس پڑی کپڑے سکھانے کی ایک لکڑی اُٹھالی۔سوئچ بورڈ پر لگے بٹنوں کو باری باری آن کرنے لگا اور اُجالا ہو گیا۔وہ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔کھڑکی سے درختوں کی شاخوں اور پتوں کے ہلتے ہوئے مہیب سائے،کاروں کی روشنی میں تارکول کی چمکتی ہوئی سڑکیں،بنگلے کے پچھواڑے خالی پلاٹ میں اُگی جنگلی جھاڑیوں سے کیڑوں کی آوازیں۔۔۔اس کا دل دہلانے لگیں۔اسے بھوک بھی لگنے لگی تھی۔کھانا کچن ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ہال کی گھڑی بند تھی۔اس نے ایک کرسی گھسیٹ کر کچن ٹیبل کے قریب گھما لی۔اپنا دایاں ہاتھ کرسی کی سیٹ پر جمایا اور بائیں ہاتھ کی مدد سے امیبا کی طرح اپنے جسم کو کرسی پر کھینچ لیا،پتیلوں کے ڈھکن ہٹاتے ہی سارے میں بگھارا چاول اور قورمہ کی خوشبو پھیل گئی۔

پاس ہی اوندھے پڑے ہوئے پیالے میں تھوڑا سا کھانا اور سالن لے کر اس نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ دروازے میں چابی لگانے کی آواز آئی۔اس نے کھانے سے ہاتھ روک لیا اور اپنا ایک پیر زمین پر رکھا۔پھر دایاں ہاتھ زمین پر ٹکایا اور اور اپنا باقی تمام جسم نیچے گھسیٹ لیا اور اسی طرح آگے بڑھتا ہوا دروازے کے پاس پہنچ گیا اور اس کی چٹخنی کھول دی۔چچی اور چاروں بیٹے ہنستے بولتے گھر میں داخل ہوئے۔چچی سیدھے کچن ٹیبل پر گئیں۔چولہے پر سالن کھانا گرم کرنے لگیں لیکن پیالے کے کھانے نے ان کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا۔ان کی تیوریاں چڑھ گئی مگر چپ رہیں۔

دونوں چھوٹے چچیرے بھائی اس کا مذاق اُڑاتے،اُسے چھیڑتے لیکن جب وہ آنگن میں کرکٹ کھیلتے ہیں تب اُسے امپائر بناتے۔وہ اسی بات پر خوش رہتا بلکہ یہی وہ لمحے تھے جس میں وہ اپنے آپ کو بھول جاتا تھا اور خود کو اہم سمجھنے لگتا تھا۔

امتحان کا رزلٹ آیا۔چھوٹے دونوں بیٹوں کے رزلٹ خراب آئے۔

''ہمارا چھوٹا تیری وجہ سے فیل ہوتا ہے۔تو ما نجھا دیتا ہے اس لئے یہ پورا ٹائم پتنگ اُڑاتا ہے۔''

''ممبئی سے آ کر ہمارے بچوں کو بگاڑ دیا۔تیری وجہ سے ہی گلی محلے کے لڑکے یہاں فٹ بال کھیلتے ہیں۔''وہ پلٹیں اور بڑبڑانے لگیں،''غلطی اس کے باپ کی اور بھگتیں ہمارے بچے۔۔۔!!''

چاند اکیلا بیٹھا ہوا دعا کرتا تھا۔

''یہاں سے کیسے بھی نکال دے اللہ۔۔۔!''

''تو ماں کے پاس کیوں نہیں جاتا؟؟ وہی گھر تمھارے لئے اچھا ہے۔''۔۔۔اس کا ننھا دوست مونٹو بولا۔

''کیسے جاؤں!وہاں تو ایک ٹائم کے کھانے کے واندے ہیں۔''

''جو پیٹ بھر کھانا دے وہی گھر اچھا لگے گا۔''

''ہاں،یہ وقت ایسا ہی ہے۔''وہ اپنے آپ میں بڑبڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

''اس کے آنے سے ہمارے گھر میں مصیبت آ گئی ہے۔اس کو بھیج

دو''، چاند نے سنا۔ چچی فون پر چاچا سے بات کر رہی تھیں، ''آپ تو اپنی بہن کے گھر ممبئی میں ہیں۔ اس کا بھائی بھی تو وہیں رہ رہا ہے۔ وہیں رکھوا دیتے اِس کو بھی۔ ہم ہی ہیں کیا؟ برتنوں میں ہاتھ ڈال کر کھاتا ہے۔۔۔ میرے پاس پیسے نہیں اس کو کھلانے کو۔''

پتہ نہیں چچا جان نے کیا کہا ہوگا لیکن چچی جان مطمئن تھیں۔ وہ اس کے قریب آئیں۔ دھیرے سے بولیں،

''آج کام والی نہیں آئی، تو برتن دھو سکتا ہے کیا؟؟''

اسی شام چاند اور بڑے بیٹے کو ساتھ لے کر چچی یتیم خانے گئی۔

''اس کے ماں باپ مر چکے ہیں، سنبھالنے والا کوئی نہیں۔''

''یہ اپاہج ہے۔''

یہاں لڑکوں کو نہانا، دھونا، اپنے کپڑے دھونا، سارے کام اپنے ہاتھ سے کرنے پڑتا ہے۔ ہم اسے نہیں رکھ سکتے، دوسرے بچے اُسے ستائیں گے۔ ہم کہاں تک دیکھ بھال کریں گے۔''

''لیکن۔۔۔''

''نہیں، یہ ابھی چھوٹا ہے۔''

''تو کیا یتیم خانے اپاہجوں کے لئے نہیں ہوتے!''

چچی کو غصہ آیا تھا۔ دونوں ماں بیٹا چاند کو لے کر گھر لوٹ آئے۔

''تو صبح صبح اُٹھ کر نہا لینا اور تیار ہو جانا۔'' چاچی نے رات کو کھانے کے بعد اس سے کہا۔ وہ چپ رہا۔

رات بھر اس کے ذہن میں بُرے بُرے اور عجیب عجیب سے خیال آ رہے تھے۔ صبح چاچی کی ناشتے کی تیاری اس کی بھوک کو بڑھا رہی تھی۔ چچی نے اسے تین روٹیاں چائے کے ساتھ دے دیں۔ اس کا پیٹ بھر گیا۔ نیند آنے لگی ہی تھی کہ بڑے لڑکے نے آواز دی،

''جوتے پہن اور چل۔''

تینوں بس میں بیٹھے تھے لیکن جب بس ہلنے لگی تب دونوں ماں بیٹا اُتر گئے۔ وہ گھبرا گیا۔ بس نکل چکی تھی۔

''چچی جان!! بھیا!!''، وہ کھڑکی سے جھانک کر چلّایا۔

''بیٹا تیری سیٹ پر تھیلی ہے۔ اس میں کھٹا بگھارا کھانا ہے، دوپہر میں کھا لینا۔ دن کے اُجالے میں تو ممبئی پہنچ جائے گا۔''

چاند بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے کنڈکٹر کو آواز لگائی۔ ''انکل میں جانا نہیں چاہتا۔ مجھے یہاں اُتار دو۔''

کنڈکٹر بس کے پچھلے حصے میں مسافروں کی ٹکٹیں کاٹ رہا تھا۔

''وہ بچہ کچھ بول رہا ہے۔'' کسی نے کنڈکٹر کو اشارہ کیا۔ اس نے دھیان نہیں دیا اور بس دھیرے دھیرے شہر کے دوسرے حصے کی طرف بڑھ گئی۔ چلتی بس میں وہ سیٹ سے اُتر کر کنڈکٹر کی طرف جا نہیں پایا تھا۔

بیلگام میں کنڈکٹر بدل گیا۔

''ٹکٹ!'' دوسرا کنڈکٹر بس میں آتے ہی ٹکٹیں چیک کرنے لگا۔ چچی اس کے جیب میں ٹکٹ اور پھوپھی کا پتہ ڈال گئی تھیں۔

''یہ تو آدھا ہے۔''۔۔۔ وہ مراٹھی میں بول رہا تھا۔ ''اس لڑکے نے آدھا ٹکٹ نکالا ہے، ساتھ میں کوئی ہے کیا؟''

''یہ بیگ کس کا ہے۔۔۔؟؟''

''میرا ہے''۔۔۔ وہ چونکا تھا۔

وہ تو اپنے ساتھ بیگ لے کر نہیں آیا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب وہ چچا کے گھر ہی نہیں شہر سے بھی نکالا جا چکا ہے۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر بس میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے چندہ دے کر اس کی ٹکٹ پوری کروا دی۔ کنڈکٹر نے ٹکٹ بدل کر دوسرا ٹکٹ دے دیا۔

دوپہر میں بہت بھوک لگی تو اس نے تھیلی میں سے کھانا نکال کر کھا لیا۔ جیب سے رومال نکال کر ہاتھ اور منہ صاف کیا۔ رومال ہلدی اور تیل کے داغ سے گندا ہو گیا۔ کھانے کے تھیلی میں ہی پانی کی ایک چھوٹی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بوتل اپنے پاس رکھ لی اور کھانے کی تھیلی بچے ہوئے کھانے کے ساتھ تیزی سے چلتی ہوئی بس کی کھڑکی سے باہر پھینک دی۔

صبح سویرے بس ممبئی پونے ایکسپریس نیشنل ہائی وے سے گزرتے ہوئے کھنڈالا بس اسٹینڈ پر جا رکی۔ لوگوں کی مدد سے اس نے ایک رکشا میں اپنا سامان رکھوایا اور پھوپھی کے گھر کی طرف نکل گیا۔ پھوپھی اور ان کے بچے بہت خوش ہوئے۔

''ارے ستّے تو۔۔۔! اتنی دور سے تو کیسے آ گیا۔۔۔؟؟''

پھپھیرے بھائی ہنس رہے تھے۔

''میں چچا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''چچا تو بنگلور چلے گئے۔''

''کب؟''

''آج صبح کی گاڑی سے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ گھر جانا چاہتے تھے۔''

آٹھ دن گزر گئے۔ پھوپھی کے نام چاچی کا خط آیا۔ خط اردو میں تھا۔ پھوپھی پڑھنے لگیں۔

''میں چاند کو بھیج رہی ہوں۔ معذور ہے۔ میرا تبلیغ کے سلسلے میں اِدھر اُدھر آنا جانا چلتا رہتا ہے۔ لڑکے بھی باہر رہتے ہیں۔ وہ اکیلا گھر میں پریشان ہوتا رہتا ہے۔ اس کی پریشانی دیکھی نہیں گئی اس لئے بس میں بٹھا دیا۔ کھنڈالا بس اسٹینڈ سے کسی رکشا والے سے کہا تو گھر پہنچا دے گا۔ ٹکٹ نکال دیا ہے اور رکشا کے پیسے دے کر بھیج رہی ہوں۔''

خط سن کر سب ہنسنے لگے۔

''مجھے یہاں آئے ہفتہ گزر گیا۔ چاچا نے خبر بھی نہیں لی کہ یہاں پہنچا کہ پاکستان پہنچا!'' چاند نے کہا اور اپنے پنجوں سے اپنی ڈھیلی ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

# بچے ہمارے عہد کے۔۔۔!

رینو بہل
(چنڈی گڑھ)

**محلے** کی عورتیں شیطان چوکڑی کی شرارتوں سے عاجز آ چکی ہیں۔ سردی ہو یا گرمی یا تو سائیکل پر محلے بھر میں چکر کاٹتے اُدھم گُو دمچاتے پھریں گے یا بیچ محلے میں کرکٹ کھیلتے وقت آس پاس کے گھروں کے شیشے توڑ دیں گے۔ کس گھر میں کون سا پھل لگا ہے اس کی فہرست اُنکے پاس موجود ہے۔ پھل پکنے سے پہلے ہی درخت سے پھل کا نام ونشان غائب ہوجاتا ہے۔ صبح اُٹھنے پر پتا چلتا ہے کہ ایک گھر کے گملے دوسرے گھر اور دوسرے گھر کے گملے چوتھے گھر پہنچ چکے ہیں۔ کبھی تپتی گرمی کی دوپہر تو کبھی ٹھٹھرتی سردی کی رات کو کسی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر بھاگ جائیں گے تو کبھی لوگوں کی ڈاک ہی بدل دیں گے۔ اس چنڈال چوکڑی کا سربراہ کوئی اور نہیں تیرہ سال کا ٹیڈی ہی ہے۔ اس کی طبیعت میں سرکشی اور بغاوت کے عناصر صاف نظر آتے ہیں۔ اپنے سے چھوٹے عمر کے بچوں پر رعب جماتا ہے تو اپنے سے بڑی عمر کے لڑکوں کے پیچھے دُم ہلاتا پھرتا ہے۔ میرے بیٹے راگھو سے وہ تین سال چھوٹا ہے اور موقع ملتے ہی اُس کے پاس ''بھائی بھائی'' کہتا چلا آتا ہے۔ ماں کسی پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرتی ہے اور سُنا ہے باپ نے کئی کاروبار شروع کیے اور ہر بار رقم ڈبو کر ہاتھ جھاڑ دیئے۔ معلوم نہیں اب کچھ کام دھندا کرتا ہے یا نہیں مگر شراب اور شباب کا رسیا ہے۔ گھر کی ساری ذمہ داری ماں کے کاندھوں پر ہے۔ دن رات کو ہلو کے بیل کی طرح کام کرنا اور رات کو نکمے شوہر سے ہڈیاں توڑوانا اس کا نصیب بن چکا ہے۔ سندور اور منگل سوتر قائم رکھنے کی ہر روز اُسے بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ اس شجر پر کبھی بہار آئی ہی نہ ہو جیسے خزاں نے مستقل ڈیرہ ڈال لیا ہو۔ زندگی کی اندھیری گلیوں سے نکلنے کی اُسے اُمید کی ایک ہی کرن نظر آتی ہے اُس کی اکلوتی اُولاد ٹیڈی۔

اُس کی چھوٹی چھوٹی نیلی گہری آنکھوں میں بہت سے رنگ رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ شوخی اور شرارت کا رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ معصومیت بھولا پن کا دور دور تک نام ونشاں نہیں۔ بالشت بھر کا یہ لڑکا ایک طرح سے بے چین بوٹی ہے۔ بڑے بڑوں کے کان کترنا اور پلک جھپکتے اُلّو بنانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہر چیز کو جاننے کا تجسس، ہر بات کو سمجھنے کا اشتیاق۔ گھر سے نکلتا ہے تو کان کھڑے رہتے ہیں اور نظریں چاروں طرف چوکس گھومتی ہیں۔ پھر بتلا اتنا کہ پلک جھپکتے یہاں اور پلک جھپکتے گلی کے نکڑ پر دکھائی دے گا۔ محلے کے ہر چھوٹے بڑے سے اٹ کھڑکا میں وہ شامل ضرور ہوتا ہے۔ ماں صبح کی گئی شام کو گھر لوٹتی ہے اور باپ کے گھر آنے جانے کا کوئی وقت نہیں لہٰذا سارا دن آوارہ بیل کی طرح اِدھر اُدھر مٹر گشتی کرتا نظر آتا ہے۔ سارے محلے کی اُسے خبر ہوتی ہے۔ ایک روز مسز سچدیوا کے گھر یہ کہنے چلا گیا کہ ''اپنی بیٹی کو سنبھال لو آج کل لڑکوں کے ساتھ بہت گھومتی ہے۔'' کالج میں پڑھتی رشمی یہ سنتے ہی ڈنڈا لے کر اُس کے پیچھے بھاگی ''تو ہوتا کون ہے میرے بارے میں اس طرح بات کرنے والا۔'' سارے محلے نے اس کو پٹتے دیکھا تھا مگر وہ ٹھہرا چکنا گھڑا جس پر کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

اُس روز دوپہر میں اچانک بجلی گُل ہوجانے کی وجہ سے پنکھا، اے سی بند ہوتے ہی باہر شور وغل کی آوازیں سن کر میں باہر نکلی۔ مسز سچدیوا پھر بچوں سے اُلجھ رہی تھیں۔ سبھی بچے منہ میں ہنسی دبائے خاموش کھڑے اُن کی پھٹکار سُن رہے تھے اور ٹیڈی اپنی صفائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے مسز سچدیوا کو بیچ میں ہی ٹوک کر بجلی کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

''ہماری بجلی تو ہے۔''

''آنٹی آپ کا فیوز اُڑ گیا ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی تیر کی طرح وہ میرے قریب سے نکل کر میرے گھر میں گھس گیا۔ میں بڑبڑاتی اُس کے پیچھے لپکی۔

''تم رہنے دو تمہیں نہیں پتا چلے گا۔''

''مجھے فیوز لگانا آتا ہے آنٹی۔ آپ دیکھتی جائیں۔''

میرے منع کرنے کے باوجود وہ پورے اعتماد کے ساتھ بجلی کے میٹر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ میرا دل خوف سے دھڑک رہا تھا کہ یہ بچہ بھلا کیا ہی فیوز لگائے گا۔ یہ شیطان کی آنت کہیں میرے لیے کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔ دو منٹ بعد ہاتھ جھاڑ کر اُس نے بٹن آن کیا تو بجلی لوٹ آئی۔ مسکراتا ہوا میرے قریب آ کر بولا:

''میں نے کہا تھا نہ مجھے سب آتا ہے۔''

''کہاں سے سیکھا تم نے؟'' مجھے اُس کی کامیابی پر حیرت ہوئی۔

''بس مجھے آتا ہے۔'' شیخی بگھارتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔

میں نے الماری سے چاکلیٹ نکالیں اور بطور شکریہ اُس کی اور بڑھا دیں۔

''یہ تو بچے کھاتے ہیں۔ میں نہیں کھاتا۔'' اُس نے کاندھے اُچکا کر کہا۔

''تم بھی تو بچے ہو''

شریر مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیل گئی جیسے میری بات کا مذاق اُڑا رہا ہو۔

''آنٹی کبھی بھی کوئی کام ہو تو ٹیڈی کو یاد کرنا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے پیار سے اُس کے بال بکھیر دیئے۔ میرا ہاتھ جھٹکے سے پیچھے کر کے اپنے بال سنوارتے ہوئے باہر کھڑے لڑکوں کے پاس پہنچ گیا۔

اُس کی عمر اور اُس کی ذہانت اور قابلیت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اُس روز مجھے گاڑی سٹارٹ کرنے کے لیے بار بار سیلف مارتے دیکھ کر نہ جانے کدھر سے ٹپک پڑا۔

''آنٹی گاڑی کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی ہے۔ دھکا لگا کر سٹارٹ ہوگی۔''

میں نے اُس کی بات ان سنی کر دی۔

''آنٹی میں سٹارٹ کروں؟'' گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اُس نے کہا۔

''رہنے دے بیٹا یہ بچوں کا کام نہیں۔ جاؤ کھیلو جا کر میں دیکھ لوں گی۔''

میں نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے دروازہ بند کرتے کہا۔

''آنتی یہ ایسے سٹارٹ نہیں ہو گی۔ میں دھکا لگاتا ہوں آپ ریس دینا۔'' میری بات سنے بنا وہ گاڑی کو دھکا لگانے لگا۔ جیسے ہی گاڑی آگے رینگی مجبوراً میں نے ریس دے دی۔ گاڑی سٹارٹ ہوگئی۔ میں نے دھیرے دھیرے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ دوڑ کر میری گاڑی کے قریب آ گیا۔

''ابھی گاڑی بند مت کرنا۔ روک کر بے شک ریس دیتے رہیں۔''

اُس نے جیسا کہا میں نے کیا۔ کئی دنوں بعد گاڑی سٹارٹ کی تھی شاید اسی وجہ سے بیٹری ڈاؤن ہوگئی۔ فتحیاب مسکراہٹ اُس کے چہرے پر رقص کر رہی تھی۔

''مجھے گاڑی چلانی آتی ہے میں چلاؤں؟''

''تم؟ اپنی عمر دیکھی ہے؟''

''تو کیا ہوا آنٹی۔ مجھے سکوٹر، گاڑی سب چلانی آتی ہے آپ راگھو بھائی سے پوچھ لینا۔''

اُس کا بس چلتا تو مجھے گاڑی سے اُتار کو خود گاڑی چلانے لگتا۔ میں نے سختی سے منع کر کے گاڑی کو گیر میں ڈالا اور وہاں سے نکل گئی۔

میں دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ یہ لڑکا تو چلتا پرزہ ہے۔ اس کی چستی، پھرتی اور ذہانت کا صحیح استعمال ہونا بڑا ضروری ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ ایک روز اس کی ماں سے ضرور ملوں گی اور مشورہ دوں گی کہ اسے ملٹری سکول میں بھیجنے کی سوچے یا پھر بڑا ہو کر یہ پولیس کی نوکری کر لے۔ اگر اسے بے لگام گھوڑے کی طرح کھلا چھوڑ دیا تو کل کو اس کی ساری قوت غلط راستے پر نکل کر ضائع ہو جائے گی۔

کل شام کو جب میں بازار سے لوٹ رہی تھی تو مجھے دھندلکے میں نکڑ کی دکان کی اوٹ میں تین لڑکے کھڑے دکھائی دیئے جو باری باری سگریٹ کے لمبے لمبے کش بھرتے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ مجھے لگا راگھو بھی اُن میں ہے۔ میں دبے پاؤں اُن کے قریب پہنچ گئی۔ راگھو تو اُن میں نہیں تھا البتہ ٹیڈی کو کش پر کش لگاتے دیکھ لیا۔ مجھے دیکھ کر نہ وہ گھبرایا اور نہ شرمندہ ہوا۔ باقی دونوں لڑکے دُم دبا کر وہاں سے بھاگ گئے مگر وہ اسی طرح بے شرموں کی طرح مسکراتا رہا۔

''یہ کام بھی شروع کر دیا؟'' میں نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

جی تو چاہا اُس کے کان مروڑ دوں مگر اُس کی ڈھٹائی دیکھ کر نہ جانے کیوں خود کو روک لیا۔

میں نے گھر آتے ہی راگھو کی کلاس لے لی۔

''کیا تم بھی سگریٹ پینے لگے ہو ٹیڈی کی طرح؟''

''کون؟ میں؟ آپ مجھے ٹیڈی سے ملا رہی ہیں؟ وہ تو سب کام کرتا ہے، اس کا کیا۔ آپ نے مجھے اُس جیسا کیسے سمجھ لیا؟'' غصہ اور ناراضگی دونوں اُس کے لہجے میں شامل تھی۔

''تم لوگوں کے ساتھ گھومتا ہے۔ اس لیے پوچھ لیا۔'' میرا لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔

''اس کا موازنہ کسی سے نہ کریئے۔ وہ اپنی طرح کا الگ ہی شخص ہے۔ سب اُسے سمجھاتے ہیں مگر وہ سنتا کسی کی نہیں۔ وہ تو چوری چھپے اپنے پاپا کی بوتل سے شراب نکال کر پانی ملا کر رکھ دیتا ہے تا کہ انہیں پتا نہ چلے۔''

وہ تو بات کہہ کر نکل گیا مگر دیر تک مجھے اپنے کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہوتا رہا۔

دوپہر کو کھانے کے بعد سُستا رہی تھی کہ راگھو کے ساتھ ٹیڈی بھی گھر آ گیا۔ اُس کے چہرے اور گھٹنے پر چوٹ لگی تھی۔ راگھو نے بتایا کہ کوئی کار والا اس کی سائیکل کو ٹکر مار گیا اور وہ سڑک پر اوندھے منہ جا گرا۔ پہلی بار میں نے اسے بچوں کی طرح روتے دیکھا۔

''اتنا بڑا ہو کر بچوں کی طرح کیوں رو رہا ہے؟''

''کبھی مجھے بچہ کہتی ہیں تو کبھی بڑا۔ سوچ لیں میں بچہ ہوں یا بڑا۔'' روتے روتے جواب دینے سے باز نہیں آیا۔

راگھو نے ڈیٹول لا کر دی تو میں نے زخم صاف کرتے کرتے اُسے چپ کرانے کی کوشش کی مگر اُس کا رونا بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اُسے رونا چوٹ لگنے پر نہیں آ رہا تھا بلکہ اس لیے رو رہا تھا کہ گاڑی والا بچ کر نکل گیا اور وہ اس کی گاڑی کا نمبر بھی نوٹ نہیں کر پایا۔

دوا لگنے کے بعد راگھو ڈیٹول اور دوا رکھنے اور اُس کے لیے پانی لینے اندر چلا گیا۔ میں نے پیار سے اُس کے چہرے سے بال پیچھے کرتے اپنی ساڑی کے پلو سے اُس کے بہتے آنسو صاف کیے اور اُسے سینے سے لگا کر چپ کرانے لگی۔ وہ مجھ سے لپٹ کر روئے جا رہا تھا۔ ممتا تڑپ کر اُسے پچکارنے لگی۔ آہستہ آہستہ اُس کی ہچکیاں سسکیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔

اچانک مجھے اپنے سینے میں جُوں رینگتی محسوس ہوئی ایسا لگا جیسے میں نے بجلی کی ننگی تاروں کو چھو لیا ہو۔ میں نے جھٹکے سے اُسے خود سے الگ کیا اور حیرت سے اُس کے چہرے پر میری نگاہیں گڑ گئیں۔ چند ساعتوں قبل نظر آنے والا شریر بچہ یکا یک شیطان کا روپ دھار چکا تھا۔

''یہ کیا کر رہا تھا؟'' میں نے اس کا کان مروڑتے ہوئے غصّے سے پوچھا۔

''وہ ہی جو سب کرتے ہیں'' لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بے حیائی سے اُس نے جواب دیا۔ اُس کی نیلی گہری آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

''سب کی چھوڑ تُو اپنی بتا۔ تو نے یہ سب کہاں سے سیکھا؟''

اُس کے کان پر میری پکڑ اور مضبوط ہوگئی تھی اور لہجہ بھی کرخت ہو گیا۔

پہلے تو اُس نے آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی مگر جب میں نے کان اور زور سے مروڑ کر پوچھا:

''میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں؟''

''ارے بتاتا ہوں۔ کان تو چھوڑ دے پہلے۔''

''نہیں۔ تو پہلے بتا۔''

''روز دیکھتا ہوں۔''

''کسے دیکھتا ہو؟'' میں نے جھلا کر پوچھا۔

''اپنے باپ کو اور کسے''

میری پکڑ ڈھیلی پڑتے ہی آندھی کی طرح وہ کمرے سے بھاگ کر نکل گیا۔

# تھکن کا سفر

ناصر علی سید
(پشاور)

اسی وقت بارش تو رُک گئی تھی۔ مگر ہوا میں نمی کی وجہ سے ہلکی سی خنکی ایک لطف دے رہی تھی اس لئے میں پیدل ہی اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا تھا۔ بازار سے ذرا آگے دائیں طرف کو مڑتے ہی سڑک کے ایک طرف تو نئی آبادی تھی مگر دوسری جانب سڑک سے بہت نیچے کھیت تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ پستی بھی ایک دن بلند ہو کر اچانک ایک جدید بستی کا روپ دھارنے لگے گی کہ شہر میں اب تو جس راستے پر دو ایک سال بعد جانا ہو تو وہاں کا جغرافیہ ہی تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ ابھی میں خود سے اس موضوع پر کچھ اور بات کرنا چاہتا تھا کہ میرے کاندھوں پر ایک زوردار ہاتھ پڑا۔

''ہیلو ڈاکٹر صاحب بڑے دنوں بعد دیکھا ہے'' میں نے مڑ کر دیکھا تو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ایک نوجوان مسکراتے ہوئے مصافحے کے لئے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے میں نے اس سے ہاتھ ملایا مگر وہ میرے لئے قطعاً اجنبی تھا لمبا سا قد' چہرے پر چھوٹے بڑے بے شمار سرخی مائل دانے' کلین شیو جو شاید ابھی ابھی کیا تھا کہ بعض دانوں سے خون اور پیپ رس رہی تھی۔ خوبصورت سبز آنکھوں میں بہت سا سرمہ جو ذرا ذرا سا گالوں پر بھی بہا ہوا تھا۔ گلے میں کئی ایک سفید کالے دھاگے اور تعویز میں نے ذرا سا دبا کر ہاتھ چھڑانا چاہا مگر اس نے پوری قوت سے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ گرم جوشی سے ہاتھ ملانے والے لوگ بہت پُرخلوص ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اس اجنبی نوجوان کا یہ خلوص مہنگا پڑ رہا تھا جس کے ہونٹوں پر تو مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں ایک بے نام سا کرب بھی دِکھ رہا تھا۔ اُس نے اچانک میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر صاحب تم ڈاکٹر ہو اور میں ایک بس کنڈیکٹر'' مجھے معلوم ہے تم مجھے نہیں جانتے ہو لیکن میں تمہیں جانتا ہوں تم ڈاکٹر ہو بڑے آدمی ہو۔ پتہ ہے بڑے لوگوں کو بہت لوگ جانتے ہیں اس لئے وہ لوگوں کو جاننے کے لئے پریشان نہیں ہوتے۔ تم ڈاکٹر ہو میں بس کنڈیکٹر ہوں میں گاڑی چلاتا ہوں تو لوگ مجھ پر ہنستے ہیں۔ میں اُسے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا اچانک وہ بائیں طرف بنے ہوئے ایک گھر کے قریب ایک ریڑھی والے کے پاس دوڑ کر گیا اور اس سے ہاتھ ملانا چاہا مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تو یہ دوڑ کر واپس ہنستا ہوا میرے پاس آ گیا اور میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا تم ڈاکٹر ہو میں بس کنڈیکٹر مگر یہ دنیا ساری پاگل ہے تم کو یاد ہے میں ایک دن ہسپتال تمہارے پاس آیا اور تم نے میرے ہاتھ پر پٹی باندھی تھی مگر میرے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ دیکھو نا یہ شریفو جب مجھے چائے دیتا ہے تو اس میں دودھ بالکل نہیں ڈالتا کہتا ہے تم نے کالی چائے مانگی ہے دودھ سے خراب ہو جائے گی پورا پاگل ہے۔ دودھ والی چائے کو کالی چائے بھی کہنے نہیں دیتا۔ سچی وہ پاگل ہے اور پھر سرگوشی میں کہنے لگا تمہیں پتہ ہے یہ دنیا ساری پاگل ہے تم ڈاکٹر اور میں بس کنڈیکٹر! میں اپنی بس کو دنیا سے دور رکھتا ہوں تم بھی دنیا سے فاصلے پر رہو گے تو میری طرح خوش رہو گے فاصلہ اچھا ہوتا ہے یہ کہہ کر وہ گھر رگھر رکر کے جیسے بس کو سٹارٹ کر کے ہوا میں سٹیرنگ گھماتا ہوا مجھ سے آگے نکل گیا مگر جلد ہی ایک لمبی سی ''چی'' کی آواز منہ سے نکال کر وہ رکا ہوا میں ریورس گیئر لگایا اور اُلٹے قدموں میرے پاس آ گیا اور کہنے لگا تم ڈاکٹر اور میں بس کنڈیکٹر آؤ میتری بس میں بیٹھو میں تم سے کوئی کرایہ نہیں لوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ تم نے میری پٹی کی تھی، تمہیں یاد ہے نا؟ بتاؤ نا۔ اچھا آؤ جلدی کرو بیٹھو۔ تم ڈاکٹر اور میں بس کنڈیکٹر۔۔ آ جاؤ میں نے آہستہ سے کہا کنڈیکٹر کا کام بس چلانا نہیں ہوتا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر میرے کانوں میں پھر سرگوشی کی گاڑیاں کنڈیکٹر ہی چلاتے ہیں۔ ڈرائیور بیچارے تو سواریوں سے پیسے لیتے ہیں تم ڈاکٹر میں بس کنڈیکٹر۔ شریفو پاگل ہے چائے میں مجھے دودھ ڈال کر نہیں دیتا۔ کالی چائے میں دودھ ڈالتے ہیں نا لوگ؟ تم تو ڈاکٹر ہو اور میں بس کنڈیکٹر۔ میں اُسے کہنا چاہتا ہوں کہ تم کچھ بھی سہی کوئی بھی سہی مگر میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ میں ایک کہانی کار ہوں مگر میں اُسے نہیں کہہ سکتا مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں گفتگو کے لئے اس نے جو ایک واسطہ تلاش کیا ہوا ہے اس کے ٹوٹنے سے اس کا دل نہ ٹوٹ جائے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں سڑک کے دائیں طرف ٹریفک کی حفاظت کے لئے جو چھوٹی چھوٹی دیواریں وقفے وقفے سے بنائی گئیں ہیں وہ ان پر چڑھ جاتا ہے۔ توازن کے لئے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے اور لہرا لہرا کبھی آہستہ کبھی تیز چلتا ہے، مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں رپٹ نہ جائے مگر وہ بے خوف چلا جا رہا ہے، پھر مجھے اشارے سے مجھے دیوار پر چڑھنے کو کہتا ہے میں سر ہلا کر انکار کرتا ہوں تو کہتا ہے ڈاکٹر صاحب اوپر آ جاؤ۔ سڑک پر پانی اور کیچڑ ہے کہیں تمہارے کپڑے خراب نہ ہو جائیں اور تم نے تو پتلون پہن کر رکھی ہے اس پر تو چار من صابن خرچ ہوتا ہو گا۔ پتہ ہے صابن بہت مہنگا ہو گیا ہے تم ڈاکٹر ہو میں بس کنڈیکٹر تمہارے کپڑے خراب نہیں ہونے چاہئیں ورنہ لوگ پھر تمہیں پاگل کہیں گے دنیا سے دور رہو یہ دنیا پاگل ہے شریفو بھی پاگل ہے چائے میں دودھ نہیں ڈالتا تم نے میری پٹی کی تھی۔ پٹی پر خون لگتا ہے تو پھر اسے صاف کرنے پر بھی صابن خرچ ہوتا ہے لوگ روزانہ میری بس کو خراب کر دیتے ہیں میں روز اسے دھوتا ہوں مگر میرے پاس صابن نہیں ہوتا نا بہت مہنگا ہو گیا ہے تم تو ڈاکٹر ہو تم مجھے سو من صابن لے کر دے سکتے ہو لے دو نا۔ میں اس دنیا کو دھونا چاہتا ہوں میں شریفو کو دھونا چاہتا ہوں۔ میں کالی چائے کو دھو کر سفید کرنا چاہتا ہوں اب وہ دیوار سے اتر آیا مجھے آگے بائیں طرف مڑنا تھا دائیں طرف اب پستی ختم ہو گئی تھی اور قبرستان شروع ہو گیا تھا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولا تم ڈاکٹر ہو میں بس کنڈیکٹر یہ دیکھ رہے ہو اس

باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ کیجئے

# بے گھری

اسرار گاندھی
(الہ آباد)

''پاپا میں اور سندھیا گھومنے کے لئے ساؤتھ انڈیا جارہے ہیں۔ پندرہ دن میں لوٹ آئیں گے۔ مجھے وشواس ہے کہ آپ اس وقت تک اس مکان میں رہنے کے لئے چلے جائیں گے، جسے میں نے آپ لوگوں کے لئے کرائے پر لے رکھا ہے۔''

''اچھا''

''ہاں''

''تمھارے کہنے کا مطلب ہے کہ میں اپنا مکان چھوڑ کر کرائے کے مکان میں رہنے کے لئے چلا جاؤں۔''

''ہاں''

''وہ کیوں موہن؟''

''یہاں اب مکان چھوٹا پڑنے لگا ہے۔ میں آئے دن پارٹی دیتا رہتا ہوں۔ مہمان آتے ہیں تو جگہ کم پڑ جاتی ہے۔ پھر آپ لوگوں کو کھانا بھی دیر میں مل پاتا ہے۔ اس لئے ہماری اور آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ نئے گھر میں چلے جائیں۔''

''تم خود کوئی بڑا مکان کرائے پر کیوں نہیں لے لیتے؟''

''اب آپ بوڑھے ہوگئے ہیں اور آپ کا دماغ بھی پوری طور پر کام نہیں کر رہا ہے۔ ایک بڑے مکان کے ہوتے ہوئے میں دوسرا کرائے پر کیوں لوں؟''

''اس لئے کہ یہ میرا مکان ہے اور میں کہیں اور نہیں جاؤں گا، سمجھے''

''آپ کا مکان کیسا؟'' اب یہ میرا ہے۔ کل کو جب آپ مر جائیں گے تو کاغذات پر میرا نام ہوگا۔''

''تو پھر میرے مرنے کا انتظار کرو۔''

''لگتا ہے کہ آپ سیدھی انگلی سے ماننے والے نہیں ہیں۔''

''ٹیڑھی انگلی کر کے دیکھو۔''

موہن کو باپ پر شدید غصہ آ گیا۔ بولا

''سن لیجئے، اگر آپ ٹیڑھی انگلی سے بھی نہیں مانیں گے تو دنیا سے جائیں گے۔ ماں جی! آپ بابو جی کو سمجھا لیجئے کہ وہ یہاں سے دوسرے والے مکان میں چلے جائیں۔''

''موہن تو ہوش میں نہیں ہے کیا؟ پیسے کی گرمی نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ باپ سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔''

''باپ اگر باپ کی طرح نہ رہے تو اسی طرح سے بات کی جاتی ہے۔'' وہ ماں کو گھورتا ہوا بولا۔

ایک لمحے کے بعد وہ پھر غرّا کر بولا ''ہم آج شام کو چلے جائیں، میری واپسی پر آپ لوگ یہاں نظر نہ آیئے گا۔''

پھر وہ پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بیٹے کی بات سن کر شنکر جی شرما سناٹے میں آ گئے۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ بیٹا ان کے یہاں سے چلے جانے یا پھر دنیا سے چلے جانے کی بات سوچ بھی سکتا ہے۔ انھیں چکر آنے لگا تو ایک قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔

رات موہن اور اس کی بیوی ماں باپ سے ملے بغیر ہی چلے گئے۔ اور ماں باپ نے ساری رات رو کر تڑپ کر گزاری تھی۔ وہ بار بار موہن کا ذکر کرتے اور ان دنوں کو یاد کر کے کہ جب موہن بچہ تھا، انھوں نے کتنے پیار سے اس کی پرورش کی تھی۔ وہ سسک پڑتے۔ انھوں نے کتنے چاؤ سے اسے پڑھایا لکھایا تھا اور آج وہی موہن اسے جان سے مارنے کی دھمکی دے کر ساؤتھ انڈیا موج مستی کرنے چلا گیا۔

سونے سے ذرا پہلے موہن کی ماں رتنا اپنے شوہر سے بولی۔ ''سنو جی! وہ جوہری دورا میں تمھارے دوست اشوک جی رہتے ہیں، فون کر کے ان سے مشورہ لے لو۔ وہ تو تمہارے بہت قریبی ہیں۔ شاید وہی کوئی راستہ نکال سکیں۔''

شنکر جی نے بیوی کو غور سے دیکھا اور بولے ''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ کل ان سے بات کروں گا۔ رتنا آج کے دکھ اور آنسوؤں نے میرے دل میں موہن کے لئے جو شدید محبت تھی اسے پوری طرح سے دھو ڈالا ہے۔ اب وہ میرے لئے بالکل ایسے ہی ہے جیسے دوسرے، بہت سے لوگ۔''

رتنا شنکر جی سے لپٹ گئی اور ایک بار پھر آنسوؤں کا ریلا دونوں کی آنکھوں سے باہر نکل آیا۔

اگلے دن صبح شنکر جی نے اشوک کو فون کیا۔ اشوک اس کا قریب ترین دوست تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ نوکری کی تھی، ایک ساتھ ریٹائر ہوئے تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اشوک ہری دوار چلا گیا تھا کہ وہیں اس کا خاندانی مکان تھا۔ وہیں اس کے خاندان کے تمام لوگ رہتے تھے۔

اگلے دن شنکر جی نے اشوک کو کال کی تو اشوک نے ہی فون اٹھایا۔ تو پھر بہت دیر تک باتیں ہوا کیں۔ اسی درمیان کسی کام سے رتنا کمرے کے اندر آئی تو انھوں نے پتی کو کہتے سنا ''اشوک تم اطمینان رکھو۔ اب میرے دل میں موہن کے لئے کوئی جگہ نہیں رہ گئی۔ اس کی طرف سے میرا دل بھی پتھر ہو گیا ہے۔''

چند دنوں کے بعد محلے کے لوگوں نے دیکھا کہ شنکر جی اور ان کی بیوی ایک چھوٹے سے ٹرک میں لدے پھندے کہیں جا رہے ہیں۔ وہ کسی بھی نہیں ملے اور نہ کسی کو یہ بتایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

شنکر جی کے جانے سے الہ آباد پر کوئی فرق نہیں۔ سب کچھ ویسے ہی رہا۔ بس محلے کے ان چند لوگوں کے دل میں ایک خلش ضرور باقی رہ گئی جن سے شنکر جی کے اچھے مراسم تھے۔ انھیں بس رہ رہ کر یہ بات ضرور چبھتی کہ شنکر جی اس طرح سے، اتنی خاموشی سے کیوں چلے گئے۔ ان لوگوں کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اور یہی شدید جھٹکا موہن کو بھی اس وقت لگا کہ وہ جب ساؤتھ سے گھوم کر گھر واپس آیا۔

اسے اپنے دروازے پر کسی اور کی نیم پلیٹ نظر آئی۔ وہ ہکا بکا اس نیم پلیٹ

کو گھور رہا تھا۔''دھرمیندر شرما'' وہ آہستہ سے بدبدایا۔ پھر کال بیل پر اپنا انگوٹھا رکھ دیا۔

بیل بجنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ پھر چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''فرمایئے۔''

''یہ مکان تو میرا ہے۔ آپ یہاں کیسے؟''

''ہاں! یہ مکان تو آپ کا تھا۔ لیکن اب نہیں۔ اب یہ میرا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ کے پتاجی یہ مکان میرے ہاتھ بیچ گئے ہیں۔'' موہن دھرمیندر شرما کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔

''یہ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں؟ میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔''

''ضرور بلایئے، لیکن بس ایک منٹ ٹھہر کر۔'' دھرمیندر گھر کے اندر واپس چلے گئے اور چند ہی لمحے میں واپس آ کر بولے

''یہ کاغذات لو، یہ اصلی کاغذات کا فوٹو اسٹیٹ ہے اسے پڑھ لو تو عقل صحیح جگہ پر آ جائے گی۔''

موہن نے کاغذات کے لئے ہاتھ آگے بڑھائے تو لیتے وقت کاغذات اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس طرح بکھر گئے جیسے اس کا گھر بکھر گیا تھا۔

''اب آپ یہاں سے جائیں اور ہاں، اس گھر کی کنجی بھی لیتے جائیں جہاں آپ اپنے پتاجی کو قید کرنا چاہتے تھے۔''

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور وقت کے ساتھ زندگی میں کتنی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ اب موہن پہلے جیسا نہ تھا اس میں بھی بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ خاموش رہنے لگا تھا اور زندگی ایمانداری کی کمائی پر گزار رہا تھا۔ کئی بار دوسرے ضرورت مندوں کے لئے کچھ نہ کچھ کر دیتا۔ موہن نے کرایے پر ایک بڑا سا مکان لے لیا، کار خرید لی تھی۔ اسی درمیان دو بچے بھی ہو گئے تھے، ایک بیٹا سنتوش اور ایک بیٹی سریتا۔

یوں پندرہ سال بیت گئے۔ بچے بڑے ہو گئے تھے۔ اب وہ بہت سے سوال کرنے لگے تھے۔ لیکن جب وہ اپنے دادا کے تعلق سے سوال کرتے تو موہن محسوس کرتا جیسے کوئی چیز اس کے حلق میں اٹک گئی ہو۔

سردی کی چھٹیاں آئیں تو سنتوش اور سریتا باپ کے پیچھے پڑ گئے کہ کہیں گھومنے چلئے۔ پھر یہ طے ہوا کہ وہ سب لوگ کار سے دہرادون چلیں گے اور وہیں سے ہریدوار ہوتے ہوئے واپس آ جائیں گے۔

ان دنوں کا موسم بہت شاندار تھا۔ لیکن اس موسم کے سبب وہاں باہر سے آنے والوں کی بھیڑ بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ تمام ہوٹل بھرے ہوئے تھے۔ موہن بڑی مشکلوں سے ایک مڈل کلاس ہوٹل میں ایک کمرہ حاصل کر سکا تھا۔ وہ دن بھر گھومتے پھرتے کبھی یہاں کبھی وہاں۔

تین دن کتنی تیزی سے گزر گئے انھیں اس کا پتا ہی نہیں چلا۔ ان تین دنوں میں انھوں نے ایک دن صبح سے شام تک مسوری میں بھی گزارا۔

مسوری میں کافی سردی تھی لیکن یہاں بھی ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ تھی۔

شام کو وہ دہرادون واپس لوٹ آئے۔ اور اگلے دن صبح وہ ہری دوار کے لئے نکل پڑے۔

اس نے ہری دوار میں داخل ہوتے ہی کار کی رفتار بہت کم کر دی تا کہ انھیں آسانی سے کوئی ہوٹل نظر آ سکے۔

دونوں بچے سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے سائن بورڈ پڑھ رہے تھے کہ سنتوش چلایا۔

''پاپا رک جایئے'' موہن نے کار روک دی۔

''کیا بات ہے؟''

''پاپا وہ سائن بورڈ دیکھئے۔''

موہن نے سائن بورڈ دیکھا۔

''شنکر جی شرما الہ آبادی ورڈھا آشرم'' بورڈ پڑھتے ہی موہن پر ایک کیفیت گزر گئی۔ اس کا پورا وجود شل ہو گیا۔

بڑی مشکل سے وہ کار آشرم کے گیٹ تک لایا۔ پھر وہ تھرتھراتے قدموں سے کار سے نیچے اترا۔ وہ آشرم کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا تو دیکھا اس خوبصورت سی عمارت کے لان پر کچھ لوگ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہیں۔

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آشرم کا کیئر ٹیکر پیچھے کی طرف ایک دوسری عمارت میں رہتا ہے۔

موہن آہستہ آہستہ قدموں سے پچھلی عمارت کی طرف چل پڑا۔

اس نے دروازے پر دستک دی تو چند لمحوں کے بعد ایک کافی بوڑھا آدمی دروازہ کھول کر باہر آیا۔ دونوں ایک دوسرے کو کچھ دیر تک غور سے دیکھتے رہے۔ پھر موہن بولا۔

''شری مان میں موہن شرما ہوں۔ اور آپ سے اس آشرم کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

''تم.....تم موہن شرما ہو، شنکر کے بیٹے؟''

''ہاں وہی کمینہ موہن۔''

اب موہن نے بھی انھیں پہچان لیا تھا۔ وہ اشوک چاچا تھے، جنھیں اس نے بچپن میں کئی بار دیکھا تھا۔ وہ بڑھا اور چاچا جی کہہ کر ان سے لپٹ گیا۔ دونوں دیر تک روتے رہے۔

پھر اشوک نے روتی ہوئی آواز میں بتایا کہ شنکر اور بھابی کار کے ایک حادثہ میں ختم ہو گئے تھے۔ پھر ان کی وصیت کے مطابق اس مکان کو ورڈھا آشرم بنا دیا گیا۔

وہ کئی گھنٹوں کے بعد اشوک چاچا کے گھر سے نکل کر پھر ورڈھا آشرم آ گئے۔ سامنے کے ہال میں اس کے پتا کی ایک قد آدم تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ موہن نے تصویر کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا اور آہستہ سے بولا ''مجھے معاف کر دو۔''

آشرم کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے موہن سندھیا سے بولا

''سندھیا! ایک دن مجھے اور تمھیں بھی شاید اسی آشرم میں آ کر رہنا ہو۔''

# "شوقِ وصال"

## پروین شاکر

(۲۴۔نومبر۱۹۵۲ء تا ۲۶۔دسمبر۱۹۹۴ء)

ملال ہے مگر اتنا ملال تھوڑی ہے
یہ آنکھ رونے کی شدت سے لال تھوڑی ہے

بس اپنے واسطے ہی فکر مند ہیں سب لوگ
یہاں کسی کو کسی کا خیال تھوڑی ہے

پروں کو کاٹ دیا ہے اڑان سے پہلے
یہ خوف ہجر ہے شوقِ وصال تھوڑی ہے

مزا تو تب ہے کہ ہار کے بھی ہنستے رہو
ہمیشہ جیت ہی جانا کمال تھوڑی ہے

لگانی پڑتی ہے ڈبی ابھرنے سے پہلے
غروب ہونے کا مطلب زوال تھوڑی ہے

○

## ولی عالم شاہین

(کینیڈا)

انجمن رکھتے ہیں تنہائی سی، خوش رہتے ہیں
خوش ہم اتنے ہیں کہ بے وجہ بھی خوش رہتے ہیں

جشن اک خواب کا ہے ، سبز ہو موسم کہ سفید
بے وطن آنکھ کے ہم حیرتی خوش رہتے ہیں

اب یہ خوش باشی ہی ٹھہری ہے تعاقب کا صلہ
دشت میں ایک صدا آئی تھی خوش رہتے ہیں

یاد کی ایک مصیبت ہے لفظوں کے بغیر
ختم ہوتی نہیں کم مائیگی خوش رہتے ہیں

جرم کی طرح چھپائے ہوئے ہم اپنا ہنر
کوئی ساعت ہو دل آزار بھی خوش رہتے ہیں

ہم نہ غالب نہ یگانہ کسی گنتی میں نہیں
سیر کر آئے ترے شہر کی خوش رہتے ہیں

تیرگی اتنی ہے ہم رکھتے ہیں خورشید اپنا
خاک میں مل کے تہِ خاک بھی خوش رہتے ہیں

اک تمنا سے کسی اور تمنا کے پرے
دیکھ کر وحشتِ آوارگی خوش رہتے ہیں

ہم بھی پچھتائے ہیں ناحق اُسے زحمت دے کر
ہے جنہیں غم کا سلیقہ وہی خوش رہتے ہیں

دیکھتے رہتے ہیں شاہین تماشا ہم بھی
انتقاماً، سرِ محفل سہی، خوش رہتے ہیں

○

## نسیم سحر
(راولپنڈی)

یادیں تازہ دم رہتی ہیں
میری آنکھیں نم رہتی ہیں

ایک ہجومِ غم ہے دل میں
خوشیاں اس میں کم رہتی ہیں

ہونٹوں پر مسکان ہے، لیکن
آنکھیں وقفِ غم رہتی ہیں

وہ جو شہرِ جاں سے گیا ہے
روشنیاں مدھم رہتی ہیں

چین مرا دل کیسے پائے؟
وہ زلفیں برہم رہتی ہیں

کانٹوں کی فصلیں کب یارو
مرہونِ موسم رہتی ہیں

جانے کیوں اب تیرگیوں میں
روشنیاں مدغم رہتی ہیں

نظریں چوکھٹ پر رہتی تھیں
لیکن اب کم کم رہتی ہیں

ٹیسیں دل سے اٹھنے والی
محرومِ مرہم رہتی ہیں

○

## قیصر نجفی
(کراچی)

سورج بن کے نکلنا سیکھو
شب کو دن میں بدلنا سیکھو

سب کچھ بدل گیا، تم بھی
وقت کے ساتھ چلنا سیکھو

خود کو قائم رکھنا ہے تو
ہر سانچے میں ڈھلنا سیکھو

تم بھی کندن بن سکتے ہو
آگ میں پہلے جلنا سیکھو

کب تک چلتے رہو گے تنہا
ساتھ کسی کے چلنا سیکھو

غم بھی کھلونے بن سکتے ہیں
غموں سے تم جو بہلنا سیکھو

شوق سے ٹھوکر کھاؤ قیصؔر
لیکن ساتھ سنبھلنا سیکھو

○

## ناصرہ زبیری

(کراچی)

کہیں منزل نے پُکارا، کہیں ساحل آئے
راہِ وحشت میں بڑے سخت مراحل آئے

جب بھی اِتراؤں کہ کوئی بھی نہیں مجھ جیسا
مِرے اندر سے کوئی میرے مقابل آئے

اکیلے کوئی نہ کرے وار ادھورا مجھ پر
اب جو آئے تو کوئی دُشمنِ کامل آئے

حاصلِ عشق کو تکمیلِ سفر جانا تھا
اس سے آگے بھی مگر کتنے مراحل آئے

جاگنا، سونا مِرا سب ہو رضا سے اُسکی
مجھ کو معمول بنانے مِرا عامل آئے

آگہی کا جنہیں دعویٰ تھا اُنہیں دیکھ چکے
اب ہمیں علم سکھانے کوئی جاہل آئے

بے رُخی ہاتھ لگی ، سرد نگاہی پائی
اُن کو دعویٰ تھا عنائت کا، سو ہم مِل آئے!

○

## اشرف جاوید

(لاہور)

اقرار کی خو اُس کو ودیعت بھی نہیں ہے
ایسا بھی نہیں ہے کہ محبت بھی نہیں ہے

زخموں کو بھرے دیتا ہے اب وقت کا مرہم
لگتا ہے مسیحا کی ضرورت بھی نہیں ہے

مانگے کے چراغوں سے چراغاں نہیں ہوتا
اور اپنا جلانے کی سہولت بھی نہیں ہے

عشّاق ہیں، پھرتے ہیں فقط دید کی خاطر
کشکول کے لب پر کوئی حاجت بھی نہیں ہے

دہلیز پہ آ بیٹھا کوئی بھیس بدل کر!
جو دیکھ رہے ہو، وہ حقیقت بھی نہیں ہے

یادوں کے تسلّط میں بھی نیند آنے لگی ہے
اب آگ میں شدّت بھی، اذیّت بھی نہیں ہے

تحسین کریں کیسے ترے ظلم و کرم کی!
دامن میں گلِ سنگِ ملامت بھی نہیں ہے

کیا جانیے، کس واسطے پھرتا ہے زباں سے!
پہلے تو کوئی ایسی روایت بھی نہیں ہے

میں اپنی وفاؤں کی سزا کاٹ رہا ہوں
سر فخر سے اونچا ہے، ندامت بھی نہیں ہے

○

## خورشید طلب
(جمشید پور)

کسی بلا سے پریشان ساری خلقت ہے
"دعا کرو کہ دعا کی بہت ضرورت ہے"

جسے مٹانے پہ مامور ہے ہوائے نفس
یہ جسم ریت سے لکھی ہوئی عبارت ہے

مجھے بھی چاہیے اک چھت اسے بھی اک سایہ
ہمارے بیچ کا رشتہ یہی ضرورت ہے

الٹ دو خواب کو تعبیر سامنے ہو گی
سفید پھول کسی جنگ کی بشارت ہے

کچھ اور اس کے سوا مانگ لے مرے محبوب!
کہ زندگی مرے اللہ کی امانت ہے

اسی کے نام مری کامیابیاں ساری
مرے زوال کے پیچھے بھی ایک عورت ہے

تمام شہر کو صحرا بنا کے چھوڑیں گے
ہمارے شہر کے لوگوں میں اتنی وحشت ہے

بھلے ہی طور کی مانند خاک ہو جاؤں
بس ایک بار اسے دیکھنے کی حسرت ہے

طلبؔ غنیم ہمیں کیوں مٹانا چاہتا ہے
ہمارے دل میں تو سب کے لیے محبت ہے

○

## طارق نعیم
(اسلام آباد)

کبھی کبھی جو ذرا آئنہ اتارا گیا
مجھے لگا مری دیوار کا سہارا گیا

رواں دواں ہے کناروں کے دم سے یہ دریا
کہاں رہے گا اگر ایک بھی کنارہ گیا

بہت سے لوگ عدو کا گمان کرتے رہے
میں اپنے ساتھ کسی معرکے میں مارا گیا

غضب تو یہ ہے اسے کیمیا سکھاتے ہوئے
ہزار بار مجھے آگ سے گزارا گیا

جلے ہوئے مرے گھر کی کہانی کہتے ہوئے
ہوا کے ساتھ بہت دور تک شرارہ گیا

کہا گیا تھا کبھی اس طرف نہیں جانا
میں ایک بار تو کیا اس طرف دوبارہ گیا

بہت سے لوگ اندھیرے میں ہارے جاتے رہے
میں مطمئن ہوں مجھے روشنی میں ہارا گیا

اسی کے ساتھ عدالت کا وقت ختم ہوا
ہمارا نام کچھ ایسے سمے پکارا گیا

دل و نگاہ میں کوئی تو اک تعلق ہے
ذرا سا دھیان بٹا آنکھ سے نظارا گیا

مجھے یقیں ہے کہ اب صبح ہونے والی ہے
گزر کے جاں سے مرا آخری ستارہ گیا

○

## ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

خیالوں میں وہ جب آئے تو اکثر آنکھ بھر آئے
گزر جائے جہاں سے، وہ کہاں پھر لوٹ کر آئے

یہاں تھیں رونقیں کیسی، یہ اکثر یاد آتی ہیں
پلٹ کر جب کبھی دیکھا تو خالی گھر نظر آئے

حسیں منظر تھا، کیسی خوب تھی وہ محفلِ یاراں
نہ اب محفل وہ باقی ہے، نہ وہ منظر نظر آئے

یہ رشتے عارضی ہیں سب، تعلق بھی نہیں دائم
بنے تھے جو ہماری جاں، وفا وہ بھی نہ کر پائے

جو ہمدم ہیں سفر میں یاں، اچانک چھوڑ جائیں گے
یہی دستورِ دنیا ہے، نہ جانے کب خبر آئے

دلوں کو جوڑنے والے جہاں میں کم ہی ملتے ہیں
مگر دل توڑنے والے نظر میں سر بسر آئے

کٹھن ہے مرحلہ آگے، بہت دشوار ہے رستہ
ریاضؔ اس کو جو طے کر لو، جہانِ نَو نظر آئے

○

## نوید سروش

(میرپورخاص)

امیرِ شہر جو رستا سنوار جائے گا
غریبِ شہر کا پھر روزگار جائے گا

بہت غرور ہے تجھ کو اگر ذہانت پر
وہ تجھ کو حسنِ تکلم سے مار جائے گا

لرز رہا ہے اندھیروں کے خوف سے شاید
چراغِ راہ اُجالوں سے ہار جائے گا

وہ جس شہید کو دفنا دیا ہے سرحد پر
گھر اُس کے اب نہ کوئی خط نہ تار جائے گا

ہمارے درمیاں حالات خوش گوار ہیں اب
ہمارا قافلہ سرحد کے پار جائے گا

سروش فیصلے اپنے ہم آپ ہی کر لیں
لڑانے والوں کا پھر خالی وار جائے گا

○

# کالی آندھی، مصنف اور نجومی

ڈاکٹر اختر آزاد
(جمشید پور)

غیر مرئی فلکی طیارہ آسمان میں گردش کر رہا ہے۔

کالی آندھی کے شکار لوگ اس میں سوار ہیں۔

آسمانی حکمراں کی طرف سے کالی آندھی متاثرین کو نہایت اہم کام پر بھیجا گیا ہے کہ وہ پوری دنیا کا چکر لگا کر فہرست سازی کریں اور ان سب کی موت کن حالات میں ہوئی ہے اسے ری کریٹ کر کے اس کی ریکارڈنگ کریں تا کہ دنیا کے ختم ہونے کے بعد جب کبھی اسے نئے سرے سے آباد کیا جائے تو حال کے آئینے میں ماضی کا چہرہ سامنے رکھ کر یہ بتایا جا سکے کہ چاند و مریخ کے بعد زہرہ کو تسخیر کرنے کا ارادہ رکھنے والا انسان اپنی ایک ایک سانس کی حفاظت کے لئے کتنا بے بس اور مجبور دکھائی دے رہا تھا۔

بغیر پائیلٹ کے اس طیارے میں تمام روحیں سوار تھیں۔ان کی اصل شناخت ان کے دنیاوی کام اور نام کی بدولت تھی۔یہ اپنی مرضی سے جہاں چاہیں اُتر سکتی تھیں اور جب چاہیں طیارے میں سوار ہو سکتی تھیں۔یہ فلکی طیارہ بغیر آواز کئے زمیں کی سطح سے کچھ اوپر پرواز کرتا ہوا اپنے 'مشن کالی آندھی' پر رواں دواں تھا۔جس مقام سے گزرتا وہاں کی ریکارڈنگ کرتا جاتا۔لائیو ریکارڈنگ کرتے وقت آنکھوں کے سامنے خود بخود ایک اسکرین نمودار ہو جاتا۔ماضی کے حادثات واقعات کو آلہء وقت کی مدد سے آگے پیچھے کر کے دیکھا جا سکتا تھا۔دنیا کے جس کسی حصّے کی تصویر کو قید کرنا ہوتا، وہاں کا خیال ذہن میں آتے ہی طیّارہ سوچ رفتار سے بھی تیز، پلک جھپکتے اس مقام پر پہنچ جاتا اور وہاں کے مناظر کو اسکرین پر روشن کر دیتا۔

تخلیق آدم کے بعد دنیا میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ 'کالی آندھی' سے انسان اتنا خوف زدہ تھا۔ایسی آندھی اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔موت کو اتنے قریب سے دیکھ کر لوگوں کے اوسان خطا تھے۔افراتفری کے اس ماحول میں انسان جس طرح کی زندگی جینے پر مجبور تھا وہ اس کے وہم گُمان میں بھی نہیں تھا۔اس 'کالی آندھی' میں متاثرین کو ہر طرف ایک 'بلیک ہول' دکھائی دے رہا تھا۔جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہر لمحہ ہزاروں زندگیاں نگل رہا تھا۔پھر نہ کوئی ہنگامہ رہا نہ کوئی جوش، نہ کوئی جلسہ اور نہ ہی کوئی جلوس۔۔۔مذہبی عبادت گاہوں کے دروازے پر قفل لٹک گئے۔نہ اللہ اکبر کی صدائیں اور نہ ہی جئے شری رام کے نعرے۔گُردوارہ، چرچ، گومپا سبھی انسانوں سے خالی۔اگر کہیں رونق تھی، تو وہ قبرستان اور شمشان گھاٹ جیسی جگہیں تھیں۔لیکن یہاں بھی ایک طرح کی مارا ماری تھی۔جگہ تنگ ہو چکی تھی۔سب اپنے خاندان کے لئے جیتے جی جگہ محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔بکنگ کے لئے ایک ہوڑ لگی ہوئی تھی۔

ہم جن حالات میں جیتے ہیں اس کا عکس ہماری زندگی پر پڑتا ہے اور یہی عکس منعکس ہو کر کبھی کبھی ہماری زندگی کو روشن کر دیتا ہے اور کبھی کبھی تاریکی کی دنیا میں ڈھکیل دیتا ہے۔کالی آندھی کی وجہ سے جب حالات بد سے بدتر ہونے لگے اور انسان اس سے مفر کی تلاش کرنے لگا تو کائنات کی آنکھیں بھی بھیگنے لگی تھیں۔

مسلسل سفر اور کالی آندھی کی تصویری روداد کو محفوظ کرنے کا کام چوبیسوں گھنٹے جاری تھا۔لیکن اس دوران روحوں کے آرام کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔زیرو ہاور کے نام سے مختص اس لمحے میں روحیں طیارے میں لوٹ آتی تھیں اور کچھ دیر آرام کے بعد پھر سے تر و تازہ ہو کر اپنے مشن میں نکل پڑتی تھیں۔

اس زیرو ہاور میں زیادہ تر روحیں اپنی پسندیدہ کتابیں پڑھتی تھیں یا پھر پسندیدہ فلمیں، نغمے، ویڈیو گیمس اپنے اسکرین پر دیکھا کرتی تھیں۔ساتھ ہی ساتھ قصّہ سُننے اور سنانے کا دور بھی چلتا رہتا۔

اس وقت بھی 'کالی آندھی' کا قصّہ جاری تھا۔

ایک ایک کر کے قصّہ گو آتے جا رہے تھے اور اپنا درد بھرا قصہ سُنا کر اپنی جگہ پر بیٹھتے جا رہے تھے۔

ایک عجیب سا ماحول طاری تھا۔

قصّہ جاری تھا۔۔۔

ان قصوں کے درمیان بار بار ان کتابوں کا تذکرہ ہو رہا ہے جن میں 'کالی آندھی' سے ملتی جلتی چیزوں کا ذکر موجود تھا اور اسے لوگ پیشن گوئی کے طور پر دیکھ رہے تھے۔اس زیرو ہاور میں بہت ساری روحیں جنہوں نے قصداً اس طرح کی کتابیں پڑھی تھیں۔وہ سب کی سب ایک گروپ بنا کر انسانی شکل وصورت میں طیارے کے بیچوں بیچ بیٹھ گئیں۔

ان میں جو سب سے معمّر شخص تھا انہوں نے اپنی معمّری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے تمہید کا دستار اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''دوستو! انسان نے جب بولنا سیکھا اور اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا ضروری سمجھا تو زمانہ قبل مسیح میں اس نے نیل ندی کے کنارے سب سے پہلے انجیر اور شہتوت کے پیڑوں کی چھالوں پر لکھنا شروع کیا۔پھر چمڑے کپڑے اور پتھر کی سلیٹیں کام آئیں۔لیکن دوسری صدی کی ابتدائی دہائی میں تسائی لن نے کاغذ کی ایجاد کی جسے چین نے صدیوں دنیا سے چھپائے رکھا کہ یہ اہم کھوج آنے والے دنوں میں اس کی ترقی کی راہیں ہموار کرے گا۔''

اتنا کہہ کر ابھی وہ سانس لینے کے لئے رکے ہی تھے کہ اس وقفے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے عمر رسیدہ شخص نے اپنا جنرل نالج سامنے رکھ دیا۔

''ایسا ہے میرے بھائی! کہ تیرہویں صدی میں یہ فن یورپ پہنچا اور

اس میں مزید نکھار آیا۔انیسویں صدی میں کینیڈا کے چارلس فینرٹی اور جرمنی کے ایف جی کیلر نے لکڑی کے ریشے سے گودا بنا کر کاغذ کی دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیا۔اس کے بعد سے کتابوں کی اشاعت میں آسانی ہونے لگی۔لیکن کمپیوٹر کے آتے ہی کمپوزنگ اور پرنٹنگ کی دنیا میں انقلاب آ گیا ہے۔''

بزرگ شخص نے سر ہلا کر عمر رسیدہ شخص کی باتوں کی تائید کی اور پھر کہا۔

''آج دنیا کا سارا خزانہ کتابوں میں محفوظ ہے۔کتابیں ہماری زندگی اور تہذیب کا سرچشمہ ہیں۔کتاب کے بغیر آج ترقی کا تصور محال ہے۔جہاں ماضی تاریخ بن کر رقم ہے، حال اپنی روداد خود لکھتا ہے، وہیں مستقبل میں ہونے والے حادثات وواقعات کا گواہ اوراق بنتے ہیں۔ماضی میں لکھی گئیں کچھ ایسی کتابیں ہیں جس نے پوری دُنیا کو متحیّر کر رکھا ہے۔گوگل پر آج سب سے زیادہ سرچ ان ہی کتابوں کی ہو رہی ہے۔

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ طیارے کے ایک کونے میں بیٹھا شخص جو کسی گروپ کا حصّہ نہیں تھا، وہ پاس آیا اور اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے جناب میں اس گروپ میں اس لئے شامل ہو رہا ہوں کہ اس میں بہت سارے مصنّف دکھائی دے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی مصنّف ہیں؟''معمّر شخص نے برجستہ پوچھا۔

''نہیں میں قاری ہوں۔ایک اچھا قاری آپ کہہ سکتے ہیں۔ پڑھنے کے بعد ساری باتوں کو ہضم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''یعنی آپ اپنے ہاضمۂ مطالعہ کو درست رکھنا چاہتے ہیں۔''عمر رسیدہ شخص نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''جی آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ابھی ابھی میں نے ایک کتاب پڑھی ہے۔زندہ لوگوں کے درمیان ان دنوں بہت چرچا ہے۔وہ کتاب ہاٹ کیک کی طرح بک رہی ہے۔''

''کون سی۔۔۔''بزرگ شخص کا اشتیاق جاگا۔

''ڈین کونٹز کی۔۔۔دی آئیز آف ڈارکنیس''

''اچھا اچھا۔۔۔''معتبر شخص نے اس طرح کہا جیسے انہوں نے یہ کتاب پڑھی ہو۔

سوال کرنے والے شخص نے آگے کہا۔۔۔''اب آپ بتائیں کہ اس میں ہمارے بڑے پڑوسی ملک، کالی آندھی اور ۲۰۲۰ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کتنی سچّائی ہے؟''

معتبر شخص نے ناول نگار کی طرف دیکھا۔

''نہیں! میں اس بات کو نہیں مانتا کہ اس میں سچّائی ہے۔''معتبر شخص کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''لیکن لوگ تو مان رہے ہیں۔''دوسری طرف سوال کرنے والے کی حمایت میں ایک قاری سامنے آیا۔

''ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔وہ دراصل ایک فکشن ہے اور اسے فکشن کے طور پر ہی دیکھا جانا چاہئے۔''ناول نگار نے 'فکشن' لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ نے وہ کتاب پڑھی ہے۔''سوال کرنے والے نے ناول نگار سے ایک ذاتی سوال پوچھ لیا۔

''میری دنیاوی لائبریری میں فکشن کے بہترین کلیکشنز موجود ہیں ۔لیکن ایک وقت یہ کتاب میرے سیلف کی زینت نہیں تھی۔ادھر جب کالی آندھی کو لے کر گفتگو شروع ہوئی تو میں نے سوچا کہ اس بہانے اس کتاب کو پڑھ کر دیکھتا ہوں کہ اس میں ہے کیا؟ کسی طرح آن لائن کتاب منگوائی۔اور اب سوچ رہا ہوں کہ اگر میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہوتی تو آج دانشوروں کے درمیان گفتگو کا مزا ہی جاتا رہتا۔''ناول نگار مسکرایا۔

''واہ بھائی واہ۔۔۔!اب مزہ آئے گا ایک ناول نگار سے ناول پر سیر حاصل گفتگو سننے میں۔۔۔''سوال کرنے والا ناول نگار کی باتوں سے مرعوب ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

ناول نگار نے ایک طائرانہ نگاہ سب پر ڈالی اور کہا۔

''سب سے پہلے میں یہ بتادوں کہ یہ ایک کرائم تھریلر ناول ہے۔ اس کی پہلی اشاعت بیسویں صدی کی نویں دہائی کے پہلے سال میں ہوئی جس میں بائیو وِپن کا نام ''گورکی۔۴۰۰'' رکھا گیا تھا۔لیکن جب دوسری ترمیم شدہ کتاب قریب آٹھ سال بعد منظر عام پر آئی تو اس میں ڈین کونٹز نے مذکورہ بائیو وِپن کا نام ''گورکی' کی جگہ مصلحتاً 'بڑے پڑوسی ملک کے ایک شہر کا نام رکھ دیا۔''ناول نگار یہ کہہ کر مصنّف کی چالاکی پر مسکرانے لگا تھا۔

''گورکی۔۴۰۰' کی جگہ۔۔۔''معمّر شخص کے چہرے پر تعجّب کے آثار نمودار ہوئے۔

''ارے! اس بات کا علم تو بہت کم لوگوں کو ہے۔''عمر رسیدہ شخص نے حیرت کا اظہار کیا۔

''یعنی یہ سارا کھیل دوسرے ایڈیشن کا ہے۔''بزرگ شخص نے اپنی کم علمی کا اظہار کرتے ہوئے ناول نگار کی طرف دیکھا۔

''ایسا ہی سمجھیں۔۔۔لیکن اصل معاملہ یہ ہے کہ جب پہلی بار ناول شائع ہوا تو اس وقت امریکہ اور روس کے درمیان ایک طرح کا کولڈ وار چل رہا تھا ۔مصنف نے اس وجہ سے روس کے شہر 'گورکی' کو جہاں بائیو وِپن لیب موجود تھے اُسے نشانہ بنایا تھا۔اس کے بعد روس کا بکھراؤ ہوا، اور دنیا کے نقشے پر چین ایک معاشی طاقت بن کر اُبھرا۔جس کی وجہ سے عالمی معیشت پر امریکہ کا دبدبہ کم ہوا اور دونوں کے درمیان معاشی رسّہ کشی شروع ہوگئی۔اسی بات کا فائدہ اُٹھاتے

ہوئے مصنف نے ناول کی دوسری اشاعت میں شہروں کے نام بدل کر ناول میں ایک نیا ٹرَ کا لگا دیا۔اس طرح ناول کی تشہیر میں روز افزوں اضافہ ہوا۔

''یعنی ناول نگار نے قصداً پُرانی سوچ میں نیا فلیور ڈال کر قاری کے سامنے پیش کیا۔'' یہ کہتے ہوئے معتبر شخص مصنف کی چالاکی پر مسکرانے لگا تھا۔

''ہاں! ایسا ہی ہے۔'' ناول نگار نے کہا۔

''لوگ تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اس کتاب میں 'کالی آندھی' کے آنے کی تاریخ ۲۰۲۰ء درج ہے۔'' ایک ایسا شخص جس نے ناول نہیں پڑھا لیکن اس کے متعلق اِدھر اُدھر سے کچھ باتیں سُن رکھی تھیں، اس نے اپنی جانکاری میں اضافہ کے لئے پوچھ لیا۔

''ہاں درج ہے۔'' ناول نگار نے حامی بھرنے کے انداز میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ مصنف کو اس بات کا علم تھا کہ 'کالی آندھی' کہاں سے اُٹھے گی۔اس کی خبر کسی معتبر ذرائع سے مل گئی ہوگی۔'' سوال کرنے والے نے اس صداقت کو پرکھنے کی کوشش کی۔

''ایسا ہوسکتا ہے۔'' ناول نگار نے کچھ سوچتے ہوئے آگے کہا۔'' کیوں کہ فکشن رائٹر جب بھی کچھ لکھتا ہے تو اپنے لئے ایک دنیا آباد کر لیتا ہے اور اس دنیا کا کردار بھی وہ خود اپنی مرضی سے منتخب کرتا ہے۔کبھی کبھی کوئی فرضی کردار حقیقی کردار سے ٹکرا جاتا ہے۔ایک رائٹر کی سوچ اگر مستقبل کی کوکھ میں اُتر کر پوشیدہ رازوں کو افشاں کردے تو اس سے بہتر بات کوئی اور نہیں ہوسکتی۔اس لئے اسے ۲۰۲۰ء کی پیشن گوئیوں سے مربوط کر کے دیکھنا صحیح نہیں ہوگا۔''

'' کچھ فیکٹس تو اس ناول میں موجود ہیں نا.....'' سوال کرنے والا اب بھی صداقت کی تلاش میں تھا۔

''فیکٹس کے نام پر کچھ ایسی چیزیں ہیں جسے دل ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔''

''جیسے۔۔۔؟''

''ہمارا بڑا پڑوسی ملک اس مصنوعی 'کالی آندھی' کے فارمولے کو اپنے لیب میں اس لئے تیار کیا تا کہ وہ اس کے تیز جھکڑ سے غریبوں کی چھتوں کو ہواؤں میں اُڑا کر موسم کی ایسی مار مار سکے جس سے بڑھتی آبادی پر بریک لگ جائے۔یہ بات غلط ہے۔کوئی اپنے ہی باشندوں کو مارنے کے لئے ایسا گھناؤنا فارمولہ نہیں تیار کرسکتا۔۔۔'' لیکن اس بات میں کچھ سچائی ہوسکتی ہے کہ مستقبل میں ہمارا بڑا پڑوسی ملک اپنے اس بائیو وِپن سے دنیا کے معاشی نظام کو تہس نہس کر کے خود سُپر پاور بننا چاہتا ہو۔''

''آج کے حالات کے پیشِ نظر ایسا لگ بھی رہا ہے۔'' معزز شخص نے حمایت میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

'' کچھ بھی ہو۔لیکن میرے خیال سے فکشن کو فکشن کی نظر سے ہی دیکھا جانا چاہئے۔'' ناول نگار نے اپنی بات پر مہر لگانے کی سعی کی اور آگے کہا۔

''یہ ایک عام سا ناول ہے جس میں 'ماں' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔جو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ اس کا بیٹا جو ایک سال پہلے مر گیا تھا کیا اس کی موت واقعی ہوئی ہے یا وہ اب بھی کہیں زندہ ہے.....یہی وہ سوچ ہے جو اچانک ماں کے اندر جنم لیتی ہے کیوں کہ اس نے اپنے بیٹے ڈینی کو جس آدمی کے ساتھ پہاڑی سفر پر بھیجا تھا وہ اس سے پہلے سولہ بار وہاں کا سفر کر کے لوٹ چُکا تھا۔اور اُسے کبھی کچھ نہیں ہوا تھا۔اس لئے ماں کو ایسا لگتا ہے کہ اس کا بیٹا مرا نہیں ہے کہیں نہ کہیں زندہ ہے۔اور وہ ماں اپنے بیٹے کی تلاش میں پہلے روس کے اس شہر میں اور پھر بعد میں بڑا پڑوسی ملک کا جاں لیوا سفر کرنے کے بارے میں سوچتی ہے تا کہ اس کا بیٹا اسے زندہ مل جائے۔''

زیرو ہاور کی سوئی اپنے چوتھائی سفر پر تھی۔

ابھی مذکورہ ناول کی سحر میں ہی لوگ ڈوبے ہوئے تھے کہ ایک شخص پچھلی صف سے اُٹھ کر سامنے آیا اور معمّر شخص سے التجا کے لہجے میں گوش گزار ہوا۔

''اگر بات اس ناول کی ختم ہوگئی ہو تو کیا مجھے ایک عام قاری کی حیثیت سے اس گفتگو میں شامل ہونے کا موقع ملے گا۔''

''ہاں بھائی کیوں نہیں! اسی مقصد سے تو زیرو ہاور کا اہتمام کیا گیا ہے تا کہ ہر کوئی اس میں شامل ہو سکے۔'' معمّر شخص نے سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔''آپ آئیں اور گفتگو کو آگے بڑھائیں۔''

معمّر شخص کی طرف مشکور بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ شخص سامنے کی صف میں جگہ بناتے ہوئے گویا ہوا۔

''آپ سب نے امریکی مصنفہ سِلویا براؤن کا نام تو سُنا ہی ہوگا؟''

''ہاں بھائی! آج ایسا کون ہوگا جو ان کی لکھی کتاب ''اینڈ آف دی ڈیز: پریڈکشن اینڈ پروفیسیز اباؤٹ دی اینڈ آف دی ولڈ'' کا ذکر نہیں کر رہا ہے۔'' خود کو علم نجوم کا ماہر سمجھنے والے ایک شخص نے کہا۔

''اچھا کہیں وہ کتاب تو نہیں جس میں انہوں نے دنیا کے خاتمے کی پیشن گوئی کی ہے۔'' عمر رسیدہ شخص نے بات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

''دیکھئے اب تو اس کتاب پر بحث کرنے کے لئے ناول نگار کے ساتھ ماہر نجوم کی خدمات بھی ہمیں حاصل ہوگئی ہیں۔'' بزرگ شخص نے مثبت انداز میں اپنا سر ہلایا۔

''لیکن میں چاہوں گا کہ اس وقت ماہر نجوم اپنی بات رکھیں۔'' ناول نگار نے موضوع کی مناسبت سے انہیں آگے کر دیا۔

''ہاں تو دوستو!''

''اس کتاب کا تعلق علم نجوم سے ہے۔یہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے آٹھویں برس میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں اس بات کا ذکر ہے کہ بیس بیس میں نمونیا جیسی ایک مہلک بیماری پوری دنیا میں پھیل جائے گی۔یہ بیماری پھیپھڑوں اور نظام تنفّس پر اثر انداز ہوگی اور فی الحال اس کا کوئی علاج نہیں ہو

گا۔حالانکہ اس کتاب میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہ مہلک بیماری جس تیزی سے آئے گی اُسی تیزی سے غائب بھی ہوجائے گی اوراس کے دس سال بعدلوٹ کر پھر یہ بیماری آئے گی اوراپنے آپ ختم بھی ہوجائے گی۔''

ماہرِ نجوم ابھی اپنی بات کہہ کررکا ہی تھا کہ معتبر شخص بول پڑا۔

''اس کا مطلب ہے کہ کالی آندھی کے خاتمے اور پیشن گوئی کے سچ ہونے میں ابھی دس سال اورلگیں گے۔''

''ہاں!اس کتاب کی پیشن گوئی تو یہی کہتی ہے۔'' پھر ماہر نجوم نے یقین دلانے والے انداز میں آگے کہا۔''ہم سب دس سال کا انتظار کریں یا نہ کریں لیکن جو بات ان کے منہ سے نکلتی ہے وہ پتھر پر نقش ہوجاتی ہےاوراب تک کی گئی ان کی ساری پیشن گوئیاں سچ ثابت ہوئی ہیں۔

''واقعی!''معزز شخص نے حیرت سے کہا۔

''ہاں بھئی!''مثبت انداز میں سر ہلاتے ہوئے۔''دی ماونٹیل ولیم شو''،اور''لیری کنگ لائیو'' جیسی ٹیلی لائیوشو کے ذریعہ انہوں نے اپنی شکتی سے ماہرنجوم کی دنیا میں لاکھوں فالوورس پیدا کئے ہیں۔''

ماہرنجوم نے اپنی باتوں کی روشنی میں ان کی پیشن گوئیوں کو سچ کے مقابل کھڑا کرنے کی کوشش کی تو ناول نگار سے رہانہیں گیا۔

''نجومی صاحب!سِلویا براؤن تو خود کوایک ماہر نفسیات اور ادھیاتمک گرو کہتی ہیں اور یہ دعوی بھی کرتی ہیں کہ ان کے پاس آلوکک شکتی ہے جس سے وہ دنیا کوایک الگ نظریے سے دیکھتی اور سمجھتی ہیں۔اس بات میں آپ کوکتنی سچّائی نظر آتی ہے؟''

ناول نگار نے خوبصورت پیرائے میں ایک طرح سے طنز کا وار کیا تھاجسے نجومی صاحب سمجھ گئے تھے۔اس وقت اس کے پاس سلویا براؤن کے بچاؤ میں وہ کیا کہے جب سمجھ میں آیا تو اس نے اس دوسرا قصّہ سامنے رکھ دیا۔

''دیکھئے ایسا ہے ناول نگار صاحب کہ سلویا براؤن دراصل ناسترے دمس کے نقش قدم پر چل رہی تھیں۔اس لئے پہلے ناسترے دمس کو جان لیں تو سلویا براؤن کو سمجھنا آسان ہوجائے گا۔''

ناول نگار نے نجومی کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن ان دونوں کے درمیان تو صدیوں کا فاصلہ ہے۔اور دونوں کی سوچ کا ڈامینشن بھی الگ الگ ہے۔''

''یہ آپ کو لگ رہا ہے۔لیکن میرے نجومی اعداد وشمار کے مطابق بیسویں صدی کے سلویا براؤن اور سولہویں صدی میں پیدا ہوئے علم نجوم کے ماہر ناسترے دمس میں بہت ساری یکسانیت ہے۔''

اور پھر نجومی صاحب نے سلویا براؤن کو پیچھے کرتے ہوئے ناسترے دمس کوسامنے کردیااوراپنی بات منوانے کے لئے انہوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے لے کراندرا گاندھی اور راجیو گاندھی تک کو جوڑتے ہوئے ان کی پیشن گوئیوں کی روشنی میں نوبل وائرس تک کا سفراس طرح ایک سانس میں پورا کیا جیسے سب کچھ رٹا رٹایا ہو۔

جب ناول نگار نے اس کی باتوں کوسرے سے خارج کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تو نجومی طیش میں آگیا۔

''ناول نگار صاحب! آپ اس بات کونہیں جھٹلا سکتے کہ چار سو سال پہلے انہوں نے اس' کالی آندھی' کا راز کھول کر رکھ دیا تھا۔یہ ان کی کتاب میں موجود ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے۔

''لیکن کیا لکھا ہے یہ تو بتائیں۔''ناول نگار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ناسترے دمس نے لکھا ہے کہ''ایک' ٹوین ایئر والا سال ۲۰۲۰ء میں اس' کوئین' کالی آندھی کا جنم' ایسٹ' میں یعنی ہمارا بڑا پڑوسی ملک میں ہوگا جو رات کے اندھیرے میں' سوین ہلس' والے ملک یعنی اٹلی میں' پلیگ' پھیلائے گا۔جس سے بہت ساری زندگیاں موت میں تبدیل ہوجائیں گی اوراس وجہ سے عالمی معیشت تہس نہس ہوکر رہ جائے گی۔''

''تو اس طرح تو ٹوین ایئر والا سال ۲۱۲۱ء بھی آئے گا تو تب کوئی آپ جیسا' کوئین' کواس وقت کے کسی اور' آندھی' کے ساتھ جوڑ کر اسی بات کو پھر منوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگادے گا۔مطلب کوئی بات کہہ دواور پھر جب چاہواس کواپنے حساب سے موڑ لواور ایک نئی پیشن گوئی کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کردوتا کہ نجومیوں کی دُکان چلتی رہے۔''

ناول نگار نے طنز کرتے ہوئے اسے نجومیوں کی دُکان داری سے جوڑا تو نجومی صاحب نے علم نجوم کا بچاؤ کرتے ہوئے بلگاریہ کے نجومی بابا کی بات چھیڑ دی۔

''ناول نگار صاحب! نجومیوں کے متعلق آپ کی یہ ہٹ دھرمی اچھی بات نہیں ہے۔اب میں جس کی بات کرنے جارہا ہوں ان کی آنکھوں کی روشنی بارہ سال کی عمر میں ایک طوفان میں چلی گئی تھی ۔ ان کا نام بابا وینگا ہے۔ انہوں نے پوری دنیا کو بند آنکھوں سے دیکھا ہےاور پانچ ہزار اُناسی عیسوی تک کی پیشن گوئی بھی کی ہے۔جس میں ۲۰۲۰ء کے تعلق سے کہا ہے کہ اس سال بہت سارے حادثات وواقعات کے ساتھ' کالی آندھی' بھی آئے گی۔اس وقت انسان دوسروں کی فکر چھوڑ کر صرف اپنے بچنے کے بارے میں سوچے گا۔یہ وہی کالی آندھی تو ہے جو کروڑوں انسانی جڑوں کو رشتوں کی زمین سے اُکھاڑ کر ہر طرف شمشان گھاٹ اور قبرستان بنارہی ہے۔''

اس کے بعد ناول نگار نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

''ان بند آنکھوں سے مجھے بھی مستقبل دور تک دکھائی دے رہی ہے۔اب میں بھی ناول نگاری چھوڑ کراس دھندے سے جڑ جاتا ہوں۔کتاب کی

رائلٹی سے جتنا سال بھر میں کماتا ہوں اس سے کہیں زیادہ تو یہاں کسی کا مسقبل بتا کر ایک میٹنگ میں حاصل کرسکتا ہوں۔''

نجومی اس کی مسکراہٹ کو سمجھ رہا تھا۔لیکن پھر بھی اپنی بات منوانے میں لگا رہا تا کہ عزّت بچی رہے۔اس لئے اس نے ایک اور نجوم کے بُت کو سامنے کردیا۔

''ناول نگار صاحب! امریکی علم نجوم ڈین ڈِکسن کرسٹل بال کے اندر بنتی بگڑتی تصویروں کو دیکھ کر مستقبل میں ہونے والے حادثات وواقعات کی مدد سے صحیح پیشن گوئی کرنے کے لئے مشہور ہیں۔انہوں نے اپنی کتاب ''وار آف آرما گیڈن'' میں ۲۰۲۰ کے متعلق جو لکھا ہے وہ یہی تو 'کالی آندھی' ہے۔لیکن آپ تو اسے بھی نہیں مانیں گے، کیوں کہ آپ نے تو قسم کھا رکھی ہے۔''

''لیکن میں نے ایسا کچھ پڑھا نہیں ہے۔'' ناول نگار نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

''پڑھا نہیں ہے تو پڑھ لیں بھائی۔نیٹ پر سب موجود ہے۔'' نجوم نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

''نیٹ پر تو کوئی کچھ بھی ڈال سکتا ہے۔سب صحیح ہو ضروری تو نہیں۔۔۔''

''یہ افسوس کی بات ہے کہ آپ کے جیسے پڑھے لکھے لوگ نجومیوں کو نہیں مانتے۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کو ماننے والے جو لوگ ہیں وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ہم پڑھے لکھے لوگ زبردستی کسی چیز کو کسی چیز سے کوریلیٹ کر کے کچھ کا کچھ معنی نہیں نکال سکتے اور نہ ہی ہمیں اس طرح سے کوئی منوا سکتا ہے۔''

''ناول نگار صاحب! آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ ایک علم تو ہے۔''

''ٹھیک ہے مان لیتا ہوں۔لیکن پہلے یہ بتائیں کہ آپ لوگ سامنے جو چیز ہوتی ہے اس کو چھوڑ کر دور کی چیز پر کیوں نظر رکھتے ہیں اور اگر نظر اتنی ہی تیز ہے تو آپ کو اپنے اندر کی 'کالی آندھی' کیوں نظر نہیں آتی۔اور اگر نظر آتی ہے تو کیا آپ نے اس کالی آندھی کے بارے میں کہیں کچھ لکھا ہے تو ایمانداری سے وہ ڈائری دکھائیں؟ موت سے بڑی دنیا میں اور کوئی سچائی نہیں۔ساری زندگی انسان زندہ رہنے کے لئے موت سے لڑتا رہتا ہے۔پھر آپ کی موت بھی 'کالی آندھی' کی زد میں آنے سے ہوئی ہے۔ہمیں موت کا وہ سرٹیفکیٹ دکھا دیں جسے آپ نے جیتے جی جاری کیا تھا۔''

ابھی سارے متاثرین اس بحث ومباحثہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ فلکی طیارے کے اندر زیرو ہاور ختم ہونے کا سائرن بج اُٹھا۔

سبھی ایک بار پھر دنیا کو ری کریٹ کرنے کے ارادے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔روحانی پیکر میں ڈھل کر ہوا کے زینے سے نیچے اُترنے لگے۔

عین اسی وقت نجومی پسینے میں شرابور اپنی جگہ سے اُٹھا اور اپنے حریف کے پاس آکر اس کے کان میں کچھ کہا۔

ناول نگار اس کی باتوں پر بس مسکرا کر رہ گیا۔

- بقیہ -

## بندگلی کا مسافر

کی۔۔۔یہی کہ پختہ عمر کی غیر شادی شدہ ہو یا بے اولاد بیوہ کو ترجیح دی جائے جس کی کوئی ذِمہ داری باقی نہ ہو۔میرے مزاج کو سمجھ سکے، گھر بسانے کی آرزومند بھی ہو جو شوہر اور سائبان کی قدر کرے۔بے اولاد بیوہ نہ تو صرف کسی بیٹی کی بیوہ ماں ہو۔۔۔کم از کم کسی لڑکے کی بیوہ ماں سے تو بالکل ہی شادی نہیں ہوسکتی کیونکہ لڑکا اپنی ماں کو کسی اور شخص کے ساتھ برداشت نہیں کر سکے گا اور سب سے بڑھ کر ایسی خاتون جو مجھ کو میری ساری خوبیوں، خامیوں کے ساتھ سنبھال سکے۔میرے ساتھ خوش رہ سکے۔اِس فیصلے کے بعد پورا خاندان اپنے طور پر کسی ایسی خاتون کی تلاش میں نکل پڑا جو قائم کردہ معیارات کے قریب تر ہو اور میرا ٹیلی فون بھی بہت مصروف رہنے لگا۔تب بھابی نے خاموشی سے ایک خاتون تلاش کرلی جس کے خاوند کو فوت ہُوئے تقریباً سات ہو چکے تھے۔چار بیٹیاں تھیں جن کی شادی ہو چکی تھی۔ایک پاکستان میں اور تین اِمریکہ میں۔۔۔وہ بے گھر تھی کبھی ایک بیٹی کے پاس کبھی دوسری کے پاس۔بھابی نے میرے لئے سرپرائز تیار کیا اور کہا کہ کل شام گھر آنا تمہیں ایک خاتون سے ملوانا ہے۔۔۔

اگلے دِن مَیں بڑے اہتمام سے تیار ہُوا جب بھائی کے گھر پہنچا تو میرے سامنے ایک زبردست دھماکہ ہُوا۔۔۔میرے سامنے اور کوئی نہیں۔۔۔گلناز کھڑی تھی۔۔۔میرے ذہن میں بسا ہُوا احترام کا پودا تناور درخت بن گیا جس کی چھاؤں میں دوسری شادی کا فیصلہ قدرتی چشمے کی طرح میرے پیروں تلے سے پھوٹ پڑا جس نے کمرے میں کھڑے سب لوگوں کو خوشی سے شرابور کر دیا۔کمرے میں خوشی کی تیز ہوائیں چلنے لگیں اور پیروں تلے سکون کی ٹھنڈی چادر پھیل گئی اور وقت اپنی رفتار سے رینگنے لگا۔

# بند گلی کا مسافر

آصف عمران
(لاہور)

ریٹائرمنٹ کے بعد میری مصروفیات یکسر بدل گئیں۔ صُبح صُبح دفتر جانے کی بجائے مَیں آرام سے اُٹھتا اور کچن کا رُخ کرتا، چائے اور ناشتہ تیار کر کے اپنی بیوی انجم کو جگاتا۔۔۔ اور ہم دونوں آہستہ آہستہ ناشتہ کرتے اور دِن بھر کی چھوٹی چھوٹی مصروفیات پر بات کرتے اور پھر مَیں اُس کی دوائیاں سامنے رکھتا تو وہ بے زاری سے اُن کو دیکھتی اور پھر میرے سمجھانے پر دوائی کھانا شروع کر دیتی۔ اُس کو سانس کی تکلیف تھی۔ بڑی پُرانی تھی مگر حالات اور حوادث کے باعث بلڈ پریشر، گردن کے مہروں میں درد۔۔۔ بلڈ شوگر، سینے میں درد جیسے امراض نے اُس کو نڈھال کر رکھا تھا۔ دراصل بڑے بیٹے کی وفات نے اُس کی کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔ ہم نے بڑی بہادری سے اُس صدمے کو برداشت کِیا تھا۔ اب میری کوشش ہوتی کہ مَیں زیادہ سے زیادہ وقت اُس کے ساتھ ساتھ گزاروں۔ ناشتے کے بعد مَیں کوئی کتاب یا اخبار لے کر اُس کے پاس بیٹھ جاتا۔ یُوں میری زِندگی سمٹ کر گھر تک محدود ہو گئی۔ بیماری، دُکھ اور غم کی شِدت کو قریب سے دیکھا تو اِنسانی بدن کی کمزوریاں اور زِندگی کی مجبوریاں میرے سامنے آنے لگیں۔ تب مَیں نے محسوس کِیا کہ جب محبت کے پیروں تلے سے جنت کھینچ کر نفرت کا دوزخ دہکا دِیا جائے تو زِندگی میں آنے والے لمحوں کے چہروں پر بدصورتی اُگنا شروع ہو جاتی ہے جو اپنی کھردری زُبان سے لمحوں کے وجود کو چھیلنا شروع کر دیتی ہے۔ اُن کو زخمی کر دیتی ہے اور پھر اُن زخموں سے اُٹھتا ہُوا درد مُدت تک فراموش نہیں کِیا جا سکتا۔

بیٹے کی اچانک ایک حادثے میں وفات سے ہم دونوں کی زِندگی میں اِطمینان اور سکون اور خوشی کے سرسبز پودوں کو دُکھ کا دیمک لگ گیا جو ہمیں اندر سے کھوکھلا کرنے لگا۔ دوسرے دونوں بیٹے تعلیم کے لئے امریکہ گئے تو وہاں کی چکاچوند روشنیوں میں رہنے کے عادہ ہو گئے اور واپسی کے راستے ہی بھُول گئے بلکہ ہمیشہ کہتے کہ آپ بھی ہمارے پاس ہی آ جاؤ۔ مگر ہم اپنی مٹی کی خوشبو میں خوش ہیں اِسلئے دونوں اپنے آبائی گھر میں ایک دوسرے کے دُکھ درد کو بانٹ لیتے ہیں۔ گھر میں تقریباً بیس سال سے پرانی نوکرانی موجود ہے جو گھر کی اور ہماری دیکھ بھال کرتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے مَیں محسوس کر رہا ہُوں کہ انجم کی بیماری کی شِدت بڑھتی جا رہی ہے۔ اگرچہ اُس کو خوش رکھنے کے لئے مَیں اُس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو بھی پورا کرنے کی کوشش کرتا ہُوں مگر وہ دُنیا سے لاتعلق ہوتی جا رہی ہے۔ جیسے اندر سے جینے کی خواہش سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ اُسکی زِندگی کا مشروب قطرہ قطرہ وجود کے گلاس سے چھلک رہا ہے۔ مَیں اُس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہُوں مگر وہ خاموش سے لمحوں کی ڈھلوان پر رینگتی ہُوئی موت کے گہرے سمندر کی طرف بڑھ رہی ہے۔

کئی دِنوں سے اُسکی راتیں بے سکونی سے گزر رہی تھیں۔ بے خواب آنکھوں میں شکستِ خواب کی پرچھائیاں بسیرا کر چکی تھیں۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہتی اور مَیں سوچتا کہ مَیں کتنا بے بس ہُوں کہ اُس کے دِل کی باتیں سُن نہیں سکتا۔ ہم ہزاروں مِیل دُور کِسی شخص کی باتیں تو سُن سکتے ہیں مگر ساتھ بیٹھا ہُوا شخص کیا سوچ رہا ہے، دُنیا کا حساس ترین آلہ بھی ہمیں بتانے سے قاصر ہے۔ ہم دِل کی دھڑکن کی رفتار کو تو مشین کی مدد سے کاغذ پر منتقل کر سکتے ہیں مگر ساتھ لیٹا ہُوا شخص کِس خواب سے مضطرب ہو رہا ہے ہم نہیں جان پاتے۔ اور پھر ایک دِن بیماری سے لڑتے ہُوئے وہ زِندگی کی بازی ہار گئی۔ ہونی آخر ہو کر ہی رہتی ہے۔ موت کہیں باہر سے وارد نہیں ہوتی بلکہ وہ تو زِندگی کے وجود میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ زِندگی کو اُس کے وجود سے باہر دھکیلنے کا عمل شروع کر دیتی ہے۔ جِس وجود کی زِندگی جتنی طاقتور ہوتی ہے وہ اُتنے ہی طویل عرصے تک اپنے وجود میں قیام کرتی ہے۔ اپنے قدم جمائے رکھتی ہے مگر کب تک۔۔۔ آخر ایک دِن فتح موت کی ہی ہوتی ہے۔ شاید موت ہی ابدی صداقت ہے۔ شاید یہی وہ سچائی ہے جِسے ہم نظر انداز کر کے اِدھر اُدھر عمر بھر سرگرداں رہتے ہیں اور بھُول جاتے ہیں کہ لمحہ لمحہ موت کے مُنہ کی غار میں اُتر رہے ہیں۔ زِندگی کو رواں رکھنے کے لئے ہماری ساری کوششیں۔۔۔ تمام کاوشیں بے نتیجہ رہ جاتی ہیں۔ ہم بے بسی کی تصویر بنے سارے واقعات کو ہونے سے روک نہیں سکتے۔ یہی میرے ساتھ ہُوا۔۔۔ مَیں یکدم اکیلا ہو گیا۔ سبھی رِشتہ دار، عزیز، دوست آئے تسلی کے چند بول میٹھی آواز میں لپیٹ کر سماعت کی دیوار پر چپکا گئے۔ خُدا کی یہی مرضی ہے۔ اُسکی رضا میں ہی ہم کو راضی رہنا ہے۔ چند دِن بعد ہی اکیلے پن کے احساس نے وقت میں کڑواہٹ کی لہریں اُتار دِیں اور سُنسان گھر کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ بچوں نے کہا کہ آپ اکیلے کیسے رہیں گے ہمارے پاس آ جائیں۔ بیوی کے بغیر گھر میں اکیلا رہنے کا تجربہ ناکام ہوتا جا رہا تھا۔ تب حالات نے شِدت سے احساس دِلایا کہ میں تنہا رہ گیا ہُوں۔ جانے والے تو چلے جاتے ہیں مگر پیچھے رہ جانے والوں کو آنسوؤں، تنہائی اور یادوں کی برسات میں بھیگنے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ بچوں کے اصرار پر اور اُن کی خوشی کی خاطر مَیں اُن کے پاس چلا گیا مگر تنہائی میرے اندر سختی سے پنجے گاڑ چکی تھی۔ مَیں اپنے گھر میں اکیلا، تنہا اور یہاں بچوں کے ہوتے ہُوئے بھی اکیلا۔۔۔ بے چین۔

اکثر رات کو بے چینی بڑھتی تو مَیں کمرے سے نکل کر چھت پر آ جاتا۔ سر پر کھُلے آسمان کی گہری نیلی چادر تنی ہے جِس پر ننھے مُنے ستاروں کے جھرمٹ جگ مگ کرتے ہیں۔ مَیں ہر ستارے کو غور سے دیکھتا ہُوں کہ شاید کبھی کِسی ستارے میں میری بیوی کے چہرے کی جھلک نظر آ جائے۔ چھت پر ٹہلتے

ہُوئے مَیں نے آسمان پر ڈُوبتے چاند کا اُداس پیلا چہرہ دیکھا۔ سامنے رات کی تاریکی میں آسیب زدہ فلیٹس کی کئی منزلہ عمارتوں پر ایک نظر ڈالی۔ کِسی کِسی فلیٹ میں روشنی جھانکتی ہے۔ میرے اندر بے چینی کا شور ہے اور باہر رات کا سناٹا۔ مَیں تنہائی میں بکھرنے لگا۔ اُس کی یاد آنسو بن کر میری گالوں پر لکیریں بناتے ہُوئے زمین میں جذب ہوگئے۔ مَیں اُس خاص ستارے کو تلاش کرتا ہُوں جو آسمان پر میری چھت پر شمال مغرب کی جانب رات گئے طلوع ہوتا ہے۔ اُس کی روشنی مجھے سکون عطا کرتی ہے۔ مَیں اُس کے ساتھ باتیں کرتا ہُوں۔ ڈھیروں باتیں ۔۔۔ اُس کی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف میری سنتا ہے۔ میری باتوں پر مسکراتا ہے۔ کبھی کبھی میری اُداسی پر رو بھی پڑتا ہے اور کبھی اُس ستارے کی میٹھی آواز میری ہلکی سی سرزنش بھی کرتی ہے۔ وہ آسمان کے کئی راز مجھے بتانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ لیکن مَیں چاند کی پتلی کمر کے ساتھ لٹک کر آسمان کی وسعتوں میں جھولے لیتا رہتا ہُوں اور پھر تھک ہار کر اپنے کمرے میں آجاتا ہُوں اور دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھتا رہتا ہُوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مَیں ایک خواب کی مانند ہُوں جسے کوئی دیکھتا نہیں ۔۔۔ بند گلی کا مسافر ہُوں جس کی کوئی منزل نہیں ہے۔

امریکہ میں آئے ابھی چند دِن ہی گزرے تھے کہ ایک صُبح میرے موبائل کی گھنٹی نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ مَیں نے نمبر دیکھا تو حیران رہ گیا ۔۔۔ پاکستان سے یہ تو گلناز کا نمبر تھا جسے مَیں نے اُنکے خاوند کے نام سے محفوظ کیا ہُوا تھا ۔۔۔ مسرت کی ہلکی سی لہر چہرے پر لہرا کر گزر گئی۔ مَیں نے فون آن کیا تو کہنے لگی ''مجھے بھابی شنیلا سے پتا چلا کہ آپ بچوں کے پاس امریکہ میں ہیں۔ ایک تو مَیں آپ کی بیوی کی وفات پر پُرسا دینا چاہتی تھی۔ وہ نیک خاتون تھیں اُنہوں نے اچھی ماں، اچھی دوست اور اچھی بیوی کی حیثیت سے زِندگی گزاری ہے۔ خُدا اُن کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ خُدا نے اُن کی زِندگی کے اِتنے ہی دِن مقرر کئے تھے۔

ہاں ۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ جو رات قبر میں لکھی گئی ہے وہ باہر نہیں گزاری جاسکتی۔ یہ خُدا کا نظام ہے کہ جو بھی شخص اِس دُنیا میں آتا ہے اُسے واپس خاک میں تو جانا ہی ہے۔ ہمارا ساتھ اِتنے ہی دِنوں کے لئے لکھا گیا تھا۔ ایک کو تو پہلے جانا ہی تھا سو ۔۔۔ وہ چلی گئی ۔۔۔ اور مَیں تنہا رہ گیا ۔۔۔ مَیں نے افسردگی سے جواب دِیا۔

اب آپ کو حوصلہ کرنا ہے۔ بچوں کو بھی تسلی دینی ہے ۔۔۔ اور ہاں مَیں امریکہ کے سفر کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اب کون سی S.O.P پر عمل ہو رہا ہے۔ امریکن ائیر پورٹ پر آفیسر کس طرح کے سوال کرتے ہیں کیونکہ مَیں بھی بیٹی کے پاس امریکہ آنا چاہتی ہُوں اِس لئے مَیں نے سوچا کہ آپ سے معلومات لے لُوں ۔۔۔ مَیں نے اپنی معلومات کے مطابق پیش آنے والے حالات سے آگاہ کر دِیا۔ چند دِن بعد پاکستان میں ایک دوست سے بات کرنے لگا تو سامنے گلناز کا نمبر آگیا اور مَیں نے غیر ارادی طور پر نمبر ڈائل کر دِیا۔ اُس کے فون سے ہنستی مسکراتی آواز کی لہر میری سماعت کی غار میں اُترنے لگی۔

ہیلو ۔۔۔ کیسے ہیں آپ؟ آج فون کرنے کا خیال کیسے آگیا ۔۔۔

بس ایک دوست کو فون کرنا تھا آپ کا نمبر سامنے آگیا تو مَیں نے نمبر مِلا دِیا۔ مَیں تو آج کل اپنی زِندگی میں تنہائی، دُکھ اور ضبط کی آخری حد بندیوں کے جنگل سے گزر رہا ہُوں۔ بیوی کی جُدائی نے مجھے اکیلے پن کے صحرا میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دِیا ہے۔ جہاں میں لحہ لحہ بکھر رہا ہُوں۔ ہواؤں میں تحلیل ہو رہا ہُوں ۔۔۔ اختر صاحب ۔۔۔ کیا ہُوا، ہمت کریں ۔۔۔ آپ کے بچے ہیں، بہن بھائی ہیں۔ اُن سب کو تُمہاری ضرورت ہے۔ خود کو سنبھالیں ۔۔۔ میری طرف دیکھیں مَیں بھی تو سات سال سے تنہا رہ رہی ہُوں ناں ۔۔۔ تُمہاری بات اور ہے۔ تُم اپنی بیٹی کے ساتھ رہ رہی ہو ۔۔۔ اور تُم تو جانتی ہو کہ مَیں حساس شخص ہُوں۔ اچھا چھوڑو اِس بات کو ۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تُم امریکہ کب آرہی ہو؟ مَیں نے ماحول کی اُداسی کی چادر کو اُتار پھینکا۔

شاید ۔۔۔ دو ماہ بعد امریکہ پہنچوں ۔۔۔

چلو ٹھیک ہے۔ اُس وقت تک مَیں شاید واپس پاکستان پہنچ جاؤں گا ۔۔۔

اچھا ۔۔۔ اِس کا مطلب ہے کہ امریکہ میں ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔

چلیں جب خُدا کو منظور ہوگا ۔۔۔ مِل لیں گے ۔۔۔ مَیں نے آہستہ سے کہا اور فون بند کر دِیا۔

ماضی کے تپتے صحرا میں واقعات کے جھلسے ہُوئے پودوں نے ذہن کی شاخوں پر آنکھیں کھولنی شروع کر دِیں۔ ماضی میں جھانکتے ہُوئے چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں کے سارے منظر سُرمئی بے کیفی کی چادر اوڑھے اُن شاخوں پر پتوں کی مانند لگے مگر اُنہیں ہواؤں میں لہراتے اور سانس لیتے لمحے ظاہری فاصلوں، دُوریوں اور محرومیوں کے درمیان ہمارے دُکھ سُکھ سانجھے تھے۔ تب مَیں نے چاہا کہ وقت کے حلق میں ہاتھ ڈال کر سارے منظر نکال لُوں اور دوبارہ اُن کو اصلی جگہ پر بوُدوں اور ہماری گفتگو کے چاروں طرف سے اُڑتے ہُوئے پرندے آئیں اور اُن پیڑوں پر گھونسلے بنا کر مستقل طور پر رہنے لگیں ۔۔۔ اور جب بھی ہماری دوبارہ ملاقات ہو تو یہ منظر اُسی طرح ہمارے ساتھ سانسیں لیتا ہُوا ہماری باتوں کی گواہی دے۔

اور ایک دِن یُوں ہُوا کہ گرمیوں کی تپتی سہ پہر کو لحہ لحہ اُترتے ہُوئے شام کے سائے چل رہے تھے کہ ہمیں محسوس ہُوا کہ تیز ہوا لحہ بھر کو ہمارے چہروں پر رُکتی ۔۔۔ پھر غضب ناک ہوتی اور اپنی نادیدہ اُنگلیوں سے ہمارے کھردرے چہروں کو نوچتی، خراشیں ڈالتی چھیل کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ دُور ندی میں سورج

پھُول کو پانی پر تیرتے ہُوئے دیکھ کر گلناز کہنے لگی، میرا دِل کرتا ہے کہ وقت ٹھہر جائے۔۔۔اور تُمہارے ساتھ گزرے ہُوئے یہ لمحے جامد ہو جائیں اور ہم سورج کے ساتھ ہی ندی میں اُتر جائیں اور پھِر نئے دِن میں نئے جہان میں طلوع ہوں۔شام کے سائے پسینے سے شرابور پوریں ہمارے بدن ٹٹول رہی ہیں اور پیروں تلے چرچراتے سُوکھے پتے۔۔۔اُن پتوں میں چھپے ہُوئے تیز نوکدار پتھر۔۔۔پیروں کے تلوؤں میں گھُس کر اِن کو زخمی کر رہے ہیں۔محبت کی جنت لہُو لہُو ہے اور سر پر دہکتے انگاروں کی انگیٹھی۔۔۔ایک تو تُم بولتی بہت ہو۔۔۔مَیں نے اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہُوئے کہا۔

اور تُم میری کبھی بھی نہیں سنتے اور نہ جواب دیتے ہو، اُس نے ہاتھ چھڑاتے ہُوئے کہا۔

سنتا ہُوں بابا۔۔۔سنتا ہُوں۔۔۔چلو اب اور اچھی طرح سُنوں گا۔ تُم میری آنکھوں کی زُبان کو سمجھا کرو ناں۔

تُمہارے ہر سوال کا جواب میری آنکھوں کے آئینے میں لہراتا رہتا ہے۔مَیں نے اُسے سمجھایا۔

نہیں۔۔۔محبت یہ نہیں ہوتی۔۔۔

نہیں۔۔۔محبت وہ بھی نہیں ہوتی جیسے تُم سمجھتی ہو۔۔۔تُم نے کون سا کوئی وعدے کا سِکہ آج تک میرے دِل کی جیب میں ڈالا ہے۔۔۔

لیکن میری ہر ادا تو ایک وعدہ ہی ہوتی ہے۔۔۔تُمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔۔۔مَیں تو برف کا ایک ٹکڑا ہُوں جو تُمہارے بدن کے گلاس میں پڑے رُوح کے مشروب میں تحلیل ہو کر تُم میں سما جانا چاہتی ہُوں۔اب تُمہاری گرم سانسیں میرے گالوں سے ٹکرا رہی ہیں اور میری آنکھوں میں صدیوں سے بسی بیقراریاں چھلک رہی ہیں۔اُس نے پلکوں کو آنکھوں پر گرایا تو مَیں دو قدم آگے بڑھا اور وہ میرے بازوؤں کے حصار میں کسمسا کر رہ گئی۔ہونٹوں پر لگا گرم لمس کا قُفل دیر تک نہ کھُل سکا۔

اب کہو۔۔۔محبت کیا ہے؟ مَیں نے بازو کے حصار کو تنگ کر کے اُسے اپنی پسلیوں سے لگایا تا کہ وہ میری پسلیوں میں اُس جگہ فِٹ ہو جائے جہاں سے نکل کر اُس گمشدہ پسلی نے میرے گوشت کا لباس پہن لیا تھا۔مَیں رفتہ رفتہ اُس کی آنکھوں کے راستے سے اُس کے وجود کے کنوئیں میں اُترنے لگا مگر وہ تو ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔تیز ہوائیں اور گرد باد کا طوفان۔۔۔مٹی۔۔۔ہر طرف مِٹی ہی مِٹی۔۔۔

اندھیرا گہرا ہُوا تو مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔کہیں اُن پیڑوں کے پیچھے ہمارا کوئی دُشمن آ جائے اور ہمیں اُٹھا کر ندی میں پھینک دے تو ہم کیا کریں گے۔فضا میں جھینگر کی آواز ارتعاش پیدا کرنے لگی۔۔۔ہم تیز تیز قدموں سے چل کر گاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔سماج کا خوف اُبلتے پانی کی طرح ہمارے چاروں اور بہنے لگا۔خوف وہ خوف ناک درندہ ہے جو زِندہ اِنسانوں کی سانسیں پی کر پلتا ہے۔گہرے خوف کے دائرے میں گھر کے اندر رات ہی سب سے محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے۔جیسے جیسے چیزیں رات کے دامن میں خود کو گُم کرتی جاتی ہیں ویسے ویسے ہی اُن سے چمٹا ہُوا خوف کا لباس بھی تار تار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔اور اُس خوف کے اندر سے خوابوں کا طلسم جاگنا شروع کر دیتا ہے۔خوابوں سے نکل کر حقیقت کی دُنیا میں آئے تو سامنے گلناز کے گھر کا دروازہ تھا۔۔۔اُس نے گاڑی سے اُتر کر دروازہ پر دستک دی۔مَیں اِنتظار کرنے لگا کہ دروازہ کھُلے اور وہ اپنے گھر کی پناہ گاہ میں داخل ہو جائے۔مَیں آہستہ آہستہ گاڑی کو پیچھے کرتا جا رہا تھا مگر جب تک وہ گھر میں داخل نہ ہو جاتی مَیں گلی سے گاڑی نہ موڑتا۔۔۔

مَیں گزرے وقتوں کے خوشگوار لمحوں کی یادوں میں کھویا ہُوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لوگ تو پل بھر میں بچھڑ جاتے ہیں مگر اُن کی یادیں نہیں بچھڑتیں۔

وہ اپنے پیچھے محبتوں اور چاہتوں کا وہ بیش قیمت سرمایہ چھوڑ جاتے ہیں کہ اُنہیں کوئی فراموش کرنا بھی چاہے تو فراموش نہیں کر سکتا۔یاد ہی وہ رسی ہے جو جُدا ہو جانے والوں کو تنہائی میں بھی ایک دوسرے کی قربت کا احساس دِلا کر آپس میں جوڑے رکھتی ہے۔اگرچہ گلناز سے واقفیت خاصی پرانی تھی مگر ملاقات کم کم ہی ہوتی تھی۔وہ ایک سکول ٹیچر تھی اور اُس کے خاوند بھی سکول ٹیچر اور میرے والد کے کولیگ تھے۔۔۔اِس لئے دونوں خاندانوں کا آپس میں ملنا جلنا عام سی بات تھی۔اور سب سے بڑھ کر ہم ایک رفاعی تنظیم کے رُکن تھے جِس کی اکثر میٹنگز گلناز کے گھر ہوتی تھیں۔وہ جب بھی چائے لے کر آتی تو مَیں پوچھتا ۔۔۔چینی۔۔۔

ہاں۔۔۔مجھے یاد ہے۔۔۔وہ ہنستی ہُوئی جواب دیتی کیونکہ مَیں پہلے دِن ہی بتا چکا تھا کہ چینی بہت کم لیتا ہُوں۔

صرف چینی ہی یاد ہے۔۔۔مَیں جُملہ ادھورا چھوڑ دیتا۔

نہیں۔۔۔بسکٹ بھی یاد ہیں۔۔۔اور سب قہقہہ لگاتے۔

ایک دِن میٹنگ کے بعد چائے پر گپ شپ ہو رہی تھی۔کسی نے کہا کہ آج ہر کوئی اپنی شادی سے پہلے بیوی سے پہلی ملاقات کی کوئی یادگار بات شیئر کرے۔۔۔تا کہ معلوم ہو کہ کون کتنا رومینٹک رہا ہے۔سچ بولنا ہوگا کیونکہ تقریباً سب کی بیگمات یہاں موجود ہیں، غلط بیانی کرنے والے کو ٹریٹ دینی پڑے گی۔اور جِس کی ابھی شادی نہیں ہُوئی۔۔۔وہ کیا بتائے؟ ایک کنوارے نے وضاحت چاہی۔وہ کم از کم محبت کے بارے میں رائے تو دے سکتا ہے۔۔۔ ایک رائے سامنے آئی۔

وہ مستقبل میں متوقع ملاقات کے بارے میں اپنے خواب تو بتا سکتا ہے۔اور کچھ نہیں تو وہ کسی خیالی محبوبہ سے تخیلاتی ملاقات کا حال تو بتا سکتا ہے۔

ماحول خاصا رومینٹک ہو رہا تھا۔تب میزبان ہونے کی حیثیت سے گلناز کے خاوند نے کہا، محبت کے اِتنے ہی رنگ ہوتے ہیں جتنے کہ ست رنگی قوسِ

قزح کے۔۔۔محبت کا دائرہ قوسِ قزح کے اُس پار حیرت کے نئے جہان میں کھلتا ہے جہاں خواب ہوتے ہیں۔خیال ہوتے ہیں۔نئی دُنیا ہوتی ہے۔

ہر کسی نے کچھ نہ کچھ ضرور کہا۔۔۔کسی نے کہا محبت۔۔۔وہ کسک ہے جو دو ساتھی روحوں کے ملاپ تک سسکتی رہتی ہے۔

محبت۔۔۔مرد اور عورت اور کائنات کی مشترکہ میراث ہے۔

محبت۔۔۔لفظ اور آواز اور ادا کی وہ مثلث ہے جو کبھی ٹوٹتی نہیں۔

محبت۔۔۔خوشبو اور روح اور لمس کی وہ تکون ہے جس کا دروازہ تحیر کے جہان میں کھلتا ہے۔

محبت۔۔۔وہ لمحہ ہے جسے صرف محسوس کر سکتے تھے۔چھو نہیں سکتے تھے۔مگر اب یہ لمحہ دستِ طلب کی دسترس میں ہے بلکہ اِسے آنکھوں میں مقید بھی کیا جا سکتا ہے اور جب چاہیں تو اِسکو آنکھوں کے پردے کے پیچھے کھینچ کر اپنے سامنے لا سکتے ہیں۔اِس کو اصلی جگہ پر کھڑا کر سکتے ہیں۔اِسی لئے مَیں ماضی کے دبیز پردوں سے اُس لمحہ کو کھینچ لایا ہُوں جب میری ملاقات اُس سے پہلی بار ہُوئی تھی۔ماں جی نے اُسے گھر بُلایا تھا تاکہ مَیں اُس سے مل لُوں کیونکہ وہ اُسے اپنی بہو بنانے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔کھانے کے بعد ماں جی نے کہا کہ اُسے یونیورسٹی ہوسٹل چھوڑ آؤں۔۔۔مَیں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور وہ پیچھے بیٹھ گئی۔گھر سے نکلے تو مَیں نے پوچھا۔۔۔کس طرف سے چلنا ہے۔۔۔

اُس نے کہا کیوں نہ ہوسٹل جانے سے پہلے ایک لمبی ڈرائیو پر چلیں۔۔۔اور پھر یہ لمبی ڈرائیو دِن ہفتے، مہینے سالوں پر محیط ہو چکی ہے۔مَیں سمجھتا ہُوں کہ محبت کرنا گُناہ ہے نہ جرم۔۔۔بس محبت کے لئے ایک ہی شرط لازم ہے کہ جس سے محبت کی جائے اُس کا احترام کریں۔

ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے مگر کیا یہ ممکن ہے کہ کسی سے محبت کی جائے مگر اِس جذبے کو صرف اپنی ذات میں چھپائے رکھو۔۔۔گلناز نے سوال اُٹھایا۔

ہاں۔۔۔ایسا ظاہری طور پر تو ممکن ہے مگر ایسا کر سکنے والا شخص تو پہاڑ جیسے مضبوط اعصاب کا مالک ہی ہوگا۔مگر عشق اور مُشک تو ہمیشہ تک چھپ نہیں سکتے۔۔۔کسی نے آواز اُٹھائی۔

محبت کا معاملہ روح سے جُڑا ہُوا ہے۔۔۔گلناز بولنے لگی۔۔۔محبت روح میں بسی وہ بھوک ہے جو رفتہ رفتہ اِتنی بڑھ جاتی ہے کہ یہ پیٹ میں پڑی خوراک کی شکل اِختیار کر لیتی ہے۔اور معدے میں تحلیل ہو کر اِسکی لہریں معدے سے مُنہ کی طرف سفر کرتی ہیں۔روح کی زبان پر مٹھاس کی لذت پھیلا کر اپنی جڑواں روح کی تلافی کی طرف بڑھ جاتی ہے۔کیونکہ خالق نے روح کے ساتھ ہی ایک جڑواں روح تخلیق کی ہُوئی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اِنسان کے سارے خواب بے معنی رہتے۔اور جب محبت خوابوں کی زبان بولتی ہے تو خوشیاں زِندگی کی خاموشیوں میں نغمہ بن کر اُترتی ہیں۔تب نیند میں خواب کے پھول مسکراتے ہیں اور دونوں روحیں آپس میں گفتگو کرنے لگتی ہیں۔۔۔اپنے آپ کو کھوجنا شروع کر دیتی ہیں۔ہزاروں سالوں سے خوابوں کا سلسلہ۔۔۔

پرت اندر پرت۔۔۔تہہ در تہہ۔۔۔ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔۔۔نہ جانے ہم کہاں گم ہو جاتے ہیں۔موجود اور ناموجود کے سارے اسرار چھوٹے چھوٹے لمحوں کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔لمحے جو کہ مسلسل سفر میں ہیں۔کسی بھی سفر کی ابتدا اور انتہا ہمیشہ نامعلوم ساعتوں کی گود میں کھیل رہی ہوتی ہیں۔جن کے بطن سے خوشیوں اور لذتوں کے چشمے پھوٹتے ہیں۔روحیں آپس میں ملتی ہیں، اُن کے زخم مندمل ہوتے ہیں تو محبت سرفراز ہوتی ہے اور خوابوں میں ملاقاتوں کے گلاب کھلتے ہیں۔

مَیں نے غور سے گلناز کی طرف دیکھا۔وہ کسی اور ہی جہان میں پہنچی ہُوئی تھی۔اور پھر بولتے بولتے وہ رُکی تو سب ہی خاموش تھے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب باتیں ختم ہو جاتی ہیں تو خاموشی ہی گفتگو بن جاتی ہے۔خاموشی کے سائبان کے اندر ایک دوسرے کی قربت کا احساس ہمیں گھنٹوں ملاقات کی زنجیر میں باندھ رکھتا ہے۔اور جب بصارت بھی قربت کے لمحوں کے بوجھ سے بوجھل ہونے لگتی ہے تو ہم سب اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیتے ہیں۔

مَیں گزرے وقتوں کے خوبصورت لمحوں کی یادوں میں کھویا ہُوا تھا کہ میرا آٹھ سالہ پوتا کمرے میں آیا۔

دادا۔۔۔آجا۔۔۔اُس نے ابھی اُردو کے چند لفظ ہی سیکھے تھے۔مَیں نے مسکراتے ہُوئے اُسے سینے سے لگایا اور پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا تاکہ اپنے کھلونے دِکھائے۔تھوڑی دیر بعد وہ کارٹون دیکھنے لگا اور مَیں اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔۔۔میرے لئے جیسے وقت ٹھہر گیا تھا۔

بچوں کی اپنی زِندگی۔۔۔اور مسائل۔۔۔وہ سارا سارا دِن روزی روٹی کے چکر میں بھاگتے رہتے اور مَیں گھر میں اکیلا۔۔۔اور پھر مَیں واپس اپنے گھر لوٹ آیا کہ یہاں کم از کم لوگوں کے پاس وقت تو ہے کہ ایک دوسرے سے مِل سکیں۔لیکن میرے اندر کی تنہائی نے مجھے بہت تنہا اور خاموش کر دیا۔زِندگی کا یہ نیا موڑ یعنی بیوی بچوں کے بغیر اکیلا رہنا۔۔۔مجھ کو مشکل لگنے لگا۔زِندگی کے درخت کی جڑوں کو تنہائی کی دیمک لگ گئی۔اُن حالات کو دیکھتے ہُوئے دوستوں نے، بہنوں نے اور دوسرے عزیزوں نے دوسری شادی کے مشورے دینے شروع کر دیئے۔۔۔کچھ دِنوں بعد بھائی، بہو، بیٹوں، بھتیجے، بھانجوں نے ایک محاذ کھول دِیا کہ آپ اکیلے نہیں رہ سکتے اِس لئے اِس گھر میں آپ کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہے جس سے میری زِندگی میں ایک مثبت تبدیلی کا دروازہ کھُل جائے گا۔آوازوں کے اُس شور میں کافی غور و خوض کے بعد مَیں بھی اِس نتیجے پر پہنچا کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جا سکتا مگر زِندگی میں زِندوں کے ساتھ ہی رہنا اچھا ہوتا ہے۔اِس لئے اگر ایسا ہو جائے تو اُس میں کچھ حرج بھی نہیں ہے۔تب مَیں نے انجم کے ساتھ زِندگی میں گزرے ہُوئے واقعات کو وقت کی چھلنی میں ڈال کر بچوں کے ساتھ کانفرنس میں کچھ معیار مقرر کرنے کی کوشش

باقی صفحہ ۸۷ پر ملاحظہ کیجیے

# بندے

تابش خانزادہ
(لاس انجلس)

**ملک** کے کسی شہری کا نام شریف تھا یا نہیں لیکن دو شریفوں کا ملک ضرور تھا۔ نہ کوئی شرابی تھا اور نہ زانی۔ نہ کوئی کسی کا حق مارتا تھا اور نہ کوئی کسی کو دغا دیتا تھا۔ ملک میں قتل و غارت کا بھی کہیں نام و نشاں نہ تھا۔ وہاں لوگ جھوٹ تک نہیں بولتے تھے۔ منشیات کے نام اور استعمال سے وہ بالکل نابلد تھے۔ چوری کی کوئی واردات وہاں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے نہ وہاں پولیس تھی اور نہ ہی عدالتیں۔ نہ جج تھے اور نہ ہی جیل خانے۔ اگرچہ ان میں کوئی بھی رانجھا نہیں تھا اس کے باوجود لوگ وہاں صبح و شام چین کی بانسری بجایا کرتے تھے۔ وہ لوگ آنے والے مسافروں کی خاطر مدارت کرتے اور جانے والوں کو تحفے دے کر رخصت کرتے تھے۔ بادشاہ، وزیر، صدر، وزیرِ اعظم، گورنر عوام اور خواص ایک دوسرے سے بڑے پیار و محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

پھر ایک صبح کہرام مچ گیا جیسے اُس ملک میں گویا قیامت آ گئی تھی۔ ہر شخص ہکا بکا تھا۔ لوگوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں تھیں۔ ہر شریف آدمی کی خواہش تھی کہ کاش زمین پھٹ جاتی یا آسمان ٹوٹ پڑتا اور کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے اُسے موت آ جاتی۔ دراصل اُس ملک کی ہزاروں سالہ جرائم سے پاک تاریخ پر ایک بدنما دھبا لگا تھا۔ واقعہ بھی حیرت انگیز تھا کہ کسی ایک شریف آدمی کے ہاں چوری ہو گئی تھی۔ اس نے ملک کے چپے چپے میں چوری کا اعلان کروایا۔ اخبارات میں خبر آئی، ٹی وی اور انٹرنیٹ پر اعلان ہوا۔ ای میل کے ذریعے لوگوں کو بتایا گیا اور فیس بک، ٹوئیٹر، ٹک ٹاک اور دوسرے سوشل میڈیا پر اس واردات کو پوسٹ کیا گیا۔

ملک کے بڑوں اور چھوٹوں نے فیصلہ کیا کہ چور کے پکڑے جانے تک ملک کا کوئی فرد چین سے نہیں بیٹھے گا۔ پھر ایک شخص میدان میں آیا اور اپنے ضمیر کے ملامت کرنے پر اُس نے چوری کرنے کا اعتراف کرتے ہوئے خود کو سزا کے لیے پیش کیا۔ ایک بڑی جیوری بٹھائی گئی۔ کسی نے کہا، سزا کے طور پر اُس کا منہ کالا کر دیا جائے، کسی نے اُسے واجب القتل قرار دیا۔ آخر فیصلہ کیا گیا کہ چور کا منہ کالا کر کے جوتوں کے ہار پہنا کر ایک ٹرک کی چھت پر بٹھا کر تمام ملک میں پھرایا جائے۔ اس کے مکان کو بھی کالا رنگ کر دیا جائے اور پھر اسے ملک بدر کر دیا جائے کہ ایسے ناسور کی ہمارے پاک ملک میں کوئی جگہ نہیں۔

چور ملک بدر ہو کر سوچنے لگا کہ اُس نے واقعی بہت بُرا کیا تھا۔ اُس نے اپنے خاندان کی، اپنے شہر کی اور اپنے ملک کی ناک کٹوائی تھی۔ اور اب اُسے اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس نے خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگی اور وہ دوسرے ملک جا کر ایک شریف شہری کی طرح زندگی گزارنے لگا۔ جہاں اُس نے بڑی محنت کی، بہت سا روپیہ کمایا، اپنی حلال کمائی سے اُس نے غریبوں کی خدمت کی۔ اُسے جب بھی اپنی چوری والا واقعہ یاد آتا وہ اپنے سرمائے سے صدقہ ادا کرتا، وہ خدا سے معافی کا خواستگار ہوتا۔ اس نے نئے ملک میں یتیم خانے بنوائے۔ بیواؤں کی ماہوار تنخواہ بندھوائی اور نئے ملک کے باسیوں نے اُسے ایمانداری کا تمغہ بھی دیا اور اُسے ایک دیوتا کا درجہ دیا۔ لیکن وہ اندر سے اب بھی ناخوش تھا۔ اُسے رہ رہ کر اپنا گناہ یاد آتا تھا۔ پھر ایک دن اُس نے خدا کے حضور گڑگڑا کر معافی مانگی اور درخواست کی کہ اگر اُس کی توبہ قبول ہو گئی ہے تو اُسے قبولِ توبہ کی نشانی دی جائے تاکہ وہ اپنے پرانے ملک جا کر اپنے خاندان کے ماتھے پر بدنامی کا دھبا دھونے کے بعد اپنے لوگوں میں سرخرو ہو جائے۔ اُسی وقت ندائے غیب آئی اے میرے بندے تو نے تو پہلے ہی سچے دل سے توبہ کر لی تھی اور ہم نے نہ صرف یہ کہ تیرا چوری والا گناہ دھو دیا تھا بلکہ ہم نے تیرا مرتبہ بھی بلند کیا ہے اور ہم تمہیں معافی کی سند بھی دیتے ہیں۔ ساتھ ہی آسمان سے ایک پتھر گرا جس پر خدا کی جانب سے اُس کی معافی کا اعلان کُندہ تھا۔ وہ شخص بہت خوش ہوا اور سوچا کہ اب وہ اپنے شریفوں کے ملک واپس جا کر اپنی خدائی کی سند دکھائے گا اور زندگی کے باقی دن اپنے لوگوں میں گزار کر چین سے عزت کی موت کو گلے لگائے گا۔

اُس نے رختِ سفر باندھا اور اپنے ملک کی سرحدوں میں داخل ہونے لگا تو اُسے روک دیا گیا کیونکہ اُس کی پچیس سالہ پرانی تصویر اُس ملک کی سرحد پر لگی تھی جس پر لکھا تھا کہ اس شخص کا داخلہ شریفوں کے ملک میں ممنوع ہے۔ اُس نے سرحدی افسروں کو سارا ماجرا سنایا اور انہیں خدائی سند دکھاتے ہوئے بتایا کہ خدا نے اُس کا گناہ معاف کر دیا ہے اور اب اُسے باقی ماندہ زندگی اپنے ملک میں گزارنے کی اجازت دی جائے۔

شریفوں نے خدائی سند کو سچا تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے اُسے ملک میں داخل ہونے سے یہ کہہ کر روک دیا ''چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ اُس شخص نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دھیمے لہجے میں صرف اتنا کہا، واہ میرے مولا، تُو ہر گھڑی اربوں انسانوں کے چھوٹے بڑے گناہ معاف کرتا رہتا ہے، لیکن تیرے گنہگار بندے اپنے جیسے ایک انسان کی ایک چھوٹی سی خطا نہ کبھی معاف کرتے ہیں اور نہ کبھی بھلاتے ہیں۔

## عاشق

عورت اور زمین اپنے اوپر مرنے والے
عاشق کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں''

محمود درویش

# مٹی کی دیوار

مشتاق احمد مشتاق
(فینکس ایریزونا)

ہوش سنبھالنے سے آج تک اس نے ایسی کتنی ہی راتیں گھر کی چھت پر کھلے آسمان تلے چاند اور ستاروں سے باتیں کرتے گزاری تھیں آج کی رات بھی ویسی ہی رات تھی۔ گھر کی دیوار کے بالکل پیچھے پیپل کے درخت کے پتے ہوا سے جھوم جھوم کر ایک سلا دینے والی موسیقی کا سماں پیدا کر رہے تھے تو ایسے میں وہ ہمیشہ سوچنے لگتا چاند کی یہی روشنی مٹی کی دیوار کے اس طرف سوئی ہوئی شیرین کے چہرے کو بھی چھو رہی ہوگی۔ سوچا کل یونیورسٹی جاتے ہوئے پوچھوں گا۔ پھر یہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ اس کا تو یہ ہی جواب ہوگا کہ میں ایک اچھے بچے کی طرح آنکھیں بند کر کے سو جاتی ہوں۔ تم بھی ایک اچھے بچے کی طرح آنکھ بند کر کے سو جایا کرو۔ اب تم یونیورسٹی کے سٹوڈنٹ ہو تمہاری عمر آنکھ مچولی کھیلنے کی نہیں۔

شیرین اس کے تایا ابو کی بیٹی اور اس کی منگیتر تھی۔ ان دونوں کے گھروں کے بیچ مٹی کی دیوار نے دونوں گھروں کو الگ الگ کر رکھا تھا ورنہ تو یہ ایک ہی گھرانا ہوتا۔ مٹی کی اس دیوار میں ایک ’باری‘ تھی جس سے ان سب کو ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کی آسانی تھی۔ عامر اور شیرین کی ماں دو جان ایک قالب تھیں۔ عامر کے ابا اور اس کے تایا ابو بھی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

اتفاق تھا کہ عامر اور شیرین دونوں ایک ہی دن پیدا ہوئے عامر شیرین سے کوئی چار گھنٹے پہلے۔ دونوں گھرانے بہت خوش تھے عامر کے ابو اور تایا ابو کام پر چلے جاتے تو دونوں ماؤں کا سارا دن ایک ساتھ گزرتا۔ شیرین کی ماں دیوار کے راستے عامر کی طرف آتیں تو شیرین کو عامر کے جھولے میں اس کے ساتھ سلا دیتیں اور ایسا ہی عامر کی ماں کرتی اور پھر دونوں اپنے اپنے کام بانٹ بانٹ کر کرنے میں مصروف رہتیں۔

وقت ہنسی خوشی گزرتا رہا عامر اور شیرین پروان چڑھتے رہے اسکول، اسکول سے کالج اور اب کالج سے یونیورسٹی تک کا سفر ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ دونوں کے ماں باپ پڑھے لکھے اور سمجھ دار تھے جب عامر اور شیرین نے لڑکپن کو چھوڑ جوانی میں قدم رکھا تو دونوں کے ماں باپ نے ان کا ایک دوسرے کا خیال رکھنا اور ایک دوسرے سے پیار محبت دیکھ کر دونوں کی رضامندی سے ان کی منگنی کر دی اور شادی کے لئے یہ طے پایا کہ دونوں کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد شادی کر دی جائے گی۔

عامر بچپن کی خوشگوار یادوں کو سوچ کر بہت لطف اندوز ہوتا تھا جب کبھی شیرین کے ساتھ اکیلا ہوتا تو اسے پرانے وقت یاد کراتا رہتا تھا۔ اسکول کے زمانے میں کبھی اسکول جانے میں دیر ہو جاتی تھی تو وہ جلدی جلدی شیرین کو سائیکل پر بٹھاتا اور دونوں وقت پر اسکول پہنچ جاتے۔ اسکول کے راستے میں پائی دھرما حلوائی کی دکان تھی۔ شیرین کو موتی چور کے لڈو کھانے کا بہت شوق تھا شاید ہی کوئی ایسا دن ہو جو اس نے لڈو نہ کھایا ہو کبھی اپنے پیسوں سے تو کبھی عامر اپنی جیب خرچی سے اسے لڈو خرید دیتا۔ پائی دھرما بھی انہیں بہت پسند کرتا تھا شیرین کو آتے دیکھ کر پہلے سے ایک لڈو کاغذ کے رومال میں لپیٹ کر تیار رکھتا۔ اسے اچھا لگتا تھا جب عامر اور شیرین اسے سلام دھرما چچا کہہ کر مخاطب کرتے تھے تو وہ ہمیشہ ان کو لمبی اور خوشحال زندگی کی دعائیں دیتا رہتا۔ ایک دن دونوں دکان پر نہیں رکے اور سلام دھرما چچا کہہ کر آگے بڑھ گئے تو پائی دھرما نے آواز دی بٹیا آج لڈو نہیں کھانا۔ شیرین نے پلٹ کر مختصر سا جواب دیا دھرما چچا کل سہی۔ پائی دھرما سمجھ گیا کہ آج دونوں کی لڑائی ہوئی ہوگی۔

گھر پہنچ کر عامر اپنے گھر کے دروازے سے اپنے گھر چلا گیا اور شیرین اپنے گھر۔ شیرین کی ماں نے شیرین کو اکیلا اور اس کے بگڑے تیور دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ ضرور دونوں کی لڑائی ہوئی ہوگی ورنہ عامر اسکول سے واپسی پر پہلے تائی اماں کو سلام کرتا اور پھر باری کے راستے اپنے گھر چلا جاتا ایسے جیسے اپنے گھر جانے سے پہلے تائی امی کی صحیح سلامت بیٹی ان کے حوالے کرنا اس کا فرض ہو۔ اماں نے شیرین کی طرف دیکھ کر پوچھا عامر کہاں ہے۔ شیرین نے غصے سے کہا مجھے نہیں معلوم اپنے گھر گیا ہوگا۔ اماں نے جانتے ہوئے بھی پوچھا کیا تم دونوں کی لڑائی ہوئی ہے۔ شیرین نے اپنی جان چھڑانے کے لئے کہا ہاں مجھے کہہ رہا تھا تم بہت موٹی ہو گئی ہو میں اب تمہیں سائکل پر اسکول نہیں لے جا سکتا۔ بس اتنی سی بات۔ اماں نے آواز دے کر عامر کو بلایا اور مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے کہا کیوں عامر ہماری بیٹی کو موٹی کیوں کہا۔ عامر نے مسکراتے ہوئے کہا تائی اماں میں مذاق کر رہا تھا اتنا غصہ کہ آج لڈو بھی نہیں کھایا۔ اماں نے کہا اچھا جاؤ اس کے لئے لڈو لے کر آؤ ورنہ اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوگا۔ عامر نے ہنستے ہوئے رومال میں لپٹا لڈو تائی اماں کو دکھاتے ہوئے کہا یہ تو میں واپس جا کر پہلے ہی لے آیا تھا اور شیرین کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا یہ لو اپنا لڈو۔ دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک لڈو نے یہ گھمسان کی جنگ یوں آسانی سے ختم کر دی۔

دونوں نے بچپن سے جوانی میں قدم رکھا تو پیار محبت اور بڑھ گئی۔ اسکول چھوڑ کالج کا زمانہ آیا۔ دونوں سائنس کے سٹوڈنٹ تھے لیکن عامر کو شعر و شاعری اور اردو ادب سے بہت لگاؤ تھا وہ دونوں جب بھی اکٹھے ہوتے عامر چاند ستاروں شبنم اور پھولوں کی باتیں کرتا۔ اور شیرین خاموشی سے سنتی رہتی۔

ایک دن شیرین کا چاٹ کھانے کا موڈ ہوا۔ عامر سے کہا چلو چاٹ کھانے چلتے ہیں۔ پائی دھرما نے مٹھائی کی دکان کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں چند میز کرسیوں کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ پائی دھرما دونوں کو اکٹھا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ان کے سامنے چاٹ اور سموسے رکھتے ہوئے شیرین کی طرف دیکھ کر کہا کیوں بٹیا تمہاری لڑائی ختم ہو گئی۔ شیرین نے مسکرا کہا دھرما چچا آپ کو کیسے پتہ کہ لڑائی میں نے کی ہے۔ پائی دھرما نے کہا بٹیا جو لڑائی کرتا ہے وہ غصے میں

جلدی جلدی اور آگے آگے چلتا ہے اور جس سے لڑائی کی جاتی ہے وہ منہ لٹکائے پیچھے پیچھے۔ عامر نے کہا دھرما چچا آپ نے یہ فلاسفی کی باتیں کہاں سے سیکھی ہیں ۔عامر بیٹا یہ سب کتابوں سے سیکھا ہے سکول میں تو صرف چھے جماعت تک پڑھا ہوں۔ عامر نے کہا آپ سارا دن تو دکان چلاتے ہیں رات بھر دوسرے دن کے لئے تازہ مٹھائیاں بناتے رہتے ہیں تو کتابیں کب پڑھتے ہیں۔ دھرما نے ہنستے ہوئے کہا بیٹا جب رات کو میری پتنی خراٹوں کے مزے لیتی ہے تو میں کتابوں کے مزے لیتا ہوں۔ یہ سن کر سبھی ہنسانے لگے۔ پھر دونوں چاٹ اور سموسوں کا مزہ لیتے رہے اور عامر نے ہمیشہ کی طرح پھر سے چاند تاروں اور چاندنی کی باتیں شروع کیں تو شیرین نے اسے ٹوک کر کہا عامر صغیر زیدی صاحب تم سائنس کے سٹوڈینٹ ہو یہ چاند ستاروں اور چاندنی سے تمہارا کیا کام۔ عامر نے ہنس کر کہا شیرین کبیر زیدی صاحبہ پیار محبت تو خود ایک سائنس ہے اس پر صرف شاعروں اور آرٹس کے سٹوڈنٹس کی اجارہ داری تھوڑی ہے جی۔ محبت کیمسٹری ہے جب دو انسانوں کی کیمسٹری Chemistry ملتی ہے اور انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے تو یہ کیمسٹری کا Chemistry کمال ہے اور جب کوئی جوان لڑکا لڑکی مقناطیسی کشش سے ایک دوسرے کی طرف کھچتے چلے جاتے ہیں تو یہ فزکس Physics کا کرشمہ ہے۔ اور جب کوئی محبت کرنے والا وصال کے لئے دن گنتا رہتا ہے تو یہ میتھ Math کی کرامت ہے۔ اور جو اللہ نے عورت کو حسن کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کو خوبصورت زاویوں سے نوازا ہے یہ جیومیٹری Geometry ہے۔ شیرین نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا بس بس اب ٹریگنومیٹری Trigonometry اور کیلکیولس Calculus کو بیچ میں مت لے آنا۔ اور یہ جو تکونا سموسہ تمہارے سامنے پڑا ہے اس تکون کا فارمولا تو تمہیں یاد ہی ہوگا بس اسے کھاؤ اور چلیں دیر ہو رہی ہے۔

زندگی گلزار تھی۔ دن ایسے ہی ہنسی خوشی گزر رہے تھے۔ ہاں فکر تو زندگی کا حصہ ہے پہلے دونوں کو امتحانوں کی فکر تھی۔ اب نتیجے کی فکر۔ پھر نوکری اور اس کے بعد شادی اور پھر دونوں کے درمیان وہ مٹی کی دیوار نہیں رہے گی۔ پھر خدا خدا کر کے امتحان کا نتیجہ آیا دونوں نے بہت اچھے نمبروں سے بی ایس سی کر لیا۔ سبھی خوش تھے چچی اماں اور تائی اماں نے دونوں سے کہا جاؤ مٹھائی لے کر آؤ محلے میں سب کو بانٹنی ہے۔ پھر پوچھا مٹھائی میں کیا کیا لاؤ گے۔ دونوں نے ایک زبان ہو کر کہا صرف لڈو۔ عامر کی ماں نے ہنس کر کہا تو پھر شادی پر کیا بانٹو گے۔ دونوں نے کہا لڈو۔

جالندھر کے جس محلے میں عامر اور شیرین رہتے تھے اس محلے کے زیادہ تر مکین پشتوں سے وہاں آباد تھے۔ کوئی تو اپنے دادا دادی کی باتیں سناتا تو کوئی اپنے پردادا دادی کے قصے مزے لے لے کر سناتا۔ محلے میں زیادہ تر ہندو برادری کے لوگ تھے چند سکھ اور گنتی کے مسلمان گھرانے تھے سبھی مل جل کر ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ محلے میں کہیں سے سلام مہندر چچا کی آواز تو کہیں سے نمستے کبیر بھائی کی آواز آتی۔ اور کبھی مسلمان ہندو دوست سے بغیر کسی جھجک کے کہہ دیتا کہ اللہ تمارا نگہبان ہو تو ہندو بڑی خندہ پیشانی سے بغیر برا منائے جواب میں کہہ دیتا ایشور تمہیں بھی اپنی حفاظت میں رکھے۔ محلے میں ایک چھوٹا سا مندر تھا اور محلے سے باہر بازار میں مسجد تھی۔ محلے کے باسی پشتوں سے مندر کی گھنٹیوں اور اذان کی آوازی سن سن کر پروان چڑھے تھے۔ سب کے لئے یہ آوازیں ان کی روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ تھیں۔

عامر کی گنگا رام اور اس کے چھوٹے بھائی مایا رام سے بڑی گہری دوستی تھی۔ ان کا گھر کافی بڑا حویلی نما تھا اور ان کے ہاں کالج اسکول کے دوستوں کی کیرم بورڈ کھیلنے کی محفلیں لگتی رہتی تھیں۔ عامر کیرم بورڈ کا بہترین کھلاڑی تھا گنگا رام اور اس کا ہمیشہ مقابلہ رہتا تھا۔ ایسے ہی شیرین کا اس کے گھر کے بالکل سامنے والے گھر کی شیلا، سمن اور ارتی اس کی سہیلیاں تھیں۔ بڑی بہن شیلا، شیرین کی کلاس فیلو بھی تھی۔ ان سب کا ایک دوسرے کے گھر بغیر کسی جھجک کے آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان دنوں ہندوستان کی آزادی کی مہم اپنے اختتام پر پہنچ چکی تھی۔ ملک کے بٹوارے کا دن اور ہندوستان۔ پاکستان کی آزادی کے دن کا اعلان بھی ہو چکا تھا۔ اور پھر وہ دن آ ہی گیا چودہ اگست کو پاکستان اور پندرہ اگست کو ہندوستان نے جنم لیا۔ دونوں طرف بینڈ باجے جلسے جلوس اور مٹھائیاں بانٹی گئیں۔

متحدہ ہندوستان کے نقشے پر انگریز سرکار نے جاتے جاتے بٹوارے کی لکیر کچھ اس طرح سے کھینچی جیسے کوئی بھس میں چنگاری چھوڑ دے۔ ملک کے بٹوارے کے ساتھ ساتھ کئی گھروں کئی کئی خاندانوں، کئی گاؤں اور زمینداروں کی زمینوں کا بٹوارہ بھی ہو گیا۔ کئی گھروں کے داخل ہونے کے دروازے پاکستان میں اور پچھلے دروازے ہندوستان میں کھلتے۔ کئی گاؤں آدھے آدھے بٹ گئے۔ نہریں ندی نالے اور دریا تک بٹ کر رہ گئے۔ انگریز کی دانستہ چھوڑی ہوئی اس چنگاری نے پھر ایک دن آگ کا شعلہ بن کر دونوں نومولود ملکوں کو اپنی لپیٹ میں ایسے لیا کہ بہت کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ کئی انسانوں نے درندوں کا روپ دھار لیا۔ دونوں طرف دن کی روشنی اور رات کے اندھیروں میں قتل و غارت اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ ویسی ہی ایک شام تھی عامر نے ماں باپ سے کہا میں گنگا رام کے ہاں جا رہا ہوں آج ہمارا کیرمبورڈ کا ٹورنمنٹ ہے۔ گنگا رام کا گھر عامر کے گھر سے کوئی پانچواں گھر تھا وہ وہاں پہنچا تو ابھی کوئی اور دوست نہیں آئے تھے۔ شام ڈھل کر اندھیرا ہونے لگا تھا۔ گنگا رام، مایا رام اور عامر ہنسی مذاق میں مصروف دوسروں کے آنے کے انتظار میں تھے کہ گلی میں شور وغل اور نعروں کی آوازیں آنے لگیں آوازیں اتنی بڑھ گئیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گنگا رام نے دروازہ کھول کر دیکھنے کی بجائے چھوٹی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ انسان خون کے پیاسے درندوں کی طرح ننگی تلواریں، کرپان، ڈنڈے چھریاں ہوا میں گھماتے کالی ماتا کی جے اور جے شری رام کے نعرے لگاتے مسلمانوں کے گھروں کے دروازے کھڑکیاں توڑ توڑ کر ان کے گھروں میں گھس رہے تھے۔ قتل و غارت کا سماں تھا۔ گنگا رام نے اپنے ماں باپ کی مدد سے عامر کو جلدی سے اپنے گھر کے تہ خانے میں فرنیچر کے پیچھے چھپا دیا۔ ایسا لگتا تھا

جیسے ان درندوں کو گلی میں ہر مسلمان کا گھر معلوم تھا۔ انسان چلا رہا تھا اور درندہ تلوار چلا رہا تھا۔ اور پھر آہستہ آہستہ چلانے والوں کی آوازیں دم توڑ گئیں تو شور و غل اور نعروں کی آوازیں بھی دبتی گئیں۔ خون سے آلودہ تلواریں اور کرپانیں لہراتے درندے واپس لوٹنے لگے۔ اور اب گلی میں جیسے ہو کا سا عالم تھا قیامت گزر گئی اور اپنے پیچھے جلتے گھر اور لاشوں کے انبار چھوڑ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس اور فوجی اپنی گاڑیوں کے ساتھ محلے میں داخل ہوئے اور سپیکرز پر لوگوں کو گھروں سے باہر نہیں نکلنے کی ہدایت کرتے ہوئے رات کے اندھیرے میں لاشوں کو گاڑیوں میں لے جاتے ہوئے دیکھے گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ عامر اپنے گھر جانے کیلئے بے چین تھا لیکن گنگا رام اور اس کے ماں باپ نے اسے روکا کہ باہر اب بھی خطرہ ہے جب تک خطرہ مکمل طور پر ٹل نہیں جاتا ہم تمہاری جان کو جان بوجھ کر خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ گنگا صبح صبح پہلے خود جا کر تمارا گھر دیکھے گا بعد میں رات کے اندھیرے میں تمہیں ساتھ لے جائے گا۔

دوسرے دن صبح محلے میں امن دیکھ کر گنگا رام نے عامر اور اس کے تایا کے گھر کو جا کر دیکھا اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے چاروں طرف دیواروں اور فرش پر خون ہی خون تھا۔ لوٹ مار کرنے والوں نے گھر کو خالی کر دیا تھا کتابوں تصویروں کو جلا دیا تھا گھر کا فرنیچر لوٹ مار کر لے گئے۔ اس سے زیادہ دیر یہ ہولناک منظر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی وہ سوچ رہا تھا عامر یہ بربادی کا منظر کیسے دیکھ سکے گا۔ وہ جلد ہی گھر لوٹا اس نے روتے ہوئے عامر کو گلے سے لگا کر کہا عامر وہاں کچھ نہی بچا وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ عامر اسے واسطے دینے لگا کہ وہ اسے گھر لے جائے۔ گنگا رام نے اسے بتایا کہ اس کے لئے باہر جانے میں اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اس نے مسلمانوں کے گھروں کے دروازوں پر سرخ رنگ سے نشان لگے دیکھے ہیں۔ لگتا ہے محلے کے کچھ لوگ بھی اس قتل و غارت اور لوٹ مار میں شریک ہیں۔ گنگا رام اور اس کے ماں باپ نے اسے گلے سے لگا کر ہدایت کی اور تسلی دی کہ وہ رات کے اندھیرے میں اسے گھر دیکھنے کے لئے لے جائیں گے۔ عامر کو ایسا لگ رہا تھا جیسے رات تک کا انتظار اس کی جان لے لے گا۔

اور آخر وہ اندھیری کالی رات آ ہی گئی۔ گنگا رام اور اس کے گھر والے کان لگا کر محلے میں سے آنے جانے والوں کی آوازیں سن رہے تھے تقریبا آدھی رات کے بعد بلکل خاموشی ہوگئی۔ بازار سے بھی ٹریفک کی آواز آنا بند ہوگئی تو گنگا رام کے باپ نے آہستہ سے گھر کا دروازہ کھول کر محلے کا جائزہ لیا سب طرف خاموشی تھی۔ وہ چھپ چھپ کر عامر کے گھر تک پہنچے دونوں گھروں کے دروازے کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ گھر کے پچھلے کمرے میں جا کر انہوں نے لالٹین جلائی گھر کی حالت اور دیواروں پر خون کے چھینٹے دیکھ کر گنگا رام اور اس کا باپ اپنے آنسو نا روک سکے دونوں گھروں میں کچھ بھی نہیں بچا تھا الماریوں میں سے سب کپڑے لوٹ مار کر لے جا چکے ان کو ایسا لگا جیسے یہ منظر دیکھ کر عامر کو غش آنے لگا ہو عامر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا ایسے جیسے اس کی ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی سکت ہی نہ رہی ہو وہ دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا مگر گنگا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی سے کہا عامر کسی کو پتہ نا چلے کہ تم یہاں ہو۔ اب چلو یہاں تو کچھ نہیں بچا۔

واپس ان کے گھر پہنچ کر عامر ساری رات روتا رہا گنگا کے گھر والوں کے پاس اسے تسلی دینے کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ دوسرے دن انہوں نے عامر کو سمجھایا کہ اب اس کا زیادہ دن یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ خبریں ہیں کے ملک کے مختلف شہروں میں قتل و غارت اور لوٹ مار کی بنا سینکڑوں ہزاروں مسلمان پیدل اور ہر طرح کی سواریوں میں پاکستان کی طرف جا رہے ہیں یہاں تک کہ ریلوے گاڑیاں بھر بھر کر ان کو پاکستان کی سرحد تک لے جا رہی ہیں۔ ہم تمہیں رات کے اندھیرے میں ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے جائیں گے بھگوان تمہاری مدد کرے گا اور اس سے آگے بھی وہ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے گا۔

گنگا رام اور اس کے گھر والے رات کی خاموشی اور اندھیرے کا انتظار کرتے رہے۔ صاف کپڑوں اور کھانے کی کچھ چیزوں کی ایک گٹھڑی سی بنا کر عامر کو دی سب گھر والوں نے اسے سینے سے لگا کر بہت پیار کیا اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

محلے سے نکلتے ہوئے انہیں کافی ڈر تھا کہ کوئی عامر کو ان کے ساتھ دیکھ نہ لے۔ بازار پہنچ کر خوف کچھ کم ہوا جوں جوں وہ ریلوے اسٹیشن جانے والی سڑک کے قریب پہنچنے لگے لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اسٹیشن کے قریب ایک ہجوم تھا جو اسٹیشن کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا یہ سب مسلمان تھے جو اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ کر اپنی جانیں بچا کر پاکستان کی طرف بھاگ رہے تھے کسی نے سر پر گٹھڑی اٹھا رکھی تھی تو کوئی اپنی جمع پونجی کے ٹن کے ڈبے اٹھائے بھاگ رہا تھا۔ گنگا رام عامر کو گلے لگا کر رونے لگا عامر نے اسے بھینچ کر گلے سے لگایا۔ عامر بھی اس وقت آنسوؤں کی اس جھڑی کو نہ روک سکا مشکل سے گنگا کو اپنے سے الگ کیا۔ گنگا کی آنکھوں میں جدائی کا حقیقی قرب دیکھ کر مشکل سے عامر نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ گنگا میں تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ گنگا رام کے باپ نے اسے گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا بھگوان نے یہاں تک تمہاری حفاظت کی ہے اب آگے بھی بھگوان اور خدا تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔ ایشور کے کرشموں پر بھروسہ رکھنا ایسا بھی ہوسکتا ہے کے تمہارے سب بچھڑے ہوئے تمہیں پاکستان میں مل جائیں۔ زندگی رہی تو ضرور ملیں گے اب تم جاو بھگوان اور خدا تمہارا مستقبل روشن کرے گا۔

ریلوے پلیٹ فارم کو جانے والا دروازہ کوئی اتنا کشادہ نہیں تھا۔ لوگ ٹرین تک پہنچنے کے لئے ہر طرح کی طاقت استعمال کر رہے تھے۔ نفسانفسی اور افراتفری کا عالم تھا عامر مشکل سے پلیٹ فارم پر پہنچا ایک ہجوم تھا جو ٹرین پر چڑھنے کے لئے کوشاں تھا جوان، بچے، بوڑھے عورتیں جیسے انسانوں کے اس سمندر میں بہہ رہے ہوں۔ عامر نے دیکھا ایک بوڑھا شخص اپنی بیوی کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ٹرین تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس ہجوم میں اس کی آگے

بڑھنے کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ عامر نے ہر طرح کا زور لگا کر اس کے پاس پہنچ کر زور سے کہا بابا جی اماں کو مجھے اٹھا لینے دیں بابا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا خدا تمہارا بھلا کرے تمہاری عمر دراز کرے۔ اگر اس دھکم پہل میں تم لوگ جدا ہو گئے تو میں اس کو کہاں ڈھونڈوں گا۔ لوگ جیسے ٹرین کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے کچھ ٹرین کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے کسی کو ٹرین کے دروازے پر پاؤں دھرنے کی جگہ ملی تو دروازے کا دستہ پکڑ کر لٹکا ہوا تھا۔ اتنے میں انسانوں کے ایک ریلے نے عامر کو زور کا دھکا دیا اور وہ ٹرین کے ایک ڈبے کی کھڑکی کے بلکل سامنے پہنچ گیا ۔اس نے بغیر سوچے سمجھے کہ وہ اس چھوٹی سی کھڑکی کے راستے اندر جا بھی سکے گا یا نہیں اپنی پوری قوت سے اپنا دھڑ کھڑکی کے اندر کر دیا اتنے میں اسے ایسا لگا جیسے اندر سے کسی نے اس کو اس کے دونوں بازوں سے پکڑ کر اندر کی طرف کھینچ لیا ہو۔ تھوڑی دیر تک جیسے وہ سکتے میں کسی کے سر پر تو کسی کے کندھوں پر بے سکت پڑھا رہا۔ پھر اس نے ادھر ادھر قدم جمانے کی کوشش کی اور اپنے لئے چھوٹی سی جگہ بنا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اسے ایسا لگا جیسے اس پر نیند کا غلبہ چھا رہا ہو۔ اسے نہیں پتہ چلا وہ کب تک سویا رہا۔

لوگوں میں ہلچل سی مچی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ لوگ زور زور سے کہہ رہے تھے پاکستان آ گیا ہے پاکستان آ گیا ہے۔ اب لوگ دھکم پیل نہیں کر رہے تھے۔ شاید اب وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر رہے تھے۔

پلیٹ فارم پر کافی تعداد میں حکومت کے کارکن اور رضا کار آنے والے لوگوں کی مدد کرنے کے لئے موجود تھے وہ لوگوں کو بسوں، ٹرکوں میں بھر بھر کر مہاجر کیمپ جن کا انتظام حکومت نے کر رکھا تھا لے جا رہے تھے۔ جہاں ان کے لئے کھانے، نہانے دھونے اور سونے کا انتظام تھا عامر کو بھی ایک ٹینٹ میں دو اور لوگوں کے ساتھ جگہ دی گئی۔

دوسرے دن حکومت کے کارکن سب سے ان کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے آئے۔ پتہ، معیارِ تعلیم۔ ان کے خاندان میں سے کوئی ان سے بچھڑ گیا ہے۔ عامر نے اپنے ماں باپ، تایا ابا تائی اماں اور شیرین کا نام اور حلیہ تفصیل سے لکھا دیا۔ جس پر کارکن نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ حکومت ہر طرح سے خاندانوں کے بچھڑوں کو ملانے کی کوشش کرے گی۔

دوسرے دن کچھ رضا کار سب سے بات چیت کرنے۔ ان کا حال معلوم کرنے آئے۔ عامر سے ملنے جو رضا کار آیا بہت ہنس مکھ اور تعلیم یافتہ لگتا تھا۔ سلیم نام تھا اس کا۔ اس کی عامر سے کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی سلیم خود بھی بی۔ ایس۔ سی کر چکا تھا اور اب ایم۔ ایس۔ سی کی تیاری کر رہا تھا اس نے عامر کو بتایا کہ جیسے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہندوستان سے یہاں آ رہے ہیں ایسے ہی ہزاروں کی تعداد میں ہندو پاکستان چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اسے یہ معلوم کر کے کہ عامر نے بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کر لیا ہے تو اس نے بتایا کہ بہت سے تعلیم یافتہ ہندوؤں کے جانے سے دفتروں میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے اور وہ کوشش کرے گا کہ عامر کو کوئی مناسب نوکری مل جائے۔ اس نے دو ایک دن کے بعد آنے کا وعدہ کیا اور کہا انشاءاللہ وہ اس کی لئے کوئی اچھی خبر لے کر آئے گا۔ عامر نے گنگا رام اور اس کے ماں باپ سے انسانیت کا جو سبق سیکھا تھا اس نے عامر کی شخصیت اس کی سوچ سمجھ پر بہت اثر کیا تھا۔ اسے رضا کار سلیم میں وہی سب اچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔

دو دن کے بعد سلیم عامر سے ملنے آیا اس کے چہرے پر کامیابی کی مسکراہٹ تھی۔ اس نے عامر کو بتایا اس کے لئے خوشخبری ہے۔ اس نے کہا کہ میرے کالج میں ایک ہندو کلرک کے یوں ایک دم چلے جانے سے کلرک کی ایک نوکری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری تعلیمی قابلیت کلرکی سے بہت زیادہ ہے مگر تم نے وہ عرب اور اس کے اونٹ والی کہانی تو ضرور سنی ہو گی۔ بس تم بھی اپنا سر اس وقت خیمے کے اندر کر لو آگے مجھے یقین ہے تم اپنا راستہ خود بنا لو گے۔ میں بھی اسی کالج کا طالب علم ہوں اگر تمہیں میری ضرورت پڑی تو میں تمہارے قریب ہی ہوں گا۔ میں نے ہیڈ کلرک سے بات کر لی ہے۔ گورنمنٹ کے ایک کوارٹر میں دوسرے دو کلرکوں کے ساتھ تمہارے رہنے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ سلیم دوسرے دن آ کر عامر کو اپنے ساتھ لے کر گیا۔ ہیڈ کلرک کا نام امیر تھا کافی سلجھا ہوا اور اخلاق سے ملنے والا انسان تھا۔ وہ عامر کی قابلیت سے کافی متاثر ہوا اور اسے نوکری کی پیشکش مل گئی۔ عامر سے زیادہ سلیم خوش نظر آ رہا تھا۔

عامر نے آفس میں کام شروع کیا تو اسے احساس ہوا کہ نومولود پاکستان کے وسائل زیادہ نہیں تھے۔ متحدہ ہندوستان کے خزانے سے پاکستان کا حصہ ابھی تک ہندوستان کے پاس تھا۔ لیکن محبّ الوطنی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنے گھروں سے کاغذ پنسل اور روشنائی تک لا کر آفس کا کام چلا رہے تھے۔

عامر کو وہاں کام کرتے ہوئے پانچ سال گزر گئے۔ ہیڈ کلرک امیر اس کی کارکردگی اور اس کے اخلاق کی وجہ سے عامر کی بے انتہا عزت کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عامر کی تعلیم اس کلرکی کی نوکری سے بہت اونچی ہے اور وہ ہمیشہ اس کی ترقی کے مواقع کے تلاش میں رہتا تھا۔ ان پانچ سالوں میں سلیم نے ایم ایس سی مکمل کر لی اور اسی کالج میں وہ لکچرار لگ گیا تھا۔ عامر اور سلیم کبھی کبھار کالج کی کینٹین میں چائے یا لنچ ناشتے کے لئے اکٹھے مل بیٹھتے تھے۔ عامر عموماً خاموش اور اداس اداس رہتا۔ زندگی کے اس حادثے نے اس کی خوشی اس کی مسکراہٹ جیسے ہمیشہ کے لئے چھین لی تھی۔ ماں باپ تایا تائی اور شیرین سے جدائی کا غم اس کے اندر اسے ایک ناسور کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ سلیم کو اس کے غم کا احساس تھا اور باوجود مخلص کوششوں کے وہ عامر کو اس کی اداسی اور تنہائی کی گہراؤں سے باہر نہیں نکال سکا۔

پھر ایک دن ہیڈ کلرک امیر نے خوشی خوشی عامر کو بتایا کہ وہ ہمیشہ سے عامر کے لئے اس کی تعلیمی قابلیت کے برابر کی نوکری کی تلاش میں تھا۔ اور آج اس کے ایک دوست مشرف نے اسے بتایا ہے کہ کراچی میں اسلامیہ سائنس کالج کی سائنس لیبارٹری میں انسٹرکٹر کی ضرورت ہے اور امیر چاہتا ہے کہ اس نوکری کے لئے عامر درخواست دے اس نے عامر کو بتایا کہ درخواست اور انٹرویو ایک رسمی کاروائی ہے

۔اس نے بات کر لی ہے۔نوکری اس کی قابلیت کے مطابق ہے تنخواہ بھی کلرکی کی نوکری سے زیادہ ہے اور کہا کہ تم کراچی جانے کا انتظام کرو وہاں میرا دوست مشرف تمہیں اسٹیشن پر لینے آئے گا۔اس کے ہاتھ میں تمہارے نام کی تختی ہوگی تم اسے پہچان لوگے۔اور انٹرویو کے بعد وہ تمہیں واپس اسٹیشن پر بھی چھوڑ دے گا۔

عامر کراچی ریلوے اسٹیشن پر اترا تو مشرف اس کے نام کی تختی لئے کھڑا تھا۔راستے میں مشرف نے اسے بتایا کہ اس کی نوکری نائنٹی نائن پرسینٹ % ninty nine پکی ہے۔چونکہ تمہارے پاس تمہاری بی ایس سی کی سند نہیں ہے اس لئے دو پروفیسر تمہاری قابلیت کا امتحان لیں گے۔نوکری ملنے کے بعد کالج کے ایڈمنسٹریشن والے ہندوستان میں تمہارے کالج سے تمہاری ڈگری کی کاپی کے لئے درخواست بھیجیں گے

انٹرویو اور ٹیسٹ کے بعد عامر کو نوکری کی مل گئی۔مشرف نے عامر کو مبارک باد دی اور کہا امیر نے جتنی تمہاری قابلیت اور اخلاق کی تعریف کی تھی یہ ناممکن تھا کہ تمہیں یہ نوکری نا ملتی۔اس نے عامر کو بتایا کہ یہاں کراچی میں کئی مالک مکان اپنے گھروں کے کچھ حصے یا کمرے کرایوں پر دے دیتے ہیں۔میں نے تمہارے لئے اپنے ایک جاننے والے سے بات کی ہے اس کے مکان کا اوپر والا حصہ خالی ہے چھوٹا سا ہے تمہارے لئے ٹھیک رہے گا۔ابھی تمہارے واپس جانے میں کافی وقت ہے جانے سے پہلے دیکھ لو پسند آیا تو اچھا ہوگا جب نوکری پر آؤ گے تو رہنے کا انتظام ہوگا۔گھر کالج سے بھی دور نہیں۔عامر نے کہا میں آپ کا بہت احسان مند ہوں ضرور دیکھ لیتے ہیں۔مالک مکان بہت اخلاق سے ملا اتفاق سے اس کا نام بھی مالک تھا۔اوپر کے حصے میں دو چھوٹے سے کمرے اور کچن تھا۔ضرورت کا تھوڑا بہت سامان موجود تھا اوپر آنے جانے کا راستہ گھر کی پچھلی طرف سے تھا۔عامر کو پسند آیا۔

دو ہفتے کے بعد عامر کراچی آ گیا۔اپنی نئی نوکری سے بہت مطمئن تھا۔جن جن پروفیسروں سے اور لیبارٹری میں کام کرنے والوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا سبھی بہت خوش اخلاق تھے۔خاص طور سے لیبارٹری کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بیس بائیس سال کا لڑکا عامر کو بہت پسند تھا اس کا نام ساحر تھا۔اس کے ساتھی مذاق سے اسے جادوگر پکارتے تھے۔بے حد ہنس مکھ اسے دیکھ کر عامر کو ایسا لگتا تھا جیسے مسکراہٹ اس کے چہرے کا ایک مستقل حصہ ہو سارا وقت کام میں مصروف رہتا اور دبی آواز میں گنگناتا رہتا تھا۔ایک دن عامر نے اس سے پوچھا تم سارا وقت گنگناتے رہتے ہو کیا گھر پر بھی ایسا ہی کرتے ہو تمہارے ماں باپ تو خوش ہوتے ہوں گے کہ ہر وقت گھر میں کوئی چہچہاتا رہتا ہے۔عامر نے دیکھا جیسے اس کے اس سوال سے ایک لمحے کے لئے ساحر کی مسکراہٹ اس کے چہرے سے غائب ہوگئی ہو تھوڑی دیر رک کر جیسے وہ اپنے حواس سنبھال رہا ہو اس نے عامر کی طرف دیکھ کر کہا سر میرے ماں باپ نہیں ہیں میں جب چھ سات سال کا تھا اس وقت ملک کا بٹوارہ ہوا ہم ہندو تھے میرے ماں باپ کو قتل کر دیا تھا میں اپنی جان بچانے کے لئے گلی میں بھاگ رہا تھا کہ محلے کی مسجد کے مولوی صاحب نے مجھے مسجد میں چھپا لیا تھا۔

انہوں نے کافی عرصہ مجھے چھپائے رکھا پھر میں مسلمان ہوگیا۔پہلے آسمان کی طرف دیکھ کر بھگوان سے مانگتا تھا اب اللہ سے مانگتا ہوں پہلے سریندر کہلاتا تھا اب مولوی بابا کے کرم اور عنائت سے ساحر کہلاتا ہوں اور اب ان ہی کے پاس رہتا ہوں۔عامر اس وقت اس کی آنکھوں میں نمی کو دیکھ رہا تھا عامر نے اسے گلے سے لگا کر افسوس کا اظہار کیا اور اسے خوش رہنے کی تلقین کی۔عامر واپس اپنے دفتر میں بیٹھا کافی دیر تک سوچتا رہا اس چھوٹے سے لڑکے نے اپنی اس مسکراہٹ کے پیچھے کتنا بڑا غم چھپا رکھا ہے اسے اپنا اپنے ماں باپ تایا تائی امی اور شیرین کا خیال جو وہ اب تک ایک لمحے کی لئے بھی نہیں بھول پایا تھا اور اب تک ان کی تلاش میں سرگرداں تھا ان سے جدائی کے حادثے نے اس کی خوشی اس کی مسکراہٹ چھین لی تھی۔وہ سوچنے لگا شاید ساحر کا زندگی کے ساتھ یہ ہنس مکھ رویہ میرے لئے قدرت کی طرف سے کوئی اشارہ ہے کوئی سبق ہے کہ تم جو ہر رات سونے سے پہلے اللہ سے دعا کرتے ہو کہ یہ سب ایک ڈراونا خواب ہو اور جب جاگوں تو سب کچھ ویسا ہی ہو وہی گھر وہی پیپل کا درخت وہی شیرین امی ابا، تایا تائی اماں۔یہ ڈراونا خواب نہیں ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت سے سمجھوتہ کرنا سیکھو۔

عامر کو اب پاکستان میں تقریباً پندرہ سال ہوگئے تھے ساحر جادوگر کو دیکھ دیکھ کر اس نے بھی زندگی اور حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا تھا۔

ایک دن یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا جس سے عامر بہت قریب تھا اس کا انتقال ہوگیا اس کے جنازے میں عامر اور یونیورسٹی کے بہت لوگ شامل تھے۔قبرستان میں دفنانے کے بعد کچھ فاصلے پر عامر کی ایک درخت پر نظر پڑی پیپل کا درخت بلکل ویسا ہی جیسا اس کے گھر کی پچھلی کی طرف تھا۔وہ درخت جیسے عامر کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا عامر درخت کے پاس کھڑا کافی دیر تک درخت کو دیکھتا رہا۔وہی ہوا سے جھومتے پتے اور ان میں سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی کرنیں۔اس نے مڑ کر دیکھا اسے دور سے ایسا لگا جیسے ایک قبر کے کتبے پر شیرین نام لکھا ہوا ہو وہ جلدی سے قبر کے قریب گیا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اس نے اور قریب ہو کر دیکھا بار بار پڑھا۔[شیرین زیدی دخترِ کبیر زیدی (اپریل انیس سو ستائیس۔دسمبر انیس سو باسٹھ] یہ تو اسکی شیرین کی قبر ہے وہی تایا ابو کا نام وہی اس کی پیدائش کا سال وہ جیسے سکتے میں آ گیا ہو۔اس سے اپنے ہوش سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔اس نے دیکھا وہ گورکن پرفیسر کی قبر پر پتھر چن رہا تھا۔عامر جلدی جلدی چلتا ہوا اس کے پاس گیا معذرت کر کے پوچھا۔وہ درخت کے پاس ایک قبر ہے اس کے بارے میں آپ مجھے کچھ بتا سکیں گے وہ میرے تایا کی بیٹی میری منگیتر کی قبر ہے جسے میں پچھلے پندرہ سال سے تلاش کر رہا ہوں۔گورکن کچھ دیر تک عامر کو حیرانی سے دیکھتا رہا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی انہونی سی بات سن رہا ہے وہ فوراً اس کے ساتھ شیرین کی قبر پر گیا۔عامر نے ایک ہی سانس میں اسے ساری کہانی سنا دی گورکن نے آسمان کی طرف دیکھ کر جیسے اللہ سے شکوہ کر رہا ہو کہنے لگا اے اللہ تمہارے کرشمے بھی کیسے ہیں ملایا اور نہیں بھی ملایا اپنے راز تو خود ہی جانتا ہے شاید اس میں بھی تمہاری کوئی مصلحت ہو۔اس نے عامر کو

بتایا کہ کوئی چھ ماہ پہلے ایدھی سنٹر کی طرف سے انہیں یہاں لایا گیا تھا یہ ان کے ایک تعلیمی مرکز میں معلّمہ تھیں جنازے میں بہت لوگ تھے خاص طور سے ان کے طالب علم کی بہت تعداد تھی لگتا تھا وہ سب میں بہت مقبول تھیں مجھے یاد ہے دفناتے وقت مولوی صاحب نے درخواست کی تھی کہ ان کے والد آ کر قبر پر مٹی ڈالیں لیکن بتایا گیا تھا کہ وہ اکیلی تھیں ان کا کوئی نہیں۔

عامر نے پہلی بار کسی کو اپنی پوری درد بھری کہانی سنائی تھی گورکن کو یہ سب سن کر تعجب بھی ہو رہا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے اور عامر پر اسے بے انتہا ترس بھی آ رہا تھا۔ عامر نے اس سے کہا وہ تھوڑی دیر وہاں قبر کے پاس بیٹھنا چاہتا ہے ۔ عامر اکیلے میں کتنی دیر تک قبر سے لپٹ کر روتا رہا سورج غروب ہوگیا اندھیرا چھانے لگا پر وہ قبر کے ساتھ لپٹا ہوا روتا رہا کچھ دیر کے بعد اسے لگا جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔ اسے نہیں معلوم وہ کب تک یوں ہی سویا رہا۔ نیند میں اسے ایسے لگا جیسے اس کے پاؤں پر کسی چیز نے کاٹا ہو اس نے اپنے پاؤں کو زور کا جھٹکا دیا دوسری بار ٹانگ کو جھٹکا دینے کی کوشش کی تو جیسے اسکی ٹانگ میں طاقت نہیں رہی ہو ۔ اس پر آہستہ آہستہ غنودگی سی طاری ہونے لگی اسے ایسا لگا جیسے اس کے جسم میں خون کی بجائے برف دوڑ رہی ہو۔

دوسری صبح گورکن قبروں کی دیکھ بھال کے لئے آیا اسے دور سے لگا جیسے عامر ابھی تک قبر کے ساتھ لگا سو رہا ہے۔ وہ جلدی سے قبر کے قریب گیا عامر کو دیکھ کر۔ کہنے لگا میرے خدا کیا یہ ساری رات یہیں رہا ہے۔ اس نے قریب ہوکر دیکھا عامر قبر سے جیسے بغل گیر ہوکر سویا ہوا ہے اس نے اسے جگانے کی کوشش کی تو دیکھا اس کا پورا بدن نیلا پڑ گیا تھا اور اس میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے اسے یقین ہوگیا کہ کسی انتہائی زہریلے جانور نے اسے کاٹا ہے۔ اس نے پولیس کو اطلاع دی پولیس عامر کے مردہ جسم کو اسپتال لے جانے لگی تو گورکن نے ساتھ جانے کو کہا۔ اس نے پولیس کو عامر کا نام اور اس کے آفس کا پتہ بتایا۔ پولیس نے آفس پہنچ کر اس کے گھر کا پتہ اور دوسری ضروری معلومات کی اور بتایا کہ عامر کا انتقال ہوگیا ہے تو وہاں کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے پولیس وہاں سے اس کے گھر پر پہنچی۔ دروازہ کھٹ کھٹایا۔ مالک مکان مالک نے دروازہ کھولا تو وہ پولیس کو دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ پولیس نے پوچھا یہ عامر زیدی کا گھر ہے۔ مالک نے کہا ہاں وہ میرا کرایہ دار ہے۔ اوپر والی منزل میں رہتا ہے خیریت آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ پولیس نے بتایا کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے اور ہم ان کا کمرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مالک کو بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بار بار پوچھ رہا تھا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ اوپر جانے کا راستہ پچھلی گلی سے ہے وہ پولیس کے ساتھ اوپر گیا۔ عامر کے کمرے میں کوئی زیادہ سامان نہیں تھا بستر کے ساتھ میز پر خوبصورت سونے کے رنگ کی خطاطی میں فریم میں شیرین نام لکھا ہوا تھا اور اس کے آگے ایک گلاب کا پھول رکھا ہوا تھا۔ نیچے ردی کی ٹوکری میں کافی مرجھائے ہوئے گلاب کے پھول تھے۔ مالک نے پولیس کو بتایا کہ عامر ایک بہت ہی نیک اور شریف انسان تھا جب وہ اکیلے میں میرے سے بات کرتا تو آنکھ ملا کر بات کرتا تھا اور اگر میری بیوی میرے ساتھ ہوتی تو ہمیشہ آنکھیں جھکا کر بات کرتا تھا۔ بچوں کے لئے ہر روز ایک موتی چور کا لڈو لے کر آتا تھا اور انہیں دے کر کہتا تھا بانٹ کر کھالے نا۔ اب تو ایسا ہوگیا تھا بچے لڈو لیتے ہی ہنس کر شرارت سے خود ہی کہ دیتے بانٹ کر کھالینا۔ مالک نے پولیس اور گورکن سے کہا کہ وہ عامر کی تجہیز و تدفین کا سارا انتظام خود کرے گا۔ گورکن نے پولیس سے درخواست کی کہ عامر کو اس کے قبرستان میں دفنانے کے لئے لایا جائے۔ وہاں اس کی منگیتر جو اس کے تایا کی بیٹی بھی ہے دفن ہے۔

عامر کو دفنانے کے لئے لایا گیا تو اس کے جنازے میں اس کی یونیورسٹی کے بہت لوگ تھے۔ گورکن نے شیرین کی قبر کے بالکل ساتھ اس کے لئے قبر کھود رکھی تھی۔ دفنانے کے بعد سب لوگ چلے گئے تو گورکن کافی دیر تک اس کی قبر کے پاس بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کیا ایسا بھی ہوتا ہے ایسا پیار ایسی محبت۔ پھر شام ڈھلی رات آئی۔ چاندنی رات تھی وہی چاند کی کرنیں ہوا سے ہلتے پیپل کے پتے۔

وہ دونوں مٹی کی چادر اوڑھے ابدی نیند سو رہے تھے۔۔ اور اب بھی ان کے درمیان وہ مٹی کی دیوار تھی۔

## بقیہ --- تھکن کا سفر

نے قبروں کی طرف اشارہ کیا یہ سب لوگ تھک گئے ہیں آرام کر رہے ہیں جو بھی زندگی سے تھک جاتا ہے یہاں آرام کرنے آ جاتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے یہ سب ہمیں دیکھ رہے ہیں ہماری باتیں سن رہے ہیں مگر بول نہیں سکتے نا۔ تھکے ہوئے ہیں نا تم ڈاکٹر ہو اور میں بس کنڈیکٹر مجھے بتاؤ نا ہم دنیا سے کیوں نہیں تھکتے پھر ہنستے ہوئے کہتا ہے مجھے پتہ ہے ہم پاگل ہیں۔۔۔ ہم تھکنا بھول گئے ہیں ہم سب دوڑ رہے ہیں' دوڑ رہے ہیں دوڑ رہے ہیں یہ کہتے ہوئے اس نے پھر ہوا میں گیئر بدلا تو میں نے اُسے بازو سے پکڑ لیا تم نے اپنا نام تو بتایا نہیں دوست؟ وہ ہنسا۔۔۔ دوست؟ نام.....؟ میں نے کہا نا تم ڈاکٹر ہو اور میں بس کنڈیکٹر وہ ہنسا اور پھر زور سے ایک قہقہہ لگایا میں بھی پورا پاگل ہوں۔۔ ابھی تک تمہیں ڈاکٹر سمجھ رہا تھا مگر تم تو خود پاگل ہو، پاگل پاگل پاگل اب اسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا وہ ہنستا رہا ہنستا رہا اور ہاتھوں سے عجیب عجیب اشارے بھی کرنے لگا شاید اتنی دیر کی طویل اور سنجیدہ گفتگو سے اس کا کتھارسس مکمل ہو چکا تھا پھر سر جھٹک کر وہ دوڑ پڑا ہنستا ہوا قہقہے لگاتا ہوا ہوا میں سٹیئرنگ گھماتا ہوا اور گیئر پر گیئر بدلتا ہوا وہ تھکے ہوئے لوگوں کے کچے پکے سپیڈ بریکروں پر اپنی زندگی کی وہ گاڑی دوڑانے لگا جس کا وہ کنڈیکٹر بھی تھا اور ڈرائیور بھی۔۔۔

# ''منزلِ حیات''

معین الدین عثمانی
(مہاراشٹر)

نسرین کی شادی ہوئے آج دو برس کا عرصہ بیت گیا تھا۔ پتہ بھی نہ چل سکا کہ وقت اتنی سرعت کے ساتھ کیسے گزر گیا، جب وہ بیاہ کر آئی تھی گرمیوں کا موسم تھا۔ مگر اس وقت اس کی شدت میں کمی آ گی تھی۔ ویسے روانگی کی خاطر گرمیوں نے پوری طرح سے سامان نہیں سمیٹا تھا۔ مگر اس کے باوجود سردیوں کی آمد کا انتظار تھا۔

اس کے میکے سے سسرال تک کا سفر بہت دور کا تو نہ تھا مگر قریب کا بھی نہیں تھا۔ اس کے لے تو یہ بڑا ہی پر لطف اور زندگی سے بھرپور تھا۔ زندگی سے متعلق اس کی کچھ ان کہی خواہشات تھیں جو اوروں کے لئے ممکن ہے معمولی ہو سکتی تھیں مگر اس کے لیے یقینی طور پر اہم تھیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ غربت کے موسم میں جسے جینا آجائے اس کے لیے سارے موسم خود بخود بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نسرین نے اب تک کی زندگی محدود تمناؤں کی دنیا میں رہ کر ہی گزاری تھی۔ وہ تو بس اتنا چاہتی تھی کہ شوہر کما ؤ ہو اور رہنے کا گھر ایسا ہو جسے دیکھ کر لگے کہ وہ گھر ہے۔

پھر یوں ہوا کہ ایسا ہی کچھ ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے لگی تھی کہ عمر میں آتے ہی شہروز کا رشتہ آ گیا جبکہ اس نے ابھی انیسویں منزل پر ہی قدم رکھا تھا۔ گوری رنگت، سڈول جسم کی مالک نسرین ویسے زیادہ تعلیم یافتہ تو نہ تھی۔ مگر کردار کی پاکیزگی کا ماں باپ کے علاوہ پورا محلّہ گواہ تھا۔ والد مزدوری کر کے خاندان کی کفالت کرتے۔ رہنے کے لئے گھر کے نام پر معمولی سے دو کمرے تھے جن میں کسی طرح وہ اپنے ایام حیات گزار رہے تھے۔ اکثر بارش کا موسم ان کے لے مصائب کا سامان لیکر آتا، تو گرمی کے دنوں میں تپش کے مارے جان نکل جاتی تھی۔ مگر ایسے حالات میں بھی وہ سخت جاں اوروں کی طرح جی رہے تھے۔ کچھ نہ ہونے کے باوجود سب کچھ کے احساس نے ان کی زندگی کو اطمینان کی دہلیز پر لے آیا تھا۔ نسرین بھی اپنی دنیا میں خوش تھی۔ وہ اکثر رات کو سونے سے پہلے سوچ کی وادیوں میں نکل جاتی۔ جہاں وہ اپنے شوہر اور ساس سسر کے ہمراہ دو منزلہ کشادہ گھر میں رہنے لگتی۔ اس کے گھر کے سامنے بڑا سا آنگن ہے۔ جہاں نیم کا پیڑ اپنی شاخوں کے ذریعے چھاؤں بکھیر رہا ہے۔ شاخوں پر بیٹھے پرندوں کی چہچہاہٹ گھر کی خاموشی میں ٹھنڈک کے ساتھ نغمہ بار ہے۔ ایسے ہی خوابیدہ تصورات کی آغوش میں اس کے دن راتوں میں تبدیل ہو رہے تھے کہ ایک دن خوابوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ اور آج وہ اپنے سسرال میں تھی۔

سسرالی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے روزمرہ کی زندگی کی کایا ہی پلٹ دیتی ہے۔ عموماً لڑکی جب رخصت ہو کر آتی ہے تو اپنے ساتھ جہیز کے ہمراہ خوابوں کی پوٹلی بھی سمیٹ کر لاتی ہے۔ جہیز کا سامان تو سسرالی لوگوں کی بھینٹ چڑھ جاتا مگر خوابوں کی پوٹلی کو وہ بڑے جتن سے سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ اس میں کیا کیا نہیں ہوتا۔ گھر آنگن چھوٹنے کے کرب کا مداوا، ماں باپ، بھائی بہنوں سے اچانک دوری کے احساس کی للک، مستقبل کے منصوبوں کی دستاویز کے ساتھ آیندہ کی زندگی کا نقشہ بھی وہ اپنی پرنم پلکوں کی سیج پر سجا کر، سنوار کر لاتی ہے۔ اور اسے نیے گھر کی در و دیوار سے وابستہ کرنے کی خواہشمند ہوتی ہے۔ وہ صبح کاذب کے صبح صادق میں تبدیل ہونے کی منتظر رہتی ہے۔ مگر خوابوں کی دنیا ہمیشہ حقیقت سے پرے ہی رہتی ہے۔ میکے میں طلوع ہونے والا سورج سسرال میں حقیقت کا روپ دھار کر ہی نکلتا ہے۔ وہ اپنے ہمراہ روشنی کے ساتھ کچھ اور ہی پیغام بھی لاتا ہے۔

ایک ایسا ہی نامعلوم سا پیغام جس میں زندگی کی رمق تو تھی مگر اس پر جدوجہد کی ردا بھی لپٹی ہوئی تھی۔ جسے ہٹانے میں شام کے سایے بتدریج گہرا جاتے۔ اور آنکھوں میں کھبکنے والے یہ دھندلکے اسے کوئی اور ہی کہانی سنانے لگتے۔ اسی پر بس نہیں ہوتا رات کے سناٹے اس کی خوشیوں کو رفتہ رفتہ دامن سے اچکنے لگتے تو وہ بے چین ہونے لگتی۔ اور رات کی تنہائی میں خدا کے حضور فریاد کرنے لگتی کہ صنف نازک کی یہ آزمائش کب تلک جاری رہے گی۔ اس کی آواز پتہ نہیں کیوں کمرے کی چہار دیواری سے ٹکرا کر صدائے بازگشت کی طرح کانوں میں لوٹ آتی۔

وہ جب آئی تھی تو شوہر نے اسے آنکھوں پر بٹھایا تھا۔ فرط جذبات سے جب بھی وہ مغلوب ہوتا تھا تو کہنے لگتا" نسرین تم میرے خوابوں کی حور ہو۔ اس گھر کے آنگن کو پھولوں سے سجا دینا۔ ایسے میں وہ بھی خوشی سے جھوم جاتی اور کہنے لگتی۔" تمہارا سپنا ہی اب میرا مقصد حیات ہے"

مگر یہ کیا دو برسوں ہی میں اسکے گھر والوں کا رویہ بدل گیا تھا۔ اس کے ساتھ غیروں کی طرح برتاؤ ہونے لگا تھا۔ جس کے سبب زندگی اجیرن ہو گی تھی۔

وہ سوچنے لگی کہ میکے میں تھی تو والدین کی قید میں تھی۔ سسرال آئی تو سسرالی قید میں آ گی۔

قید خانہ وہاں بھی تھا اور ادھر بھی ہے۔ فرق کیا ہے؟ صرف قید خانے کے پہرے دار ہی تو بدلے ہیں۔ قید تو بہر حال دونوں جگہ تھی۔

سورج کی کرنیں ابھی گھر کے آنگن میں پوری طرح پھیلی بھی نہ تھی کہ سامنے سے گزرنے والے شخص پر اس کی نظر پڑی۔ اس کے ہاتھوں میں بچوں کے کھیلنے کے لئے بنایا گیا پنجرہ تھا، جسکی تیلیوں کے پیچھے دبک کر بیٹھی مینا سہمی سہمی نظروں سے آس پاس کے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور بچوں کے شور وغل سے پیچھے کی جانب سمٹ رہی تھی۔ پنجرے والے کی آواز اسے میلوں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تو اسے لگا جیسے پنجرہ ہی اس کا مقدر ہے۔ میکے میں تھی تو ماں باپ کے پنجرے میں تھی۔ ذرا سی غلطی پر باپ کی پھٹکار تو صبح سے شام تک امی کی ہدایات۔ یہ مت کرو، وہ مت کرو۔ ادھر مت بیٹھو ادھر مت جاؤ۔ بھائی تو چھوٹا تھا مگر پھر بھی کیسے حکم چلاتا تھا۔

باقی صفحہ آخیر پر ملاحظہ کیجیے

# "خوشی کے قصیدے"

## ارشد سعید
(آسٹریلیا)

دل دھڑکنے کی اب صدا سُنیے — خامشی میں خدا خدا سُنیے
کچھ تو کیجیے گا پُرسشِ احوال — بے نواؤں کی کچھ نوا سُنیے
اُس کی آنکھیں بنی ہیں کاغذ پر — ایک اک لفظ بولتا سُنیے
میرے دُشمن بھی خیریت سے ہوں — چوٹ کھائی ہے یہ دُعا سُنیے
پیڑ بھی ہمکلام ہوتے ہیں — کچھ تو کہتی ہے یہ ہَوا سُنیے
کوئی غم ہے جو مستقل سا ہے — دل کی سسکی ذرا ذرا سُنیے
رات یوں نہیں اداس ارشدؔ — کوئی تو ہے غزل سرا سُنیے

○

## تصور اقبال
(پنڈی گھیب)

جن کے ہاتھوں میں غم کے جریدے رہے — اُن کے لب پر خوشی کے قصیدے رہے
جسم آتش میں رکھ کر جو سیدھے کیے — عمر بھر پھر وہ ہر طور سیدھے رہے
اُن کی چشمِ کرم جن پہ پڑتی رہی — اُن کی محفل میں پھر وہ چنیدہ رہے
جن پہ پھل لگ گیا تھا بفضلِ خدا — وہ شجر مستقل پھر خمیدہ رہے
اُن سے پہلو بچا کر چلے ہم سدا — جن کے دو دو تصورؔ عقیدے رہے

○

## شاہد کمال
(لکھنؤ)

ہونا اگر یہی ہے تو بے حساب ہو — وہ کون ہے جو میری طرح سے خراب ہو
لازم نہیں کہ تیرا نشانہ خطا کرے — ممکن نہیں کہ میرا ہدف کامیاب ہو
دستِ ہوس کو بند قبا کھولنے تو دے — شاید کہ آج پھر کوئی چہرہ گلاب ہو
لگتا ہے مجھ کو تیری محبت بھی ان دنوں — جیسے کسی غریب کی آنکھوں کا خواب ہو
یہ کیا ہوا کے اپنے مکینوں کو کھا گئی — ان بستیوں پہ جیسے خدا کا عذاب ہو
کس کام کی یہ خوفِ خدا کی حکایتیں — قتلِ حسینؑ بھی جہاں کارِ ثواب ہو
جس دن زبانِ میرؔ میں وہ گفتگو کرے — شاہد کمال اُس کی غزل لاجواب ہو

○

## مشتاق عاجز

(اٹک)

۔ جواں سال بیٹے کی ناگہانی موت پر۔

کچھ دن ہوئے کہ شہرِ تمنا اداس ہے — دل کیا اجڑ گیا ہے کہ دنیا اداس ہے
گہنا گیا ہے جب سے مرے گھر کا آفتاب — تاروں کا روپ، چاند کا چہرا اداس ہے
لگتا ہے تتلیوں کے کوئی رنگ لے اڑا — لگتا ہے جگنوؤں کا اجالا اداس ہے
کہتے ہیں ایک شخص کی دنیا اجاڑ کر — نادم ہے، شرمسار ہے، دریا اداس ہے
دو لخت ہو گیا ہے جہان تصوّرات — آدھے میں چہل پہل ہے، آدھا اداس ہے
اب دیکھتا ہے مجھ کو تو کہتا ہے آئنہ — "بچہ بچھڑ گیا ہے تو بوڑھا اداس ہے
عاجزؔ کسی بھی حال میں شکوہ روا نہیں — کیا تو بھرے جہاں میں اکیلا اداس ہے

○

## ڈاکٹر ثروت رضوی

(سری نگر)

حکم ہے خاص تو تعمیل جاتی ہے — فکر الفاظ میں تحلیل ہو جاتی ہے
نور ایسا ہے حسن لکھا جو خامے نے مرے — خاص تحریر ہے قندیل ہو جاتی ہے
آپ ص سے ایسی شباہت ہے نواسے کی شہا — منقبت نعت میں تبدیل ہو جاتی ہے
کھل گیا بابِ صلح سبط نبی سے گویا — اک نئے باب کی تشکیل ہو جاتی ہے
امن ہی امن ہے اسلام کا مطلب واللہ — ان کے پیغام کی ترسیل ہو جاتی ہے
آپ کے نام سے منسوب ہوا ہوں جب سے — خود مرے نام کی تفضیل ہو جاتی ہے
العجل کہتے ہوئے معجزہ دیکھیں گے کبھی — العجل کہتے ہی تعجیل ہو جاتی ہے
حرف و معنی میں رہے کھلتے حسن کے اوصاف — گویا آیات کی تاویل ہو جاتی ہے
ثروت حرف و سخن، نطق و بیاں سے بھرپور — یہ خرد ہے کوئی زنبیل ہو جاتی ہے

○

## شاہد رضوان

(چھچھ وطنی)

ہم وفا کرتے رہے اس نے ستم کوشی کی — کوئی حد ہوتی ہے احسان فراموشی کی
جا کے مے خانے میں ہوتے ہیں مرے ہوش بحال — اور تدبیر کی جائے کوئی مدہوشی کی
وضعداری کوئی سیکھے تو ہمارے دل سے — خون دل دے کے درِ یار پہ گل پوشی کی
ہم میں یہ بات بنی ترک تعلق کا سبب — جب بھی غیروں نے ترے کان میں سرگوشی کی
کون سا مخفی ہے بھید اس میں خدا ہی جانے — اختیار اس نے مری بات پہ خاموشی کی
کچھ دنوں سے دلِ محزوں کی عجب حالت ہے — لوگ برباد ہوئے تم نے ذرا شوخی کی

○

## طارق تاسی

(لاہور)

خواب میرے پاس آیا، اور پھر — نیند سے مجھ کو جگایا اور پھر
دھوپ کا ٹکڑا سر دیوار تھا — بن گیا وہ ایک سایا ، اور پھر
اک وہی جو باعثِ تکرار تھا — دے دیا اُس نے بقایا اور پھر
زندگی نے زندگی بھر دیا ہے — دوستو! کتنا رلایا، اور پھر
موت سے مل کر گلے جاتے رہے — تب گلے اُس نے لگایا، اور پھر
بات دل کی جب لبوں تک آ گئی — ہاتھ کو اُس نے دبایا، اور پھر
درد میں گوندھی ہوئی اِس خاک کو — چاک پر اُس نے گھمایا اور پھر
تھک گیا تاسی شبِ غم ناچ کر — یار کو اُس نے منایا اور پھر

○

## نورافشاں

(رامپور)

دل میں نئی امنگیں جگاتی ہیں چوڑیاں — کیا کیا نہ خواب ہم کو دکھاتی ہیں چوڑیاں
عورت کا یہ وقار ہے عورت کا ہے سنگھار — یوں بھی ہر ایک دل کو لبھاتی ہیں چوڑیاں
پیدا گھروں میں کرتی ہیں اکثر یہ رونقیں — رشتوں میں چار چاند لگاتی ہیں چوڑیاں
چاندی کی ہو کہ سونے کی پیتل یا کانچ کی — کھن کھن سے اپنی سمت بلاتی ہیں چوڑیاں
نیلی ہو پیلی سبز گلابی کہ سرخ ہو — ہر رنگ میں رنگ اپنا دکھاتی ہیں چوڑیاں
افشاں تھی چوڑیوں کی کھنک جن کو کل عزیز — کہتے ہیں اب وہ نیند اڑاتی ہیں چوڑیاں

○

## مادھو کوشک

(چندی گڑھ)

کس نے اس کا درد سراہا کس نے کب پہچانی آگ — محلوں سے میں رہنے والوں کی لگتی ہے بے معنی آگ
رسم و رواج کے بندھن سے باہر ہے مستانی آگ — لاوا بن کر پھوٹ پڑے گی اک دن تو جسمانی آگ
اپنے اپنے من کی جوالا میں سب کے سب جلتے ہیں — لیکن مزہ تبھی آتا ہے جب جھیلیں بیگانی آگ
اس دن اس سماج کے سارے روئیں ریشے کھل جائیں گے — جس دن کرنے لگ جائے گی بس اپنی من مانی آگ
ٹکڑے ٹکڑے بھوک نگل کر اندھیاروں کی بستی میں — اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر مانگ رہی ہے پانی آگ
ان کی خاطر تو جینے مرنے میں کوئی فرق نہیں ہے — جنہیں وراثت میں ملتی ہے آہوں کی برفانی آگ

○

## شازیہ اکبر
(اسلام آباد)

آئینہ ہے نہ اس کی حیرانی — عکس کی نوحہ گر ہے ویرانی
اب مرا ڈوبنا نہیں ممکن — مجھ سے پہلے گزر گیا پانی
لاتعلق ہوں ہر معاملے سے — کوئی مشکل نہ کوئی آسانی
پوچھتا ہے یہ کاغذِ خالی — جو نہیں لکھا، اس کے کیا معنی
ہر خلا کے ہے بعد اور خلا — اولیں کا نہیں کوئی ثانی
کسی گریہ کی حد نہیں کوئی — ہر طرف بارشیں ہیں طوفانی
خواہشوں کے رہے، اسیر نہ ہم — اب نہیں ہے کوئی پریشانی
اس قدر بے وفا نہ تھا کوئی — جس قدر تھی ہماری نادانی
شازیہ زندگی کا انت اجل — یہ محبت مگر نہیں فانی

○

## وشال کھلر
(لدھیانہ)

تانہ بانا نہیں کہ تجھ سے کہیں — وہ زمانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
جاں بچانا نہیں کہ تجھ سے کہیں — مر بھی جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں
ہر جگہ آسماں ہے یا ہے قفس — آشیانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
کاروبارِ زیاں عجیب شے ہے — کارخانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
آگ بجھتی ہوئی کا دم بھرنا — دل جلانا نہیں کہ تجھ سے کہیں
اک چپ سی لگی ہوئی اچھی — جی رُلانا نہیں کہ تجھ سے کہیں
یک جہت تھے، جواز پیش کیا — کچھ بہانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
سب ہمیں رات کی اناعت ہے — دن سہانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

○

## شاداب انجم
(ناگپور)

فیملی میں تھے جو موٹی کھال والے رہ گئے — سارے پھوپھا چل بسے، بھوپال والے رہ گئے
جتنے برتن تھے اضافی، کھا گئے ہم بیچ کر — اب تو گھر میں صرف استعمال والے رہ گئے
کر رہی ہے ساری دنیا آن لائن لین دین — اب کہاں کچھ کام کے ٹکسال والے رہ گئے
مچھلیاں بجلی کے تاروں سے چپک کر مر گئیں — اور منہ تکتے بچارے جال والے رہ گئے
بس کبڈی کھیلنے والے ہیں نمبر ون یہاں — سب سے پیچھے ملک میں فٹ بال والے رہ گئے

○

## ذکی طارق بارہ بنکوی

(اترپردیش)

ان کے بن گردشِ روز و شب دیکھئے — مجھ پہ ڈھاتی ہے کیا کیا غضب دیکھئے
میں نے جو مانگا اس نے عطا کر دیا — مہرباں مجھ پہ ہے کتنا رب دیکھئے
حسن میں کیا بلا کا ہے آیا نکھار — اس کو آکر ذرا آپ اب دیکھئے
سرخ رخسار ہوتے ہیں کیا دیدہ زیب — جب وہ غصے میں ہو اس کو تب دیکھئے
ایسے کیسے بھلا مان جائے گا وہ — اس کی ناراضگی کا سبب دیکھئے
مر کے بھی زندہ ہیں غالب اقبال میر — یہ ہے معیار علم و ادب دیکھئے
کیا وہ خوشیوں کا تعویذ ہے پا گیا — ہنستا ہی رہتا ہے اس کو جب دیکھئے
تب چلے گا پتہ کتنے فیاض ہیں — ان سے کچھ آپ کر کے طلب دیکھئے

○

## محبوب اصغر

(حیدرآباد)

نفرتوں ہی سے ہم نے نفرت کی — اور محبت ہی سے محبت کی
خیر سے ہم تو گھر میں قید ہوئے — کیا ہوا آپ نے جو ہجرت کی
پھر بھی مدقوق ہے پذیرائی — فکر نے روز و شب ریاضت کی
رات پچھلے پہر جو خواب ہوا — اک کہانی تھی بچھڑی ساعت کی
بہتے لمحوں پہ کشتیاں ہیں رواں — رطب و یابس کی رنج و راحت کی
نکتہ سنجی نہ ہی عیارِ نظر — تجزیہ کار نے جراحت کی
رال ٹپکائی ہے ہوس نے جب — نفس نے گندگی کی دعوت کی
کرنا موضوعِ شعر گلبدنی — وہ تو پڑیا ہے ایک آفت کی
گردِ ابہام شعر کے رخ پر — ہم نے یوں شعر کی حفاظت کی
گونگے الفاظ بے بصر لہجے — گفت نے فہم سے صراحت کی
بھیڑ نے فرد پر کیا حملہ — معنویت کھلی شجاعت کی
کب تلک ہوسکے گا ضبطِ نفس — ٹوٹ جائے گی سانس ہمت کی
روبرو آئینے کے ہوجائیں — جن کو عادت پڑی ہے غیبت کی
جرم دانستہ کرنے والوں پر — بات کھلتی نہیں نصیحت کی
سب ہی بیمارِ ذہن و دل جو ہوئے — کس کو کس کی ہے سدھ عیادت کی
دورِ کذاب ہے میاں اصغر — جستجو ہے عبث صداقت کی

○

.... ناول ....

# خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار

(میامی)

قسط ..... ۱۲

''ابے اُٹھو بے اُٹھو۔۔۔ والو۔۔۔ بات ہوئی تھی منہ اندھیرے نکلنے کی۔۔۔ اب تو سورج سر پہ آن پہنچا۔۔۔ اور تم۔۔۔ چوتڑ اُلال کے پڑے ہو۔۔۔!(غیاث نے عمران اور وجے کی پشت پر دھپ مارتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا)

''یااللہ خیر۔۔۔ قیامت آ گئی۔۔۔ یا۔۔۔ زلزلہ۔۔۔؟(عمران نے آنکھیں ملتے ہوئے دائیں بائیں نظر دوڑا کر غصّے اور حیرت کے ملے جلے اظہار پر غیاث خاموش نہ رہ سکا)

''قیامت بھی آئے گی۔۔۔ اور۔۔۔ زلزلہ بھی۔۔۔ ساتھ میں مولا بخش۔۔۔ یا۔۔۔!''(غیاث نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر عمران اور وجے کی کیفیت سے لطف اندوز ہونا مناسب جانا)

''کس ماں کے فلانے میں اتنی جرأت ہے۔۔۔ جو مابدولت کی جانب۔۔۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھے۔۔۔!''

''ہاں جی۔۔۔ تمہیں کون دیکھ سکتا ہے آنکھ اُٹھا کے۔۔۔ لاٹ صاب لگے ہونا۔۔۔!''(عمران کی بڑ پر وجے کمار چپ نہ رہ سکا)

''لاٹ صاب نہ سہی۔۔۔ لاٹ صاب کا بیٹا تو ہے۔۔۔!(غیاث کے غیر شریفانہ اشارے پر عمران کھسیانہ ہو کر غیاث پر جھپٹا)

''بھائی نی۔۔۔ بھائی نی۔۔۔ قسم سے مذاق کر رہا تھا۔۔۔ یہ لے۔۔۔(کانوں کو دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے دباتے ہوئے)

''کھال میں رئیو۔۔۔ کھال میں۔۔۔ ورنہ۔۔۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے چیر دوں گا۔۔۔!''

''مر گئے مردود۔۔۔ فاتحہ نہ درود۔۔۔!''(اس بار تو عمران سچ مچ جلال میں آ گیا)

''۔۔۔ تم چیرو۔۔۔ نہ چیرو۔۔۔ ہوٹل والے۔۔۔ چیریں گے بھی اور پھاڑیں گے بھی۔۔۔!''

''پنڈت جی۔۔۔! تم زیادہ بقراطی مت جھاڑا کرو۔۔۔ سمجھ آئی۔۔۔!''(غیاث کو بھول کر وجے کے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے عمران نے بزرگانہ مشورہ دیا تو وجے کمار حیران ہو کر بولا)

''یہ بکراتی کیا ہوتی ہے۔۔۔؟''

''بکراتی نہیں میری جان۔۔۔ بقراطی۔۔۔ سمجھ آئی۔۔۔ یا۔۔۔ اپنے طریقے سے سمجھاؤں۔۔۔!''

''تیرا طریقہ کیا ہے بھئی۔۔۔ پہلے تُو سمجھا دے۔۔۔!(اب وجے اور غیاث آمنے سامنے تھے)

''ما۔۔۔ پہلے بقراط سے سُلٹ لو۔۔۔ پھر۔۔۔ ایک دوسرے سے۔۔۔ نبٹ لینا۔۔۔!''

''تو بتلائے گا۔۔۔ یا۔۔۔ میں بتلاؤں۔۔۔؟''

تو ہی۔۔۔ لے۔۔۔!

''میری جان۔۔۔! بقراط ایک بڑا دانشور فلاسفر ہوا ہے یونان میں قریب ڈھائی ہزار سال پہلے۔۔۔ مگر۔۔۔ ہمارے لیے اس وقت بقراط سے زیادہ اُس کے استاد۔۔۔ سقراط کو جاننا۔۔۔ بلکہ۔۔۔ اُس کی نصیحت پر عمل کرنا ضروری ہے۔۔۔!''

لو۔۔۔ اور چُوسو۔۔۔! یہ تو وہی بات ہوئی:

''ساری رات روئے ایک نہ مرا۔۔۔ مرا تو صبح چار بجے اُٹھ کے بھاگ گیا۔۔۔!''

''یار۔۔۔ تُو۔۔۔ لے۔۔۔ یا۔۔۔ مجھے۔۔۔ نے دے۔۔۔!''

''تو زیادہ اچھے سے۔۔۔ ہے۔۔۔!''

''وجے بھائی پہلے لوگ باگ یہ سمجھتے تھے۔۔۔ کہ۔۔۔ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔۔۔ پہلی بار سقراط نے یہ ثابت کیا۔۔۔ کہ۔۔۔ سورج نہیں۔۔۔ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔۔۔ بس پھر کیا تھا۔۔۔ پورا یونان سقراط کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گیا۔۔۔ ایک ہی شرط تھی اہلِ یونان کی۔۔۔ یا۔۔۔ سقراط اپنی بات واپس لے۔۔۔ یا۔۔۔ موت کے لیے تیار ہو جائے۔۔۔ سقراط کے دوست احباب اور شاگردوں بقراط اور افلاطون نے۔۔۔ سقراط کو اپنی بات واپس لینے کا مشورہ۔۔۔ بلکہ زور دیا۔۔۔ مگر۔۔۔ سقراط اپنی بات پہ ڈٹا رہا۔۔۔ کہ۔۔۔ زمین نہ صرف گول ہے۔۔۔ بلکہ۔۔۔ سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔۔۔ سقراط کو اپنی جگہ اٹل دیکھ کر۔۔۔ سقراط کے شاگردوں۔۔۔ بقراط اور افلاطون نے نہ صرف سقراط کو جیل سے بھاگنے کا مشورہ دیا۔۔۔ بلکہ۔۔۔ اس فرار کے تمام انتظامات بھی اپنے ذمے لے ڈالے۔۔۔ مگر۔۔۔ سقراط نے۔۔۔ فرار کے مشورہ کو حقارت سے ٹھکراتے ہوئے کہا۔۔۔ یہ تو میرے نظریہ کی ہار۔۔۔ اور۔۔۔ مخالفین کی جیت ہو گی۔۔۔!

''پھر۔۔۔!''

''پھر کیا۔۔۔! اُس وقت کی یونانی روایت۔۔۔ اور۔۔۔ سقراط کے بلند مقام و مرتبے کے پیشِ نظر۔۔۔ سقراط نے۔۔۔ ہنستے ہنستے۔۔۔ زہر کا پیالہ پی کر۔۔۔ موت کو گلے لگا لیا۔۔۔ مگر۔۔۔ اپنے نظریہ کی سچائی پر آنچ نہ آنے

دی۔۔۔!''

''میرٹھ میں کہاں ملتا ہے زہر۔۔۔؟''

''کیوں۔۔۔؟''(عمران نے وجے کے سوال پر حیرانی سے پوچھا)

''تو ہی تو کہہ رہا تھا کہ سکرات نے سچائی کے لیے جان دی تھی۔۔۔؟''

''پھر۔۔۔؟''

''پھر یہ کہ۔۔۔ ہمارے پاس ہوٹل والوں کا بل ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔۔۔ لہٰذا۔۔۔ ہمیں سکرات کے طریقے پر چلتے ہوئے زہر کھا کر جان دے دینی چاہیے؟''

''ایک بات کہوں۔۔۔!''

''بول۔۔۔!''

''تُو بہت بڑا۔۔۔ ہے۔۔۔!''

''میں اکیلا۔۔۔؟''

''اور نہیں تو کیا۔۔۔!''

''تم دونوں۔۔۔ تیل لینے جاؤ گے۔۔۔؟''

''ابے اُلّو کے جنے۔۔۔ سقراط نے یہ بھی کہا تھا۔۔۔ انسان کم از کم تین طرح کے ہوتے ہیں۔۔۔ ایک اوسط سے کم عقل والے۔۔۔ دوسرے اوسط عقل والے۔۔۔ تیسرے اوسط سے زیادہ عقل والے۔

۱۔ اوسط سے کم عقل والے انسانوں پر بات کرتے ہیں۔

۲۔ اوسط عقل والے واقعات پر بات کرتے ہیں۔

۳۔ اوسط سے زیادہ عقل والے آئیڈیاز پر بات کرتے ہیں۔

بات آئی بھیجے میں۔۔۔ یا۔۔۔ ڈھکن کھول کے ڈالوں۔۔۔؟''

''آگے بول۔۔۔ آگے۔۔۔!''

''یہ تو پتہ نہیں۔۔۔ کہ۔۔۔ ہم تینوں کا شمار۔۔۔ کس نمبر کے عقل مندوں میں ہوتا ہے۔۔۔ ہوتا بھی ہے۔۔۔ کہ نہیں۔۔۔ مگر۔۔۔ آئیڈیا ہے بڑے کام کا۔۔۔!''

''جلدی بول جلدی۔۔۔!''

''کان آگے لاؤ۔۔۔!''(ہاتھ کے اشارے سے دونوں کو قریب بلاتے ہوئے)

''ابے تیرے کی۔۔۔ وہ مارا پاپڑ والے کو۔۔۔!''(تینوں دوستوں نے خوشی سے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے)

☆

''ایک تو اس ماں کے۔۔۔ کی کھجلی نہیں مٹتی۔۔۔ جگہ دیکھتا ہے نہ موقع۔۔۔ کُتے کی طرح ٹانگ اُٹھا کے شروع ہو جاتا ہے۔۔۔ ہاں نہیں تو۔۔۔!''

''کُتا ہوگا تُو۔۔۔ تیرا باپ۔۔۔ تیرا سارا خاندان۔۔۔ تیرے لگے سگے۔۔۔ بنا پھرتا ہے سالا نواب زادہ۔۔۔ حرکتیں دیکھو تو۔۔۔ مفت میں زبان نہ کھلوائیو۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ کچا چٹھا کھول کے رکھ دوں گا۔۔۔!''

''تُو کھولے گا۔۔۔ تُو۔۔۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔۔۔ جا پہلے منہ دھو کے آ۔۔۔ پھر کھولیو میرا کچا چٹھا۔۔۔!''

''دیکھ بے دیکھ عمران۔۔۔ تو۔۔۔ حد سے بڑھا جا رہا ہے۔۔۔!''

''تین دن۔۔۔ اور۔۔۔ چار راتوں سے۔۔۔ رہا ہوں۔۔۔ کچا چٹھا ہی تو کھول رہا ہوں اپنا۔۔۔ بقول مولوی ذاکر صاحب:

جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نور خدا کا
سائے میں شجر کے ہے اثر ظلِّ ہما کا''

''یہ مولوی ذاکر۔۔۔ شاعر کب سے ہو گئے۔۔۔؟''(غیاث نے کلس کر جواب دیا)

''ابے تُو نا۔۔۔ ایک دم۔۔۔ وہ۔۔۔ ہے۔۔۔!''

''وہ کیا۔۔۔؟(وجے نے جھٹ لقمہ دیا)

''چغد۔۔۔ اور کیا۔۔۔!''(اصل جملہ چبا کر) بھوتنی کے۔۔۔ تجھے نئی پتہ ذاکر صاحب۔۔۔ چکبست کے کتنے بڑے عاشق تھے۔۔۔؟''

''پھر تو تجھے چکبست کی وہ نظم بھی یاد ہوگی جو مولوی صاحب۔۔۔ دعا کے بعد زیرِ لب گنگنایا کرتے تھے''

وہ صبح کہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق، کوہ پہ لالے کا دہکنا
مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا
ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں ، نسیم سحر کا

''کیا یاد کرا دیا یار۔۔۔ کمال آدمی تھے مولوی ذاکر صاحب۔۔۔ وضع قطع۔۔۔ اور۔۔۔ کردار سے سراپا مولوی۔۔۔ مگر۔۔۔ قلبی طور پر۔۔۔ بیدار دل۔۔۔ بیدار مغز انسان تھے۔۔۔ اردو کے پیریڈ میں کسی نہ کسی طور چکبست کو کھینچ لاتے۔۔۔!

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں
ہوا میں اڑ کے سیر عالم ایجاد کرتے ہیں
فرشتے دنگ ہیں وہ کام آدم زاد کرتے ہیں
نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروس شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں
متاع پاس غیرت بو الہواس برباد کرتے ہیں
لب خاموش کو شرمندۂ فریاد کرتے ہیں
ہوائے تازہ پا کر بوستاں کو یاد کرتے ہیں

اسیران قفس وقت سحر فریاد کرتے ہیں
ذرا اے کنج مرقد یاد رکھنا اس حمیت کو
کہ گھر ویران کر کے ہم تجھے آباد کرتے ہیں
ہر اک خشت کہن افسانۂ دیرینہ کہتی ہے
زبان حال سے ٹوٹے کھنڈر فریاد کرتے ہیں
بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے
دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں
اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شان مومن سے
حرم کے نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں
نکل کر اپنے قالب سے نیا قالب بسائے گی
اسیری کے لیے ہم روح کو آزاد کرتے ہیں
محبت کے چمن میں مجمع احباب رہتا ہے
نئی جنت اسی دنیا میں ہم آباد کرتے ہیں
نہیں گھٹتی مری آنکھوں میں تاریکی شب غم کی
یہ تارے روشنی اپنی عبث برباد کرتے ہیں
تھکے ماندے مسافر ظلمت شام غریباں میں
بہار جلوۂ صبح وطن کو یاد کرتے ہیں
دل ناشاد روتا ہے زباں اف کر نہیں سکتی
کوئی سنتا نہیں یوں بے نوا فریاد کرتے ہیں
جناب شیخ کو یہ مشق ہے یاد الٰہی کی
خبر ہوتی نہیں دل کو زباں سے یاد کرتے ہیں
نظر آتی ہے دنیا اک عبادت گاہ نورانی
سحر کا وقت ہے بندے خدا کو یاد کرتے ہیں
سبق عمر رواں کا دل نشیں ہونے نہیں پاتا
ہمیشہ بھولتے جاتے ہیں جو کچھ یاد کرتے ہیں
زمانہ کا معلم امتحاں ان کا نہیں کرتا
جو آنکھیں کھول کر یہ درس ہستی یاد کرتے ہیں
ادب تعلیم کا جوہر ہے زیور ہے جوانی کا
وہی شاگرد ہیں جو خدمت استاد کرتے ہیں
نہ جانی قدر تیری عمر رفتہ ہم نے کالج میں
نکل آتے ہیں آنسو اب تجھے جب یاد کرتے ہیں

''تُو بھی نا۔۔۔بڑا۔۔۔ما۔۔۔ہے(غیاث کے جملے پر تینوں دوست کھلکھلا کر ہنستے ہوئے گلے ملنے لگے)

''چل یہ تو سب ٹھیک ہے۔۔۔اب تو بتا دے۔۔۔کھجلی کیوں رہی تھی۔۔۔؟''(عمران کو ٹھٹھول سوجھ رہا تھا)

''ابے۔۔۔گا۔۔۔پائپ سے اُترتے وقت۔۔۔جس طرح تیری پتلون چرچراتی تھی۔۔۔اُسی طرح۔۔۔میری قمیض بھی چڑ کر کے بغل سے اُدھڑ گئی تھی۔۔۔یہ دیکھ۔۔۔دیکھنا۔۔۔شرم کیوں آ رہی ہے۔۔۔!''

''اپنی پتلون پھٹنے پر شرم نہیں آئی۔۔۔تو۔۔۔تیری قمیض پھٹنے پر کیوں آئے گی۔۔۔؟''

''اس سے پہلے۔۔۔ پھٹ جائے۔۔۔ٹکٹ کا کچھ کرو میری جان۔۔۔ٹکٹ کا۔۔۔!''(وجے نے فکری مندی ظاہر کی)

''بائیس روپے آٹھ آنے کا ایک ٹکٹ ہے بمبئی کا۔۔۔اور۔۔۔یار ہوروں کی جیب میں۔۔۔گُلّم گُلّا۔۔۔اٹھارہ روپے۔۔۔اور۔۔۔ چھ آنے ہیں۔۔۔!''

''اس رقم میں تو ایک ٹکٹ بھی نہیں آتا۔۔۔!''

''جی جناب۔۔۔!''

''پھر کیا کیا جائے۔۔۔!''

''اس کا بندوبست بھی کر لیا ہے میں نے۔۔۔!''

''وہ کس طرح۔۔۔؟''

''قلی سے بات ہو گئی ہے۔۔۔مانگ تو زیادہ رہا تھا۔۔۔مگر۔۔۔ میں نے۔۔۔ پانچ روپے فی بندہ کے حساب سے ۔۔۔ سالے کو اٹیر ہی لیا۔۔۔!''

''بائیس روپے آٹھ آنے کا ٹکٹ۔۔۔صرف پانچ روپے میں۔۔۔؟''

''اب ایسی بھی لُٹ نہیں مچی۔۔۔مال گاڑی میں بٹھائے گا۔۔۔مال گاڑی میں۔۔۔بمبئی کی مال گاڑی میں۔۔۔؟''

''ابے تیرے کی۔۔۔مارے گئے۔۔۔!''

''کیوں کیا ہوا۔۔۔!''

''یار تجھے پتہ نہیں۔۔۔مال گاڑی چھوٹے بڑے سٹیشن پر۔۔۔رُکتی رُکاتی جاتی ہے۔۔۔بمبئی جاتے جاتے۔۔۔ہفتہ۔۔۔دو ہفتہ۔۔۔مہینہ بھی لگ سکتا ہے۔۔۔!''

''تو پھر ہوائی جہاز منگا لوں۔۔۔وائسرائے کا۔۔۔ما۔۔۔گھر میں نئی دانے امّاں چلی بھنانے۔۔۔شکر کرو۔۔۔شکر۔۔۔ایک بار بمبئی پہنچ گئے۔۔۔ اور۔۔۔ہوا ہوائی کا گھر مل گیا۔۔۔تو۔۔۔پو بارہ ہو جائیں گے۔۔۔پوں بارہ۔۔۔!

☆

''لے بے لے۔۔۔بڑا مروڑ اٹھ رہا تھا تیرے پیٹ میں۔۔۔ہفتوں اور مہینوں کا۔۔۔آ گیا تیرا باپ۔۔۔میرا مطلب ہے بمبئی۔۔۔!''

ہیں۔۔۔!بمبئی آ گیا۔۔۔تیسرے دن ہی۔۔۔؟

ابے کہہ تو ٹھیک رہا ہے۔۔۔مگر۔۔۔ سچی بات یہ ہے۔۔۔یقین مجھے بھی نہیں آ رہا۔۔۔!(عمران نے وجے کے خدشات میں شریک ہوتے ہوئے

قدم سے قدم ملائے)

''پتہ نکال پتہ۔۔۔!''

''کس کا پتہ۔۔۔ کیسا پتہ۔۔۔ ؟ (غیاث کے اصرار پر عمرا نے دریافت کیا)

''کہاں سے نکالوں۔۔۔ منہ زبانی یاد ہے۔۔۔ مبین احمد عرف ہوا ہوائی۔۔۔ کاگل والا بلڈنگ۔۔۔ ناگ پاڑا۔۔۔ بمبئی۔۔۔!''

''بس اتنا سا۔۔۔؟''

''تیرا کیا مطلب ہے۔۔۔ حافظ جی کا سبق سناؤں تجھے۔۔۔؟''

''میرا مطب ہے۔۔۔ نمبر و مبر۔۔۔ گلی ولی۔۔۔ کوچہ ووچہ بھی ہونا چاہیے نا۔۔۔!''

''بس میری جان۔۔۔ جو ہوا ہوائی نے بتایا تھا۔۔۔ میں نے فرفر سنا دیا۔۔۔ آگے یا خدا۔۔۔ یا نصیب۔۔۔!''

''بھائی صاحب۔۔۔ بھائی صاحب۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔ ناگ پاڑا کون سا روڈ جاتا ہے۔۔۔؟''

''ناگ پاڑا۔۔۔؟ (حیرت سے سوچتے ہوئے) نہیں بھائی معاف کرنا۔۔۔ میں نے یہ نام پہلی بار سنا ہے۔۔۔!''

''شری مان۔۔۔ شری مان۔۔۔ ناگ پاڑے کون سا راستہ جاتا ہے۔۔۔؟''

''رات کی نہیں اُتری۔۔۔ یا صبح صبح چڑھا لی ہے۔۔۔!'' (تضحیکی انداز میں مڑمڑ کر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے)

''انکل۔۔۔ چچا۔۔۔ بزرگوار۔۔۔ ناگ پاڑے کا پتہ بتلا دیجیے۔۔۔ پلیز۔۔۔!''

''بری بات ہے۔۔۔ بہت بری بات ہے۔۔۔ اتنی چھوٹی عمر میں شراب خانہ خراب کا استعمال۔۔۔ انتہائی بری بات ہے۔۔۔ اکیلے تم نے پی ہے۔۔۔ یا۔۔۔ تینوں نے باجماعت۔۔۔ شگفتہ چنگیزی آپ جیسوں کے لیے کہہ گئے ہیں۔۔۔!''

اونچی اُڑان کے لیے پر تولتے تھے ہم
اونچائیوں پہ سانس گھٹے گی پتا نہ تھا

شروع شروع میں لطف بھی آتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ سُرور بھی۔۔۔ مگر۔۔۔ وقت کے ساتھ۔۔۔ لطف و سرور ہوا ہو جاتے ہیں۔۔۔ ساتھ میں صحت و تندرستی بھی لے جاتے ہیں۔۔۔!''

''کون سی شراب۔۔۔ کیسی شراب۔۔۔ کس کی شراب۔۔۔ کیا اناپ شناپ کہے جاتے ہیں۔۔۔ آپ شراب کی بات کرتے ہیں۔۔۔ ہم نے تو کئی روز سے۔۔۔ رزق کا ایک دانہ تک نہیں چکھا۔۔۔!''

''سچ کہتے ہو برخوردار۔۔۔!(تینوں لڑکوں کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے) یہ بات درست ہے۔۔۔ تو۔۔۔ کسی طرح کی وضاحت یا کج بحثی کے بغیر ہم آپ سے معافی چاہیں گے۔۔۔!''

''ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ معافی کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔! (عمران نے بیزاری سے ہاتھ ہلا کر گلوخلاصی کی کوشش کی)

''یہ کیونکر ہو سکتا ہے صاحب۔۔۔؟''

''مطلب۔۔۔؟''

''اماں۔۔۔! ہم غالب نہ سہی۔۔۔ غالب کے طرفدار تو ہیں۔۔۔ تین دن سے آپ لوگوں نے اناج کی شکل نہیں دیکھی۔۔۔ اور۔۔۔ ہم آپ کو اس کیفیت میں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔۔۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔!

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

''ناگپور میں آپ لوگ۔۔۔ صادقِ سرحدی کے مہمان ہیں۔۔۔!''

''ناگپور۔۔۔؟ (تینوں دوستوں کی زبان سے بہ یک وقت حیرت و استعجاب کے ساتھ)

''جی جناب۔۔۔ ناگپور۔۔۔!''

''اور صادق سرحدی سے کیا مراد ہے۔۔۔؟''

''یہی کہ ہم سرحد کے رہنے والے ہیں۔۔۔؟''

''سرحد کے۔۔۔ کون سی سرحد کے۔۔۔ چین۔۔۔ روس۔۔۔ یا۔۔۔؟'' (غیاث کی حیرت دیدنی تھی جس میں دونوں دوست عمران اور وجے بھی برابر کے شریک تھے)

''برخوردارِ من۔۔۔!(بے تکلفی سے غیاث کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) ہمارے صوبے کا نام ہے۔۔۔ سرحد۔۔۔ صوبہ سرحد۔۔۔ پشاور۔۔۔ بنّوں۔۔۔ کوہاٹ۔۔۔ مردان کا نام نہیں سنا۔۔۔؟''

''سنا ہے۔۔۔ کیوں نہیں سنا۔۔۔ پاپھا جی پرتھوی راج کپور۔۔۔ اور۔۔۔ یوسف خان المعروف دلیپ کمار۔۔۔ وہیں کے رہنے والے ہیں''

''ابے۔۔۔ وہ کیا نام ہے۔۔۔ وہ موٹے سے۔۔۔ گنجے سے۔۔۔ اُلہاس۔۔۔ اور۔۔۔ ان سے ملتے جلتے۔۔۔ جینت بھی۔۔۔ وہیں کے۔۔۔ میرا مطلب پشاور کے رہنے والے ہیں۔۔۔''

''اے شاباش ہے۔۔۔ یہ ہوئی نہ بات۔۔۔ اب مزہ آئے گا گفتگو کا۔۔۔!''

''کہاں پشاور۔۔۔ کہاں ناگ پور۔۔۔؟''

''پہلی بات تو یہ کہ میں پشاور شہر کا نہیں۔۔۔ دور افتادہ گاؤں موسیٰ بانڈہ کا رہنے والا ہوں۔۔۔ اٹھارہ سو ستاون کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کے حریت پسندوں کا سر کچلنے کے لیے۔۔۔ ظلم زیادتی کے تمام ہتھکنڈے آزمانے کے بعد ناکامی کی صورت میں ترقیاتی کاموں یعنی سکول۔۔۔ کالج۔۔۔

سڑکیں۔۔۔گلیاں۔۔۔ہینڈ پمپ۔۔۔ریل گاڑی۔۔۔ڈاکخانے۔۔۔وغیرہ کا جال بچھایا تو ہندوستان بھر سے بے شمار محنت کش۔۔۔دلّی۔۔۔بمبئی۔۔۔ کلکتہ۔۔۔الٰہ آباد۔۔۔کانپور۔۔۔رامپور۔۔۔آگرہ۔۔۔بریلی۔۔۔میرٹھ وغیرہ میں پھیل گئے۔۔۔صوبہ سرحد کے لوگ۔۔۔پہاڑوں۔۔۔چٹانوں۔۔۔ کھیتوں۔۔۔کھلیانوں۔۔۔کے رہائشی ہونے کے باعث جفاکش۔۔۔ نڈر۔۔۔بیباک۔۔۔ہونے کے ساتھ۔۔۔قول وقرار۔۔۔اور۔۔۔لین دین کے بھی سچے اور پکے ہوتے ہیں۔۔۔ایک بار وعدہ کرلیں۔۔۔تو۔۔۔اس پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔۔۔غربت۔۔۔بے روزگاری۔۔۔اور۔۔۔صحت کی سہولتوں کی عدم دستیابی کے باعث میرے دادا گل ریز خان خٹک۔۔۔چار بیٹوں۔۔۔تین بیٹیوں۔۔۔اور۔۔۔ہماری دادی کے علاوہ۔۔۔بوڑھے والدین کو لے کر کام کی تلاش میں۔۔۔پہلے دہلی۔۔۔پھر بمبئی۔۔۔اور۔۔۔ آخر میں ناگ پور کے ہو کر رہ گئے۔۔۔میری پیدائش ناگ پور کی ہے۔۔۔ اصولی طور پر میرا نام صادق ناگ پوری ہونا چاہیے۔۔۔مگر۔۔۔بقول شاعر:

چھٹتی نہیں ہے یہ کافر منہ کو لگی ہوئی

سو ہمارے نام کے ساتھ بھی۔۔۔ہمارا صوبہ جڑا ہوا ہے۔۔۔مگر کب تک۔۔۔ہمارے بعد کیا ہوگا اللہ جانے بقول آرزو لکھنوی:

اوّل شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

''آپ شاعر ہیں۔۔۔؟''(وجے کمار نے کسی قدر اُکتاہٹ سے دریافت کیا)

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

صاحب۔۔۔میرؔ کے پاس درد بھی تھے اور غم بھی۔۔۔ ہمارے پاس۔۔۔لے دے کے غمِ روزگار تھا۔۔۔سو ہم شاعر تو نہ بن سکے۔۔۔شاعروں کے طرفدار۔۔۔بلکہ یوں کہیے۔۔۔طلب گار بن گئے۔۔۔ناگپور شہر میں کہیں بھی مشاعرہ ہو۔۔۔کتنی بھی دور ہو۔۔۔موسم۔۔۔اور۔۔۔ماحول۔۔۔کسی طرح کا بھی ہو۔۔۔صادق سرحدی لازم وملزوم گردانے جاتے ہیں۔۔۔!''

''کیا گردانے جاتے ہیں۔۔۔؟''

''لازم وملزوم۔۔۔مطلب یہ کہ۔۔۔لازمی۔۔۔ضروری۔۔۔ یقینی۔۔۔ارے صاحب۔۔۔! کھانے پر توجہ کیجیے۔۔۔کھانے پر۔۔۔''(شامی کباب کی پلیٹ فرداً فرداً تینوں مہمانوں کی جانب بڑھاتے ہوئے)

''مشاعروں کی بابت۔۔۔اشتیاق بڑھا دیا ہے آپ نے (پلیٹ سے دوسرا کباب اُٹھاتے ہوئے عمران نے بات جاری رکھی) کچھ اور بتلائیے۔۔۔ مشاعروں۔۔۔اور۔۔۔شاعروں کے حوالے سے۔۔۔!''

''اماں چھوڑو۔۔۔! مشاعروں وشاعروں میں کیا رکھا ہے۔۔۔وقت کا ضیاع ہے۔۔۔سراسر وقت کا ضیاع۔۔۔مشاعروں وشاعروں کے چکر میں۔۔۔آدمی کی کیفیت دھوبی کے کتے کی مانند ہو جاتی ہے۔۔۔نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔۔۔بقول وحشت کلکتوی:

کمبخت دل نے عشق کو وحشت بنا دیا
وحشت کو ہم نے باعثِ رحمت بنا دیا
کیا کیا مغالطے دیئے دورِ جدید نے
نفرت کو پیار، پیار کو نفرت بنا دیا

پوچھنا ہے تو ہمارے تاریخی شہر ناگ پور کے۔۔۔موسم۔۔۔ ماحول۔۔۔مزاج۔۔۔معیار۔۔۔معاملات۔۔۔حالات وواقعات کی نسبت پوچھیے۔۔۔پھر دیکھئے:

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

''جی ضرور فرمایئے۔۔۔وہ مشاعروں میں کیا کہتے ہیں (سر کھجاتے ہوئے) ارشاد۔۔۔ارشاد۔۔۔!''

''واہ واہ۔۔۔کیا کہنے۔۔۔میاں آپ نے تو عین مین وہی بات کی جو فراق کہہ گئے ہیں:

زندگی درد کی کہانی ہے
چشمِ انجمن میں بھی تو پانی ہے

''تو جناب۔۔۔سوال جہاں تک ناگ پور کی تاریخ کا ہے۔۔۔ تو۔۔۔میرے خیال میں۔۔۔''(دماغ پر زور دیتے ہوئے)

''گستاخی معاف۔۔۔!''

''جی۔۔۔جی۔۔۔(چونکتے ہوئے) فرمایئے۔۔۔بلا تردّد فرمایئے۔۔۔!''

''نہیں۔۔۔کوئی خاص بات نہیں۔۔۔آپ کی شستہ۔۔۔اور۔۔۔ شائستہ گفتگو سننے کے بعد۔۔۔دماغ میں خود بہ خود سوال کوند گیا۔۔۔؟''

''ارشاد۔۔۔ارشاد۔۔۔!''

''آ۔۔۔آپ۔۔۔کی۔۔۔مادری زبان کیا ہے۔۔۔؟''(غیاث نے ہچکچاتے ہوئے ٹکڑوں میں الفاظ ادا کیے)

''ہماری مادری زبان۔۔۔اچھا سوال ہے۔۔۔اُوں۔۔۔آں۔۔۔ (سوچوں کے تار ملاتے ہوئے) میاں۔۔۔اگر یہ ہی سوال آپ ہمارے بزرگوں کی نسبت دریافت کرتے۔۔۔تو۔۔۔شاید ہمیں دشواری کا سامنا ہوتا۔۔۔جہاں تک سوال ہماری مادری زبان کا ہے۔۔۔تو۔۔۔وہ صد فی صد اردو ہے۔۔۔فقط اردو۔۔۔یہ ہی ہمارا اوڑھنا ہے۔۔۔اور۔۔۔یہ ہی بچھونا۔۔۔!''

''آپ نے اپنا تعلق صوبہ۔۔۔؟''

''سرحد''

''جی۔۔۔جی۔۔۔صوبہ سرحد سے بتلایا تھا۔۔۔وہاں بھی یہی زبان

بولی جاتی ہے۔۔۔اردو۔۔۔؟''

''جی ۔۔۔ عام طور پر تو نہیں بولی جاتی۔۔۔ البتہ۔۔۔ رابطے اور دفتری اُمور میں اردو ہی استعمال ہوتی ہے۔۔۔''

''تو پھر وہاں کونسی زبان بولی جاتی ہے۔۔۔؟''

''پشتو۔۔۔پشتو بولی جاتی ہے۔۔۔!''

''پشتو۔۔۔وہ کیسے بولتے ہیں۔۔۔؟''

''جیسے اردو۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔!''

مثلاً۔۔۔مشکل میں ڈال دیا آپ نے۔۔۔اب میں کیسے بتلاؤں (سر پر مکّا مارتے ہوئے) جی۔۔۔جی۔۔۔پشتو میں اگر کوئی آپ سے۔۔۔ آپ کا ۔۔۔ نام دریافت کرے۔۔۔ تو یوں گویا ہو گا۔۔۔ اس تاسُو سُنم دے۔۔۔یعنی۔۔۔تمہارا نام کیا ہے۔۔۔جواب ہوگا۔۔۔زمانُم صادق سرحدی دے۔۔۔اور کوئی آپ کی رہائش کی بابت دریافت کرنا چاہتا ہے تو۔۔۔تُو کم زے اوسے۔۔۔تم کہاں رہتے ہو۔۔۔زے ناگ پور اوسے۔۔۔ میں ناگ پور میں رہتا ہوں۔۔۔بس جناب بس۔۔۔ اب۔۔۔ اور نہ پوچھیے گا۔۔۔ وگرنہ۔۔۔شرمندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔۔۔!

''آپ نے فرمایا۔۔۔رابطے اور دفتری امور کی انجام دہی اردو زبان میں کی جاتی ہے۔۔۔!''

''جی۔۔۔یہ ہی عرض کیا ہے نا چیز نے۔۔۔!''

''علوم وفنون بالخصوص شاعری وغیرہ بھی اردو میں کی جاتی ہے۔۔۔؟''

''ایسا نہیں ہے جناب۔۔۔پشتو ایک قدیم زبان ہے۔۔۔اور۔۔۔ اس کا علمی ادب۔۔۔اور تہذیبی ذخیرہ خاصا ثروت مند ہے۔۔۔پشتو زبان نے۔۔۔بڑے بڑے ادیب اور دانشور پیدا کیے ہیں۔۔۔خوشحال خان خٹک اور رحمٰن بابا۔۔۔پشتو زبان کے قدآور دانشور تخلیق کار رہے ہیں۔۔۔!

خوشحال خان خٹک سولہ سو تیرہ، پشاور میں پیدا ہوئے اور سولہ سو نو اسی میں انتقال ہوا۔۔۔اور اُن کی وصیت کے مطابق اکوڑہ خٹک کے گاؤں اسوری میں تدفین ہوئی۔۔۔اُن کے والد شہباز خان خٹک قبائل کے سردار تھے۔۔۔ خوشحال خان خٹک نے اپنی علمی اور ادبی زندگی میں کُل دو سو ساٹھ کتابیں تحریر کیں۔۔۔خوشحال خان خٹک نہ صرف شاعر بلکہ فلاسفر، قانون دان ۔۔۔ سیاستدان اور بڑے سکالر تھے۔۔۔نظم ملاحظہ فرمایئے اور خوشحال خان خٹک کی سوچ اور فکر کو داد دیجئے۔۔۔!''

بہت سے لوگ آئے اور ہوا کی طرح اڑ گئے
جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے
بہت سے لوگ اس دنیا میں آئے
اور ہوا کے جھونکوں کی مانند چلے گئے
اس طرح ہی آجاتے ہیں اور گذر جاتے ہیں
اور کسی جگہ مستقل قیام نہیں کرتے
یہ دنیا عجیب وغریب قسم کا کارخانہ ہے
جسے ایک عظیم اُستاد نے پیدا کیا ہے
پانی کے بلبلوں پر غور کرو
تو اپنے معاملے کو اس طرح خیال نہ کرنا
میں نے تو فقط ایک اچھی مثال
بطور ثبوت پیش کی ہے
تُو اپنی حقیقت سے آگاہ نہ ہوا
افسوس! افسوس! افسوس!
تم کس چیز سے اتنے خوش ہو جاتے ہو
اے ''خوشحال'' یہ جو اتنے بے شمار مصائب جھیل رہے ہیں

اسی طرح رحمٰن بابا بھی خوشحال خان خٹک کے ہمعصر شمار ہوتے ہیں۔۔۔آپ کی پیدائش سولہ سو بیس پشاور۔۔۔ اور۔۔۔وفات سترہ سو چھ پشاور میں ہوئی۔۔۔آپ بھی اپنے دور کے بڑے صوفی شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔۔۔اُن کے کلام کی غنائیت اور حالات کی نباضی ملاحظہ ہو:

جز عشق و محبت مجھے آتا نہیں کچھ کام
اس کام سے بھی ہاتھ اُٹھا کہتا ہے واعظ
کچھ تاب سخن ہی نہیں رحمان میں باقی
اب کچھ نہ کہے، کس کا کہا کہتا ہے واعظ

☆

اُمید عیش و نشاط
کہ دنیا تو ہے رنج و غم کی بساط
تہی دست آمد، تہی دست رفت
یہ دنیا تو ہے راستے کی رباط
ہزاروں میں چاہ، اجل راہ میں
مسافر کرے ہر قدم احتیاط
یہیں دیکھ لیتے ہیں اہل نظر
یہ جنت، یہ دوزخ وہ ہے پل صراط

☆

''کیوں جناب۔۔۔ کیا خیال ہے۔۔۔ رحمٰن بابا۔۔۔ اور۔۔۔ خوشحال خان خٹک کے بارے۔۔۔؟''

''خیال۔۔۔ جی۔۔۔ جی۔۔۔ (تینوں دوست ایک دوسرے کی جانب بے بسی سے دیکھتے ہوئے)۔۔۔خیال عمدہ ہے جناب۔۔۔(عمران نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے) اصل میں بات وہی ہے۔۔۔ ہر ذرہ اپنی جگہ

آفتاب ہے۔۔۔!''

''تو ہم کہاں تھے۔۔۔(خیالوں کا سرا جوڑتے ہوئے) یاد آیا۔۔۔ گفتگو ہورہی تھی ناگ پور کے حوالے سے۔۔۔تو جناب۔۔۔! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔۔۔ناگ پور صوبہ مہاراشٹر کا تیسرا بڑا شہر ہے۔۔۔تجارت کے لحاظ سے ملک کا ٹائیگر مانا جاتا ہے۔۔۔ناگ پور کو مہاراشٹر کے تیزی سے ترقی کرتے شہر ہونے کے باعث سمارٹ سٹی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔۔۔ناگ پور شہر کا قیام بخت بلند شاہ نے ستر سو دو میں کیا۔۔۔ناگ ندی کے کنارے بسنے کے باعث اسے ناگ پور کا نام دیا گیا۔۔۔ناگ پور شہر ستاسی اعشاریہ اٹھتر میل پر محیط ہے۔۔۔ناگ پور کی قومی زبان مراٹھی۔۔۔اور۔۔۔رسم الخط ناگ ہے۔۔۔ اے۔جی۔پی کے مطابق ناگ پور بھارت کا سب سے زیادہ سرسبز شہر گردانا جاتا ہے۔۔۔ناگ پور شہر کا محل وقوع زیرو پوائنٹ ہے۔۔۔یعنی جغرافیائی طور پر ناگ پور بھارت کا سینٹر بنتا ہے۔۔۔ناگ پور کے پہلے مراٹھی اخبار کا نام فنین ڈرامانی ہے جس کے معنی ہیں سانپوں کی گپھا۔۔۔ناگ پور عام طور پر تیار کھانوں۔۔۔آئس کریم۔۔۔ناگ پوری مصالحوں۔۔۔اور۔۔۔آریوویدک داؤں کے حوالے سے خاصی شہرت کا حامل شہر ہے۔۔۔مگر۔۔۔ناگ پور کی خاص شناخت۔۔۔سنگترہ ہے جس کے سبب ناگ پور کو اورنج سٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔۔۔مہاراشٹرا ایگرو انڈسٹریل ڈیویلپڈ کارپوریشن کے مطابق۔۔۔ ناگ پور میں سنگترے کی اوسط پیداوار لگ بھگ پانچ ہزار ٹن سالانہ ہے۔۔۔!

''جی۔۔۔جی۔۔۔صحیح فرمایا۔۔۔!''

''لگتا ہے۔۔۔آپ کو پسند نہیں آیا۔۔۔!''

''کیا۔۔۔؟''(تینوں کے منہ سے بہ یک وقت)

''ہمارا بیان۔۔۔اور کیا۔۔۔!''

''ایسا آپ کس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں۔۔۔؟''

''بس یوں ہی۔۔۔کوئی خاص وجہ نہیں۔۔۔!''

''ہمارے چہروں کی لالی سے آپ کو خوشی کا اندازہ نہیں ہوا۔۔۔!''

''ارے صاحب۔۔۔چہروں کی خوب کہی۔۔۔ابھی آپ اُس عمر کو نہیں پہنچے۔۔۔جب چہرے چغلی کرتے ہیں۔۔۔!''

''چغلی کرتے ہیں۔۔۔چہرے۔۔۔وہ کس طرح۔۔۔؟''

''وہ اس طرح جناب۔۔۔مگر نہیں۔۔۔اگر یہی جگہ۔۔۔یہی حوالہ نہ دیا جائے۔۔۔تو۔۔۔مدن مالوی سی بات پیدا نہیں ہوتی۔۔۔مدن مالوی بنارس ہندو یونیورسٹی کے بانی۔۔۔اور۔۔۔بڑے بیدار مغز انسان تھے۔۔۔اکثر لوگ سادگی میں اس جملے کو مدن مالوی کے بجائے۔۔۔مولوی مدن کہہ جاتے ہیں۔۔۔خیر چھوڑیئے۔۔۔بات ہورہی تھی چہروں کے چغلی کرنے کی۔۔۔ نامور مفکر اور دانشور ابراہیم لنکن جب امریکہ کے سولھویں صدر بنے تو انہوں نے کابینہ ترتیب دیتے وقت۔۔۔ایک نہایت ذہین فطین دوست کو کابینہ میں شامل نہ کیا۔۔۔تو۔۔۔اُن کے نائب نے اس جانب توجہ دلائی جس کے جواب میں۔۔۔ابراہیم لنکن نے کہا:

''مجھے اُس کی شکل پسند نہیں۔۔۔!''

''شکل اچھی یا بری ہونے میں انسان کا دخل ہرگز نہیں ہوتا۔۔۔!''

(نائب نے غصّے پر قابو پاتے ہوئے اپنی دلیل کو ابراہیم لنکن کے روبرو پرزور انداز میں پیش کیا تو ابراہیم لنکن نے۔۔۔ون آئی گلاس کو آنکھ سے ہٹاتے ہوئے تاریخی جملہ کہا:)

''مائی ڈیئر بوائے۔۔۔چالیس سال کے بعد ہر آدمی اپنی شکل خود بناتا ہے۔۔۔!''

ویسے تو اس حوالے سے شیکسپیئر نے اختصار میں اعجاز بھر دیا ہے:

''God has given you one face and you make your self another''

اور نفسیات کے باوا آدم سگمنڈ فرائڈ نے مہر تصدیق کچھ ان الفاظ میں لگائی:

''It is impossible to escape the impression that people commonly use false standards of measurement that they seek power, success and wealth for them selves and admire them in others and that they under estimate what is off true value in life''

پیچھے ساحر لدھیانوی بھی نہیں رہے:

کیا ملیے ایسے لوگوں سے جن کی فطرت چھپی رہے
نقلی چہرہ سامنے آئے اصلی صورت چھپی رہے
خود سے بھی جو خود کو چھپائیں کیا ان سے پہچان کریں
کیا ان کے دامن سے لپٹیں کیا ان کا ارمان کریں
جن کی آدھی نیت ابھرے آدھی نیت چھپی رہے
نقلی چہرہ سامنے آئے اصلی صورت چھپی رہے
جن کے ظلم سے دکھی ہے جنتا ہر بستی ہر گاؤں میں
دیا دھرم کی بات کریں وہ بیٹھ کے سجی سبھاؤں میں
دان کا چرچا گھر گھر پہنچے لوٹ کی دولت چھپی رہے
نقلی چہرہ سامنے آئے اصلی صورت چھپی رہے
دیکھیں ان نقلی چہروں کی کب تک جے جے کار چلے
اجلے کپڑوں کی تہ میں کب تک کالا سنسار چلے
کب تک لوگوں کی نظروں سے چھپی حقیقت چھپی رہے
نقلی چہرہ سامنے آئے اصلی صورت چھپی رہے

کچھ موضوع۔۔۔کچھ حوالے۔۔۔اور۔۔۔کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ بادہ وساغر کہے بنا بات بنتی نہیں۔۔۔!''

''بادہ وساغر۔۔۔؟''

''مطلب یہ کہ۔۔۔تفصیل۔۔۔اور۔۔۔تہہ میں جائے بنا بات بنتی نہیں ہے۔۔۔اب۔۔۔ناگ پور۔۔۔کے تعارف کو دیکھ لیجیے۔۔۔فسانے کی جو بات سب سے اہم ہے۔۔۔وہ اب تک بیان نہ ہوسکی۔۔۔''

''فسانہ۔۔۔کون سا فسانہ۔۔۔؟''

''عزیزِ من۔۔۔! فسانے سے مراد۔۔۔ناگ پور کا تعارف ہے تعارف۔۔۔اور۔۔۔یہ تعارف تب تک مکمل نہیں ہوتا۔۔۔جب تک راشٹریہ سیوک سنگھ کا ذکر نہ کیا جائے۔۔۔!''

''وہ کیوں۔۔۔؟''

کیشو بالی رام ایڈ گیوارا۔۔۔یکم اپریل اٹھارہ سو نواسی ناگ پور میں۔۔۔دیشاتھ رگوید۔۔۔اور۔۔۔ریوتی بائی کے گھر پیدا ہوئے تھے۔۔۔ ابھی کیشو بالی رام کی عمر بمشکل تیرہ سال تھی۔۔۔کہ۔۔۔ماتا پتا طاعون کی وبا کا شکار ہوکر انتقال کر گئے۔۔۔کیشو رام بالی والدین کے انتقال کے وقت ناگ پور کے سٹی ہائی سکول میں زیرِ تعلیم تھے۔۔۔اور۔۔۔اُنہوں نے حکومتِ وقت کے جاری کردہ سرکلر کے برخلاف۔۔۔وندے ماترم گا کر برطانوی قانون کی خلاف ورزی کی تھی جس کی پاداش میں۔۔۔سکول سے نکال دیئے گئے۔۔۔اقبال نے شکوہ جواب شکوہ میں کیا خوب کہا ہے:

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلہ لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

اس کے کچھ دن بعد کیشو بالی رام نے پہلے یاوتمال سکول۔۔۔ازاں بعد راشٹریہ دویالیہ سے میٹرک پاس کیا۔۔۔انیس سو دس میں کیشو بالی رام کانگرس کے رکن اور بی ایس مونجے جو بعد میں ہندو مہاسبھا کے صدر بنے نے میڈیکل کی تعلیم کے لیے کلکتہ بھیج دیا۔۔۔انیس سو سولہ میں کیشو بالی رام نے ایل۔ایم۔ ایس پاس کرنے کے بعد۔۔۔ایک سال کی انٹرن شپ۔۔۔اور پونا واپس آ کر بطور ڈاکٹر پریکٹس شروع کر دی۔۔۔اسی دوران ہیڈ گوار ا بنگال کی انوشیلن کمیٹی میں شامل ہو گئے جو بنکم چندر چیٹر جی کی تحریروں سے بہت متاثر تھی۔۔۔مذکورہ بالا گروپ کی بنیاد ہندو علامت پر مبنی تھیں جس کے زیرِ اثر ہونے کے باعث کیشو بالی دامودساور کر کے مقالے ہندتوا سے متاثر ہونے کے ساتھ۔۔۔سمرتھ رام داس کے داسبودھ۔۔۔اور۔۔۔لوکمانیہ تلک کی گیتا رسید کے بھی عاشق ہو گئے۔۔۔!

۱۹۲۰ء کی دہائی میں کیشو بالی رام کانگریس میں شامل ہو گئے۔۔۔ لیکن۔۔۔جلد ہی کانگریس کی پالیسیوں۔۔۔اور۔۔۔سیاست سے مایوس ہو کر اس نتیجے پر پہنچے۔۔۔کہ۔۔۔ہندوستان میں ایسی سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھی جائے۔۔۔جو ہندو ثقافت۔۔۔ہندو مذہب۔۔۔اور۔۔۔ہندو قومیت کی نمائندگی کرے۔۔۔اپنی سوچ اور فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہیڈ گیوار نے۔۔۔انیس سو پچیس میں وجے دشمی کے دن آر ایس ایس کی بنیاد رکھی۔۔۔انیس سو چھتیس میں ہیڈ گیوار نے ''راشٹریہ سیویکا سمیتی'' یعنی آر ایس ایس کے خدمت گار ونگ کی بنیاد رکھی۔۔۔جو لوگ اس تحریک میں حصہ دار تھے اُن کو۔۔۔سویم سیوک کا نام دیا گیا۔۔۔جس کا معنی۔۔۔خود کا نوکر۔۔۔ ہے۔۔۔ابتدا میں خود کے نوکر یعنی سویم سیوکوں میں اہم نام۔۔۔بھیّا جی دانی۔۔۔بابا صاحب آپٹے۔۔۔ایم ایس گوالکر۔۔۔بالا صاحب دیوداس۔۔۔مدھوکر راؤ بھاگوت۔۔۔اور۔۔۔بہت سے نامور لوگ شامل تھے۔۔۔!

کیشو بالی رام ہیڈ گیوار۔۔۔اور۔۔۔اُن کے ساتھیوں کی ان تھک کوشش کے باعث۔۔۔آر ایس ایس۔۔۔ناگ پور سے نکل کر دیگر کئی شہروں میں پھیل گئی تھی۔۔۔کیشو بالی رام کو اُن کے ساتھی نام لے کر پکارنے کے بجائے ڈاکٹر صاحب کہہ کر پکارنے لگے تھے۔۔۔ہندوستان چھوڑو تحریک اپنے عروج پر تھی۔۔۔مگر۔۔۔کیشو بالی رام نے آر ایس ایس کو ہندوستان کی تحریک آزادی سے صحت مند فاصلہ برقرار رکھا۔۔۔تحریکِ آزادی میں آر ایس ایس کے جوش وجذبے سے حصہ نہ لینے پر۔۔۔مخالفین نے آر ایس ایس کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔۔۔مگر۔۔۔اس تنقید کا براہِ راست جواب دینے کے بجائے۔۔۔ڈاکٹر صاحب نے ہندو تنظیم کو بڑھاوا دینے کے علاوہ کبھی کوئی بات نہ کی۔۔۔!

دسمبر انیس سو تیس میں کانگریس نے لاہور کے مقام پر تمام ہندوستانیوں کو مخاطب کرتے ہوئے۔۔۔چھبیس جنوری انیس سو تیس کو یومِ آزادی کے طور پر منانے کی تاکید کی۔۔۔مگر۔۔۔اُس پر عمل کرنے کے بجائے۔۔۔ہیڈ گوار نے پارٹی سرکلر جاری کر کے۔۔۔آر ایس ایس کے تمام کارکنوں کو بھگوا کی پوجا کرنے۔۔۔اور۔۔۔ترنگے کے بجائے۔۔۔دھواج۔۔۔یعنی کیری رنگ کا جھنڈا لہرانے کا حکم نامہ جاری کر دیا۔۔۔!

انیس سو تیس میں ہی مہاتما گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف ستیہ گرہ کی کال دی۔۔۔گاندھی جی نے خود اپنی ڈانڈی یاترا کے دوران نمک ستیہ گرہ کا آغاز کیا۔۔۔تو۔۔۔ڈاکٹر ہیڈ گیوار نے۔۔۔اس تحریک میں انفرادی طور پر حصہ لیا۔۔۔اور۔۔۔آر ایس ایس کو باضابطہ طور پر اس تحریک میں شامل ہونے سے روک دیا۔۔۔تاہم انفرادی طور۔۔۔گاندھی جی کے ستیہ گرہ میں شمولیت کے خواہش مند کارکنوں پر روک نہ لگائی۔۔۔ہیڈ گیوار۔۔۔جدید ہندوستان کے بجائے قدیم ہندوستان کے حامی تھے۔۔۔وہ نہ صرف انگریزوں۔۔۔بلکہ۔۔۔ مغلوں کے دور کو ہندوستان کی تہذیب وتمدن پر حملہ۔۔۔یا۔۔۔برے دن

گردانتے ہوئے خالص ہندو تہذیب و تمدن پر مبنی ۔۔۔ ہندو ریاست قائم کرنے کے حامی تھے ۔۔۔ ہیڈگیوار برملا اس بات پر ناگواری کا اظہار کرتے ۔۔۔ کہ ۔۔۔ ترنگا جھنڈا ۔۔۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب ۔۔۔ اور ۔۔۔ روایات کی نمائندگی نہیں کرتا ۔۔۔ اُن کا اصرار اس بات پر تھا ۔۔۔ کہ ۔۔۔ آر ایس ایس کو صرف انسان سازی میں شریک ہونا چاہیے ۔۔۔ وہ ہر قیمت ۔۔۔ اور ۔۔۔ ہر طریقے سے ہندوستان کی قدیم تہذیب ۔۔۔ اور رسوم و رواج بحال کرنے کے حامی ۔۔۔ اور ۔۔۔ بھارت دیش کو ہندو ریاست بنانے کے کٹر طرفدار تھے ۔۔۔!

ڈاکٹر ہیڈگیوار ۔۔۔ آر ایس ایس کی رکنیت مردوں تک رکھنے کے حامی تھے ۔۔۔ مگر ۔۔۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی سوچ ۔۔۔ اور ۔۔۔ فکر میں تبدیلی آئی ۔۔۔ تو ۔۔۔ ۱۹۳۶ء میں لکشمی بائی کیلکر کو بلا کر اُن کے سامنے مردوں کے علاوہ خواتین تنظیم ''راشٹریہ سویکا سمیتی'' بنانے کی تجویز رکھتے ہوئے ۔۔۔ لکشمی بائی کیلکر کو، راشٹر سیویکا سمیتی اپنی مکمل ۔۔۔ اور ۔۔۔ غیر مشروط حمایت کے ساتھ ۔۔۔ راشٹریہ سیویکا سمیتی کی پردھان بنانے کا اعلان کر ڈالا ۔۔۔ راشٹر سیویکا سمیتی کھلی طور پر آزاد ۔۔۔ اور ۔۔۔ خود مختار تنظیم تھی جس کے اغراض و مقاصد ۔۔۔ مردانہ آر ایس ایس کی طرز پر ۔۔۔ ہندوستان کو قدیم ہندو روایت کا امین بناتے ہوئے اُن کی بحالی کے لیے بھرپور جدوجہد کرنا تھا ۔۔۔!

☆

بڑھتی عمر ۔۔۔ اور ۔۔۔ کام کی زیادتی کے باعث ڈاکٹر ہیڈگیوار بیمار رہنے لگے ۔۔۔ ابتدا میں اُنہیں کمر درد کی شکایت ہوئی جو بڑھتے بڑھتے کئی طرح کے امراض میں تبدیل ہوگئی جن سے تنگ آ کر ڈاکٹر ہیڈگیوار نے اپنی جگہ ۔۔۔ ایم ۔ ایس گوالکر کو آر ایس ایس کا سرسنگھ چالک مقرر کر دیا ۔۔۔ انیس سو چالیس میں ڈاکٹر ہیڈگیوار نے ۔۔۔ آر ایس ایس کا سالانہ سنگھ شکشا ورگ (آفیسر ٹریننگ کیمپ) شروع کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ میں آج جاگتی آنکھوں سے ۔۔۔ ایک چھوٹا سا ہندو راشٹر دیکھ رہا ہوں ۔۔۔!

ڈاکٹر ہیڈگیوار کے یہ آخری الفاظ تھے جس کے بعد ۔۔۔ اکیس جون انیس سو چالیس کی صبح ان کا انتقال ہوگیا ۔۔۔ اُن کی آخری رسومات ۔۔۔ ناگ پور کے ریشم پارک میں ادا کی گئیں ۔۔۔ جس کے بعد ۔۔۔ اُسی مقام پر ہیڈگوا اسمرتی مندر کی تعمیر کی گئی جہاں آج آر ایس ایس کا مرکزی دفتر واقع ہے ۔۔۔!

ہیڈگیوار کی یاد میں مندرجہ ذیل ادارے بنائے گئے:

۱۔ شری کیشو کوآپریٹو سوسائٹی لمیٹڈ ۔ جوناگڑھ گجرات
۲۔ ڈاکٹر ہیڈگیوار تعلیم پرستھان ۔ احمد نگر گجرات
۳۔ ڈاکٹر ہیڈگیوار ہائی سکول ۔ گوا
۴۔ ڈاکٹر ہیڈگیوار آریو ویدیک ستھان ۔ نئی دہلی
۵۔ ہیڈگیوار آریو ویدک، بی ۔ اے ۔ ایم ۔ ایس کالج، چکھی مہاراشٹر
۶۔ ہیڈگیوار ہسپتال ۔ اورنگ آباد
۷۔ ڈاکٹر کیشو بالی رام ہیڈگیوار چیئر ۔ شملہ ہماچل پردیش
۸۔ کیشو سروشتی بھاشندر (ڈبلیو) تھانے مہاراشٹر

☆

''اُف فوہ ۔۔۔ کتنا سٹیمنا ہے آپ کا ۔۔۔ مجھے ۔۔۔ تو ۔۔۔ نیند ۔۔۔ آ گئی تھی ۔۔۔!(انگڑائی لیتے ہوئے عمران نے تبصرہ کیا تو ۔۔۔ دیگر دوستوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی ۔۔۔!)

''واقعی ۔۔۔ کمر تھک کر تختہ ہوگئی ۔۔۔(غیاث نے بھی جماہی لیتے ہوئے وجے کی پیٹھ پر دھپ مارتے ہوئے کہا)

''ہاں یار ۔۔۔ کہہ تو ٹھیک رہا ہے تُو ۔۔۔!(وجے نے بھی آڑا ترچھا ہوتے ہوئے دونوں کی ہاں میں ہاں ملائی)

''جس قوم کے نوجوان ۔۔۔ اس قدر کم ہمت ۔۔۔ کور ذوق ۔۔۔ اور ۔۔۔ اپنی حالتِ زار سے بیگانہ ہوں ۔۔۔ اُس قوم کو ۔۔۔ پہلی فرصت میں ۔۔۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھ لینا چاہیے ۔ بقول اقبال:

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بام عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنون فتنہ ساماں کا
مرا آئینہ دل ہے قضا کے راز دانوں میں
رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

# '' حدیثِ شوق ''

## عیدی

### شورش کاشمیری

(۱۴۔اگست ۱۹۱۷ء تا ۲۵۔اکتوبر ۱۹۷۵ء)

میں اپنے دوستوں کو عید پر بھیجوں تو کیا بھیجوں
خدا توفیق دے تو، ہدیۂ مہر و وفا بھیجوں

لڑکپن کی رسیلی داستانوں کے لبادے میں
حدیثِ شوق، نقدِ آرزُو، آہِ رساں بھیجوں

جوانی کے شگفتہ وَلولوں کا تذکرہ لِکھ کر
طبیعت کا تقاضا ہے،دلِ درد آشنا بھیجوں

وہ راضی ہو تو،اپنی عُمر کے اس دورِآخر میں
بیانِ شوق لکھوں، داستانِ ابتلاء بھیجوں

قلم قتلے ' ادیبِ شہر ہونے کی رعایت ہے
غزل کے ریشمیں لہجے میں نظمِ دلکشا بھیجوں

کوئی نظمِ شگفتہ، حضرتِ احسان دانش کی
رشید احمد کے اسلوبِ دل آرا کی ادا بھیجوں

زبانِ میر، رنگِ میرزا، پیرایۂ حالی
میں اس سہ آتشہ میں،نغمۂ بہجت فزا بھیجوں

خیال آتا ہے''اس بازار'' کی نیلام گاھوں میں
کِسی طوفان کے انداز میں، قہرِ خدا بھیجوں

برہنہ گسیوں کو عید کے ہنگامِ عشرت میں
فقیہوں کی قبائیں پھاڑ کر بندِ قبا بھیجوں

تماشا ہائے عصمت، اور ''عالمگیر کی مسجد''
خدا کے نام بھی اک محضرِ آہ و بکا بھیجوں

میری عیدی مذاقِ عام سے ہومختلف شورش
رفیقانِ قلم کو، ڈَٹ کے لڑنے کی دُعا بھیجوں

○

# نظامِ زکٰوۃ

فریدی صدیقی مصباحی
(مسقط)

فلاح و ترقی ، نظامِ زکٰوۃ
ہے تعمیرِ اُمّت ، قیامِ زکٰوۃ

کہا رب نے قرآں میں "اٰتوالزّکٰوۃ"
احادیث میں ہے کلامِ زکٰوۃ

ادا کر کے ستھرا کرو مال و زر
امیروں کو ہے یہ پیامِ زکٰوۃ

غریبوں فقیروں کی امداد ہو
ملے مستحق کو طعامِ زکٰوۃ

مدد کیجیے پردہ داری کے ساتھ
کہ غیرت نہ ٹوٹے ، بنامِ زکٰوۃ

رِیا کاری کا شائبہ تک نہ ہو
کہ ہے بندگی ، اہتمامِ زکٰوۃ

اہم رُکن ہے یہ بھی اسلام کا
اِسی سے سمجھئے مقامِ زکٰوۃ

وَعیدِ شدید اِس کے تارِک پہ ہے
نِصابی پہ ہے فرض ، کامِ زکٰوۃ

غریب اور مُفلِس بھی خوشحال ہوں
یہ مقصد ہے ، یہ ہے مَرامِ زکٰوۃ

بھَرم اہلِ حاجت کا ٹوٹو نہ تم
ہو دِلجوئی سے انتظامِ زکٰوۃ

ہے تعلیم ومذہب کا اِس سے فروغ
بہت خوب ہے فیضِ عامِ زکٰوۃ

مدارس کا ہر بار رکّھو خیال
کرو اُن کو بھی شادکامِ زکٰوۃ

سفیر و مُحصّل کی عزّت کرو
کہ دو خیرخواہی سے دامِ زکٰوۃ

ہے بہتر کہ خود اہل تک جایئے
کہ نیکی ہے، ہر ایک گامِ زکٰوۃ

طہارت ہے اِس سے زر و مال کی
فریدی ! تو رکھ اِلتزامِ زکٰوۃ

# بہارو جھوٹ مت بولو

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

کسی جبل بلند قامت کی رفعت سے ذرا اونچی
ہوائے یاسمن کے عطر سے ملبوس کو چھوتی
ستاروں سے کہیں اجمل
ستم ایجاد چشم ناز کا ہیبت تماشا
ہاتھ پر دھر کر
یہ کیسی رت زمیں پر آن اتری ہے؟

یہ کیسی رت کہ جس کو دیکھ کر
اس بار دھرتی پر
زمیں والوں کا واویلہ
فلک کے سجدہ تعظیم کی، سرخاب پٹی پر
ملایک سے الجھے آیا
حیاداروں کی بستی میں
دوپٹے تتلیوں کے
پاوں میں بیلوں کے کھنچ آئے
زمیں والوں نے منظر دیکھ کر
پرخوف جسموں کو
یکا یک بال و پر کی اوٹ میں تحلیل کر ڈالا
سو وہ ناپید ہوتے جا رہے تھے
اور کسی مخبر کی دست و برد سے محفوظ ہوتے جا رہے تھے

کشادہ صحن کی چھوٹی پنیری
ہوا کی چال سے ہم رقص ہوتی
مشام جان کے پیروں میں گھنگرو باندھتی پھرتی کہانی
کسی شاخ بریدہ پر
کہیں سے مانگ کر لائی جوانی
فقط اک خواب ہوتی جا رہی ہے

کہیں ہاتھی کی میت کو
کسی چیونٹی میں دفنانا
کہانی حیرتیں کہتی
کہیں مرقد کے آنگن میں پر
اچھل کر یوں عیاں ہونا
کہانی کیا نہیں کہتی

وہیں بازار حصص کے نفع بازوں کی جیبوں میں
پرائے مال کی لذت بہک کر رقص کرتی ہے
محبت باز مجنوں کو
کہیں سیڑھی سے پھینکا جا چکا ہے
حصص کے دام میں تازہ ہوس کی مانگ بڑھتی ہے
یہ کسی رت کہ جس کو جاں فزا کہنا ملامت ہے
سیہ قسمت کی بوڑھی اپسرا کو
کسی امید سے سرشار کر کے تم
خدارا کفر مت تولو
بہارو، جھوٹ مت بولو

○

## آخری سندیسہ

جاناں ملک
(راولپنڈی)

جب میں صبح جاگی تو شاعری
سامنے والے پیڑ کی پرپل شاخ پر چہک رہی تھی
میں دیر تک اس سے اپنا پیچھا چھڑاتی رہی
مگر وہ بار بار اپنی طرف بلاتی رہی
اور پھر دبے پاؤں میرے پاس آ گئی
تم اس بار خط میں
مجھے اپنے ہاتھوں کی ریشمی حدت
دمکتے چہرے کی
میٹھی مسکان
شریں لہجے کی چاشنی
اور ان خوشبو ہوتی آنکھوں کی روشنی بھیجنا
تم تو جانتے ہونا۔۔۔۔۔۔۔
میں زندگی کے اس شیش محل کے
اس تاریک گوشے میں رہتی ہوں
جہاں پر کوئی آواز تک نہیں آتی
تم نے اگر مجھے دیکھنا ہے تو
اپنی چھت کی منڈیر پہ دیکھنا
میں پچھلے پہر کی دھوپ ہوں
تمہیں وہاں ملوں گی

○

## ''امی''

انور ظہیر رہبر
(برلن، جرمنی)

موت!!
دنیا کو دوبارہ ترتیب دیتی ہے
بظاہر کچھ بھی نہیں بدلتا
لیکن پھر بھی اچانک
سب کچھ مختلف ہو جاتا ہے
یادداشت!!
ایک کھڑکی ہے
جس کے ذریعے ہم جب چاہیں
اپنے پیاروں کو
جو ہمیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں
دیکھ سکتے ہیں!
موت!!!
ایک شمع کی طرح ہے
جو دن نکلتے ہی بجھ جاتی ہے
زندگی کا سورج
جیسے ہی غروب ہوتا ہے
یادوں کے ستارے چمکنے لگتے ہیں!
میری پیاری امی!
بظاہر آپ ہماری زندگی سے دور چلی گئی ہیں
مگر ہمارے دلوں سے آپ کو کوئی دور نہیں کر سکتا
کبھی بھی نہیں
آپ اب وہاں نہیں ہیں
جہاں آپ رہتی تھیں
لیکن
آپ ہر اُس جگہ ہیں
جہاں ہم ہیں!!

○

## ۔ اختیار میں ہے ۔

چہارسواور مدیر چہارسو کے محبّی، مربّی اور رہنما حافظ محمد احمد صاحب (سابق چیف ایگزیکٹو آفیسر جی۔ایچ۔کیو) ہمارے درمیاں نہیں رہے۔ حافظ صاحب مرحوم، صاحب علم، صاحب ذوق، صاحب نظر، صاحب مطالعہ اور صاحب قلم کے ساتھ بیداردل، بیدارمغز کے حامل وسیع المشرب انسان تھے جن کا دولت کدہ ایک طرح سے علم وعرفان کا مرکز ومنبع تھا۔ بلاشبہ حافظ صاحب جیسی ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیات روز، روز پیدا نہیں ہوتیں۔ ذیل کی سطور میں حافظ صاحب کے قطعات (مطبوعہ چہارسو) خراج عقیدت کے طور پیش کیے جارہے ہیں۔ بقول اظہر عنایتی:

یہ اور بات ہے کہ آندھی ہمارے بس میں نہیں
مگر چراغ جلانا تو اختیار میں ہے

### ارضِ پاک

یہ ارضِ پاک تھا تحفہ خداوندِ دو عالم کا
اِسے برباد کر کے رکھ دیا ہے رہنماؤں نے
تو خلاّقِ جہاں ہے پھر کوئی جتاّح پیدا کر
دیا ہو جس کو پھر جذبہ تری غیبی صداؤں نے

### شامتِ اعمال

یہ آپس کے جھگڑے یہ ظلم و تعدّی
عذابِ الٰہی ہیں یہ سب مصائب
نجات اِن سے پانے کی ہے ایک صورت
کہ اعمالِ بد سے ہوں سب لوگ تائب

### ''حُسنِ خُلق''

خود پسندی ،کبر و نخوت ناپسندیدہ صفات
کبریائی جس کو زیبا ہے وہ ہے بس ایک ذات
نا پسند اُس کو ہے بندے کا غرور و افتخار
حُسنِ خُلق و انکساری میں ہے بندے کی نجات
(القرآن، لقمان، آیت ۱۸، الجاثیہ ۳۷)

### مرے مولا

تہی دامن تھا میرے پاس تو کچھ بھی نہ تھا اچھّا
تو فیّاضِ جہاں ہے بھر دیا تُو نے مرا دامن
عطا مجھ کو کیا عفو و کرم اور سایۂ رحمت
مرے مولا! مرے خالق! مرے رازق! مرے حامن!

### نظرِ کرم

نہ سردی راس آتی ہے، نہ گرمی راس آتی ہے
نہ سختی راس آتی ہے، نہ نرمی راس آتی ہے
کہوں میں کیا، کہ کیا شے ہے جو مجھ کو راس آتی ہے
مرے مولا! تری نظرِ کرم ہی راس آتی ہے

### ڈاکٹر عبدالقدیر خاں

کہنے کو یوں تو بس وہ فقط ایک فرد تھا
اس کو مگر وطن کی حفاظت کا درد تھا
دشمن سے اُس نے قوم کو محفوظ کر دیا
''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''

### منتہائے کمال

عطائے ربِّ جلیل تھا ایک گوہرِ بے مثال تھا وہ
جو کام کر کے دکھایا اُس نے عروجِ فکر و خیال تھا وہ
نہ مانگا اُس کا صلہ کسی سے نہ داد اہلِ وطن سے چاہی
عجب سا بے لوث شخص تھا اور منتہائے کمال تھا وہ

### انسانیت

پستیٔ اَخلاق، حرص و آز اور شہوانیت کو
آہ! کیوں انسان نے اپنا لیا حیوانیت کو
پا لیا انسان نے گو علم و فن کی رفعتوں کو
وائے حسرت! آج اُس نے کھو دیا انسانیت کو

# اردو ادب: ماحولیاتی تناظر

جمیل احمد عدیل
(لاہور)

دو تین سال پیشتر ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کی ترجمہ کردہ کتاب: ''ماحولیاتی تنقید'' سامنے آئی تو متعدد قارئین کی طرح راقم کے لیے بھی گویا دبستاں کھل گیا! ایک ایسا نظامِ فکر یکا یک یوں منکشف ہوا کہ حیرانی اپنی فراوانی کے ساتھ نصیب بن گئی! واقعہ یہی ہے اس کی مبادیات بھی حاشیۂ خیال کے پاس سے نہ گزری تھیں۔ بلاشبہ Ecocriticism سے موسوم اس نوعِ انتقاد نے شعور کے رقبے میں یہ اساسی تصور شامل کیا کہ یہ جو 'زمین' ہے، اس پر انسان ہی کے مالکانہ حقوق نہیں ہیں۔ اسے اپنے نام 'ہبہ' کرالینا ایک وارِدہ ہے۔ اس خطۂ ارض پر آبادکاری کے عمل میں بے شمار جان دار اور بے جان صدیوں سے شامل ہیں نیز ان کا رکنان کو وجودِ انسانی کے گرد وظیفۂ طواف میں مصروف محسوس کرنا آنکھ کا وہ حجاب ہے، جسے ہٹا کر دیکھنے سے سارا منظر نامہ تبدیل ہو جائے گا۔ بصد معذرت! زمین کو فروغ آشنا کرنے میں انسان کے کسی ایک کنٹریبیوشن کو نشان زد کیا جائے، جس کے عقب میں تحفظ خویش کا عنصر کارفرمانہ ہو۔ اگر جمالِ فطرت کے شاہکار 'شب آفریدی' پر آپ نے 'چراغ آفریدم' کا اضافہ فرمایا ہے تو کسی پر احسان نہیں کیا۔ اس ایجاد کے اول و آخر بینیفیشری آپ ہی ہیں۔ رہیں دیگر مخلوقات تو انھیں قسموں کی کبھی احتیاج نہیں رہی۔ ذرا رک کر یوں بھی دیکھا جانا چاہیے کہ فطرت کی مشفق بانہیں آپ کی نشوونما میں برابر حصہ ڈال رہی ہیں۔ آپ اس کی بقا کے لیے کیا خدمات انجام دے رہے ہیں؟ علاوہ ازیں آپ اگر 'بوجوہ' باقی نہیں رہتے تو حیات کا یہ کینوس کس نقدان کو ظاہر کرے گا؟ اگر یہ: پانی، آکسیجن، آگ، ہوائیں آپ سے چند لمحوں کے لیے روٹھ جائیں تو برتری کے سارے دعاوی کیا دھرے کے دھرے نہیں رہ جائیں گے؟ ہم تو مٹی اور چیونٹیوں کا بدلہ نہیں دے سکتے جو مرنے کے بعد ہمارے 'سرمایۂ تن' کو نفاست کے ساتھ ٹھکانے لگا دیتی ہیں۔ جنھیں آگ کا ممنون ہونا پڑتا ہے، وہ بھی فطرت ہی کے زیرِ بار ہیں۔ باقی انسان کے تفاخر کو ایڈلر کے اس نظریے کی روشنی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے: ''انسان ہونے کا مطلب ہی خود کو کمتر محسوس کرنا ہے۔'' سو، اس احساسِ کہتری پر قابو پانے کے لیے خود کو برتر ثابت کرتے رہنا، ایسا گہرا نفسیاتی راز تو رہا نہیں۔ بجز اس سے کیا کہا جائے کہ اب تلک تو حضرتِ انسان اپنی 'ادھوری ذات' کو پورا نہ کر سکے!

اب Ecology کی دیگر جہات اپنی جگہ مگر لٹریچر اور آرٹ میں اس کا موثر ہونا تنقید کے ایک نئے رخ کو سامنے لانے کا سبب بنا۔ شعر و ادب میں اس کی کارفرمائی نے تازہ تعینات کو افکار کا حصہ بنا دیا۔ سوچ کے یہ زاویے نیازی صاحب کے کیے ہوئے مذکورہ ترجمے کی وساطت سے پہلی مرتبہ اردو لکھنے/ پڑھنے والوں کو بے طرح متوجہ کر گئے مگر ابھی تک اس فکر و نظر کا اطلاق ہماری اپنی ادبیات پر نہ ہوا تھا۔ جس طرح بطور باقاعدہ مترجم اورنگ زیب نیازی صاحب سبقت لے گئے، اسی طرح یہ اولیت بھی ان کے نام ہوئی کہ انھوں نے اردو ادب کو ماحولیاتی تناظر میں پیش کرنے کا باضابطہ اہتمام کیا۔ حال ہی میں شایع ہونے والی ان کی یہ تصنیف اپنے جن مندرجات کی ترجمان بنی ہے، وہ اردو ادب کے معقول رقبے کو محیط ہے۔

مذکورہ کتاب کا مقدمہ: 'ماحولیاتی تنقید: پس منظر، آغاز اور امتیازات' اُس نظامِ فکر کا جاندار ملخص ہو کر سامنے آتا ہے، جس کے ساتھ ہماری فکری شناسائی ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ مصنف نے قاری پر دفعتہً علمیت کا بوجھ لادنے کی بجائے ایک منجھے ہوئے اتالیق کی مثال نظری ابعاد کو رواں اسلوب ہی میں نہیں بالترتیب بھی بیان کیا ہے۔ یوں جستجو کو ابھارتے ہوئے سوالات کے جوابات فراہم کرنا انھیں ایک 'ہمدرد لیکھت' ثابت کرتا ہے۔ بصیرت کی معتدل سطح کو نقطۂ نظر کی طبعی تمازت پر ترجیح دینا نقاد کی درست ذہنی تربیت پر دال ہے۔ اگر Humanism کے تفضیلی مفروضے کا رد کرتے ہوئے وہ خطیبانہ تلخی کو اپنا لیتے تو اس مقدمے کے علمی وقار کو ٹھیس پہنچتی۔ اس طرح Hyper Seperation ایسے نازک موضوع کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا کیونکہ یہ طرف محض کسی تھیوری کی غماز نہیں، اس کے گرد باقاعدہ عقیدہ لپٹا ہوا ہے۔ صاف اور سیدھی بات ہے، جسے مفتوح بنانے کا مرکزی جذبہ صدیوں سے کارفرما ہو وہاں سنگت نہیں ثنویت ہی جنم لیتی ہے۔ دیکھیے مصنف نے کتنے نرم الفاظ میں اصولی نکتہ ذہن نشین کرانا چاہا ہے:

''روشن خیالی تحریک سے لے کر عہدِ حاضر تک تمام علوم کی بنیاد انسانی موضوع کو سمجھا گیا ہے۔ درحقیقت قرونِ وسطیٰ کی دانش فطرت کا یک رخا تجربہ کرتی ہے اور اسے ایک لاتعلق اور خاموش معروض کے طور پر پیش کرتی ہے۔''

اس میں کلام نہیں کہ قدیم تصورات میں بھی بشر کی مرتبت کا تعین بشر ہی کرتے رہے۔ اب Deep Ecology کی روشنی میں اگر نظر ثانی ہو رہی ہے تو یہ فریضہ بھی بشر ہی ادا کر رہے ہیں۔ ہاں! ان مضامین کی آمد کے باب میں وہ کسی 'غیب' کو مصدر نہیں گردان رہے بلکہ موضوع کو ایک درجے میں معروض کی آنکھ سے دیکھنے اور دکھانے کا بندوبست بہت واضح ہے۔ اس لیے یہ ساری تفہیم عقلی مقتضا رکھتی ہے۔ سو، کسی Out of body experience قسم کی ماورائیت کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔ البتہ عقلی فکری سطح پر خود سے نکل کر خود کو از سرِ نو دیکھنا اپنے اندر حیرت کا سامان ضرور رکھتا ہے لیکن تحیر کی یہ افراط آنکھ کے لیے حجاب نہیں بنتی بلکہ محجوب بینائی کو رہائی سے ہمکنار کرتی ہے۔

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی نے Aldo Leopold کا حوالہ دیتے

ہوئے بتایا ہے کہ بشر مرکزی اقدار کے متوازی Land Ethics بھی معنویت رکھتی ہیں۔ خاص طور پر بن۔ اب واقعہ یہ ہے کہ جنگل کی حرمت کا تحفظ نہ کیا گیا تو خود بنی نوع انسان اپنی حیات اور بقا کو غیر محفوظ کرنے کا باعث بن جائیں گے۔ ولیم روئیکرٹ سے وزڈم پاتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ خالق اب فرشتوں کی بجائے درختوں کے ذریعے انسانوں سے مکالمہ کرتا ہے مگر بہتوں کو ابھی یہ معلوم نہیں کہ زمین پر بن خدا کا عرش ہے۔ جس نے بظاہر ہیبت کی ردا اوڑھ رکھی ہے لیکن اس کا من ممتا سے معمور گو دا ایسا گداز اور شفیق ہے!

تفصیل کا محل نہیں۔ یہاں اس کتاب کے آخری آرٹیکل: 'صبح کاذب کی ہوا اور مقامی ماحولیات' کا اجمالی ذکر کیا جائے گا کہ اس کا موضوع سرکار انگلشیہ کی وہ 'آسمانی برکت' ہے، جس کو ریل گاڑی کہا جاتا ہے۔ اسی ایجاد کے پہیوں پر گویا نوآبادیاتی نظام گردش کرتا رہا۔ بادی النظر میں آمدورفت اور تحملیات (Transportation) کی مناسبت سے یہ ذریعہ عوام کے لیے افادت ہی کی طرف سامنے لاتا ہے لیکن اس کے شکم میں کتنے اشجار ایندھن بنے؟ یہ سلگتی داستان اشکبار کر دیتی ہے! حضرت انسان بھی کیا سادہ لوح واقع ہوا ہے کہ اپنی 'مٹی کی ٹوکری' کو ڈھونے کے لیے ان گنت شاداب جنگلوں کو کوئلے بنانے پہ رضامند ہو گیا۔ ریل کے سفر نے جس رومان کو ہمارے وجودوں میں ترازو کر رکھا ہے، یہ تحریر اسے تحلیل کر کے وہ ہولناک منظر دکھا دیتی ہے کہ سانسیں تھمنے لگتی ہیں!

واضح رہے لوہے کی پٹڑی اور اس پر گھومتے آہنی پہیے، ساری کتھا یہی نہیں۔ مشینی تہذیب کو رائج کرنے کے لیے تدبیر کاری کا فُسوں جن گوشوں سے پھوٹا، وہ ششدر کر دینے والا ہے! معلوم ہوتا ہے کہ ریلوے، نہری نظام اور آبادکاری کی غرض سے جنگلات کی کٹائی، باغات اور طرزِ رہائش میں تبدیلی ثقافتی زندگی میں مداخلت کے اسی اختیار کا نتیجہ ہے۔ ہماری معصومیت نہ جان سکی کہ کولونیل دور میں باغات کی مقامی روایت کو کیسے چپکے سے نئے ڈیزائن بلکہ نئی روش میں شفٹ کر دیا گیا۔ مضمون نگار نے تصویر کا یہ رخ دکھایا ہے کہ: پھول اور باغات، اعتقادات، ثقافت اور مخصوص آئیڈیالوجی کے مظہر بھی تھے، جس کا نفاذ ذوقِ باغبانی سے کہیں زیادہ ضروری تھی۔ اس طرح کوئی ساخت محض ساخت نہیں ہوتی۔

آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ زمین کا دوزخ ہونا اس کا مقدر نہیں ہے۔ یہ جو فوقیت کی ڈوکٹرائن ہے۔ اس نے ہر روز نئے جہنم کی تقریب رونمائی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ قضیہ تو زمین کا ہے، اس پر موثر فطرت سے عداوت نے سب سے بڑھ کر انسان کو ہزیمت سے دوچار کیا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کتاب 'تسخیر فطرت' کے بخار کو توڑنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتی ہو! اگر فرد کلیت میں جذب ہو کر 'ایٹ پار' ہونے کی طرف اپنا جھکاؤ ظاہر کرے تو کیا عجب یہ رفاقت کسی آسودگی پر منتج ہو جائے ___ آرزو ہے کہ ڈاکٹر نیازی کی یہ نگارش کبھی نصاب کا حصہ نہ بنے کہ مکتب ایسا مقام ہے جہاں کتاب کو پڑھ اور پڑھا کر 'ختم' کر دیا جاتا ہے جبکہ اس دستاویز کا متن طویل مدتی ساتھ کا مطالبہ کرتا ہے!!

## مقناطیسی عمل

فرانسیسی اشرافیہ کے زوال اور انقلاب فرانس کا دور چل رہا تھا کہ ایک فرانز میسمر نامی شخص کو پاپولر سائنس کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوگوں کی سادہ لوحی اور جہالت سے فائدہ اٹھانے کی ترکیب سوجھی یہ شخص ایک حوض میں سلفیورک ایسڈ ڈال کر لوہے کی سلاخیں جن کے سروں سے مقناطیس چمٹا ہوتا ان لوگوں کے ہاتھ میں پکڑا کر ایک سرا اس حوض میں ڈال دیتا خود گولڈن دھاگے والے زرق برق لباس پہن کے ہاتھوں میں ہاتھی دانت کی چھڑی پکڑ کر گھماتا رہتا۔
لوگ اسکے پاس ہر قسم کی بیماری کے علاج کے لیے آتے اور حیرت انگیز طور پہ شفایاب بھی ہو جاتے اس کا دعوی تھا کہ مقناطیس کے ذریعے ہر بیماری کو انسانی جسم سے نکال کے ختم کیا جا سکتا ہے۔
پاپولر سائنس یعنی جعلی سائنس کے اس شعبدہ باز کی وجہ سے حقیقی سائنسدان پریشان نظر آئے کیونکہ وہ حقیقت جانتے تھے لیکن مریضوں کا صحت یاب ہونا حیران کن تھا۔
تب ایک ایک سائنسدان نے اس کے پیچھے اصل کہانی جاننے کی کوشش کی یہ سائنسدان ماہر برقیات بنجمن فرینکلن تھا اس کو میسمر کے حواریوں نے بتایا کہ اصل چیز کیا ہے:
فرض کرو کہ تمہارا کوئی ماضی کوئی تجربہ نہیں ایک لمحے کے لیے سب کچھ بھول جاؤ۔۔۔ بھول جاؤ کہ تمہارا کوئی ماضی ہے یا کوئی دکھ یا بیماری تم لوگوں کو ہے اور کبھی کسی شک کرنے والے کے سامنے مقناطیسی عمل کا مظاہرہ نہ کرنا!

پس ثابت ہوا اصل شفاء اس مقناطیسی عمل یا میسمر کے ہاتھ میں نہیں بلکہ لوگوں کے اندھے یقین میں تھی یہ ان کا صحت یابی کا یقین تھا جو شفاء میں بدل جاتا تھا نہ کہ میسمر کی ذہانت یا کرامت!

یہی عیارانہ طریقہ جعلی پیروں فقیروں کا ہے جب وہ اپنے پاس آنے والے لوگوں اور مریدوں کو کہتے:
تعویذ پہ یقین رکھنا اور تعویذ کو شک کی وجہ سے کھول کر بھی نہیں دیکھنا ورنہ اثر زائل ہو جائے گا۔
اصل کرامت پیر کے تعویذ یا جھاڑ پھونک میں نہیں مرید کی جہالت میں ہے۔

کارل سیگاں

(خاکہ)

# گرینڈ مدر

رضیہ اسماعیل (یوکے)

انسانوں کی تو کئی قسمیں ہوسکتی ہیں مگر ہمارے خیال میں بزرگوں کی صرف دو ہی قسمیں ہوتی ہیں۔ایک وہ بزرگ جو اپنی بزرگی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسرے وہ جو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں۔

ہماری نانی امّاں یعنی گرینڈ مدر کا تعلق بزرگوں کے اول الذکر قبیلے سے تھا۔نانی امّاں کو اگر بزرگوں کے اس قبیلے کی چیف کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔نانی امّاں نے مدرسہ تو دور کی بات ہے زندگی میں کبھی کتاب بھی نہیں پڑھی تھی مگر وہ زندگی کے فلسفے کو کتابیں چاٹنے والوں سے بہت بہتر طور پر سمجھتی تھیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ وہ زبردستی دوسروں کو اپنا فلسفہ حیات سمجھانے کے لیے مثبت اور منفی دونوں طریقے استعمال کرنے سے گریز نہ کرتیں۔

ہم نانی کی اس ہٹلر جیسی عادت سے تنگ آ کر نانی کی بجائے انہیں گرینڈ مدر کہا کرتے تھے۔نانی کو اس لفظ سے بہت چڑ تھی۔ان کے خیال میں اس انگریزی نام سے ان کا اسلامی تشخص خطرے میں پڑ سکتا تھا۔یہ الگ بات ہے کہ نانی خود ہمارے لیے زندگی بھر خطرے کی گھنٹی بنی رہیں۔

نانی کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا قدرے مشکل ہے۔مگر جب ہمیں نانی سے اور نانی کو ہم سے آشنائی ہوئی تو وہ یقیناً زندگی کے گلشن سے اسی پھول نوچ چکی تھیں۔تمام گلشن کا قریب قریب صفایا کرنے کے باوجود نانی بہت تازہ دم تھیں۔نانی کے رعب، دبدبہ اور گرجدار آواز سے اچھوں اچھوں کا پتہ پانی ہو جاتا۔ایسے میں اگر ہماری نحیف ونزار ٹانگیں صرف کانپنے کا فریضہ سرانجام دیتی تھیں تو اس پر نہ ہمیں اس وقت حیرت تھی اور نہ ہی اب ہے۔

اپنی اس قدر صحت مند نانی کو دیکھ کر ہمیں دوسروں کی مریل قسم کی نانیاں بہت اچھی لگتیں۔بچپن کی بہت سی خواہشات میں سے ہماری ایک خواہش یہ بھی رہی کہ کاش اللہ میاں ہمیں بھی ایک لرزتی کانپتی ہوئی نانی عطا کرتے۔ جس کی موتیا بھری آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک ہوتی۔ہزار کوشش کے باوجود نانی اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکتیں۔مصنوعی دانت ہوتے جو نانی نہ تو ہمیں دکھا سکتیں اور نہ ہی ان سے کھا سکتیں۔کانوں میں آلہ سماعت ہوتا جسے ہم جب جی چاہتا غائب کر دیتے۔ ہماری بچپن کی ان بے تکی خواہشات کے باوجود نانی کی تمام سمعی اور بصری قوتیں پوری طرح بیدار تھیں جس کی وجہ سے ہم بچپن میں کبھی بھی ٹھیک سے خواب خرگوش کے مزے نہ لے سکے۔

اپنی اکلوتی نانی کے اس قدر صحت مند ہونے کا شکوہ ہم اکثر اللہ میاں اور کبھی کبھی اپنی والدہ سے بھی کیا کرتے۔جو صرف مسکرا کر رہ جاتیں۔نانی کی قابل رشک صحت کی بدولت ہم بچپن میں کبھی صحت مند نہ ہو سکے۔جس کی وجہ سے نانی ہم سے اور بھی نالاں رہتیں۔نانی شاید یہ نہیں جانتی تھیں کہ برگد کے اس تنومند درخت کی شاخوں میں سے روشنی کی کوئی کرن اس کے سائے میں اگنے والے نرم ونازک پودوں تک اگر پہنچ سکتی تو تب کوئی بات بنتی۔

ویسے اس عمر میں نانی کی قابلِ رشک صحت ان کے لیے تو عطیہ خداوندی تھی مگر نانی پر اللہ کے انعام واکرام کی یہ برکھا ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔نانی کے بیمار پڑنے کی خواہش حسرت میں بدل جاتی اور اس انکل پچسی خواہش کی پاداش میں الٹا ہم بستر پکڑ لیتے۔

ہمارے خیال میں نانی اور اللہ میاں کے درمیان مواصلاتی رابطہ بہت زبردست تھا۔یہ سیٹلائٹ کبھی بھی خراب نہ ہوتی۔اسی لیے تو نانی کی دعائیں تھوک کے حساب سے شرف قبولیت پاتیں جبکہ ہماری کوئی دعا قبول ہی نہ ہوتی۔

نانی نے اپنی صحت کی مکمل ذمہ داری تو اللہ میاں پہ چھوڑ رکھی تھی مگر ہماری ننھی منی سی صحت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لادے لادے پھرتیں۔محلے میں سو طرح کی کھٹی میٹھی چیزیں بیچنے والے وارد ہوتے مگر کیا مجال کہ نانی انہیں کبھی گھر کی دہلیز پر رکنے دیں۔نانی کے خیال میں یہ تھرڈ ریٹ قسم کی چیزیں کھا کر ہم بچپن میں ہی انہیں داغ مفارقت دے سکتے تھے۔

نانی کی چیرہ دستیاں اگر یہیں تک رہتیں تو خیریت تھی مگر وہ تو ہماری پرائیویٹ لائف میں بھی دندناتی ہوئی آتیں اور ہر چیز تہس نہس کر کے رکھ دیتیں۔ کتنی بھی آہستگی سے باتیں کرتے، وہ ضرور سن لیتیں۔ہمیں پورا یقین تھا کہ یا تو نانی کے پاس جن تھے یا پھر وہ لپ ریڈنگ کی ماہر تھیں۔کبھی کبھی تو وہ چہرے کے مختلف زاویوں سے ہی اندازہ لگا لیتیں کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

ہم جہاز جیسے گھر کے کسی بھی کونے کھدرے میں چھپ کر بیٹھ جاتے، نانی ہمیں سرچ لائٹ سے ڈھونڈتی ہوئی حاضر ہو جاتیں۔نانی کی اس کھوجیوں والی عادت سے ہم بہت الرجک تھے۔کبھی کبھی تو وہ موقع واردات پہ رنگے ہاتھوں پکڑ کر اپنی مرضی کی ایف۔آئی۔آر لکھواتیں اور کڑی سے کڑی سزا نہ صرف خود دیتیں بلکہ امّاں کو بھی ورغلاتیں۔

اس زمانے میں ہماری اولین خواہش یہی تھی کہ اے کاش ہماری نانی کے ہاتھوں میں اور کچھ نہیں تو ایک عدد لاٹھی ہی ہوتی۔جیسے ہی ان کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہم خبردار ہو جاتے۔ان حالات میں نانی کے آنے کی پیشگی اطلاع ملنا ناممکنات میں سے تھا۔اسی لیے وہ چراغ کے جن کی طرح ہمارے چراغ کو رگڑنے کے بغیر ہی حاضر ہو جاتیں۔اور ہم الہ دین کو کوسنے دیتے رہ جاتے۔

نانی کے اسی مستقل مارشل لاء دور کے دوران ہم نے بچپن کو خیر باد کہہ کر جوانی کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑا۔یہ بھی ہمیں نانی سے ہی معلوم ہوا کہ ہم خیر سے جوان ہو گئے ہیں۔کلی سے پھول بن گئے ہیں۔نانی کا بس نہیں چلتا تھا کہ خوشبو کو قید کر لیتیں۔اس لیے انہوں نے ہمیں ہی قفس میں ڈالنے پر اکتفا کیا۔اگر ہم جانتے کہ دور جوانی اس قدر دردناک ہوگا تو ہم ہمیشہ بچے ہی رہتے۔

نانی کی چوکیداری بے مثل تھی۔کیا مجال کہ چڑیا بھی پر مار جائے۔گھر

میں داخل ہونے کے لیے دو دروازے تھے۔ صدر دروازے پر ہمیشہ بڑا تالا منہ چڑاتا رہتا اور یہ دروازہ دن کے صرف خاص اوقات ہی میں کھلتا۔ گھر میں عام ٹریفک کے لیے صرف ڈیوڑھی کا راستہ بچتا تھا جہاں تخت پوش پر گاؤ تکیہ لگائے نانی اپنا پھن پھیلائے بیٹھی رہتیں۔ گلی میں سے گزرنے والوں پہ وہ خاص نظر رکھتیں۔ محلے میں تقریباً سبھی گھر عزیزوں، رشتہ داروں کے تھے۔ جہاں کوئی نیا چوکھٹا نظر آتا نانی فکرمند ہو جاتیں اور اگر نوارد کوئی نوجوان ہوتا تو نانی کی تشویش دوچند ہو جاتی۔

نوجوان لڑکیوں کو ڈیوڑھی میں بیٹھنے کی سخت ممانعت تھی۔ البتہ اگر کبھی اچھے موڈ میں ہوتیں تو آواز دے کر بلاتیں اور پاس بٹھاتیں۔ نانی کا یہ متضاد قسم کا رویہ ہمیں بے حد کنفیوز رکھتا۔ مگر جیسے ہی ہم ڈیوڑھی میں قدم رکھتے نانی چق گرا دیتیں۔ ان کے خیال میں بچیوں کو نظر لگنے کا اندیشہ تھا۔ ہم نانی کی خوش فہمی کی داد دیئے بنا نہ رہتے۔ بھلا ان کی موجودگی میں نظر کی کیا مجال کہ ہمیں لگ جاتی۔ ہم نانی کی چوکیداری سے اتنے بیزار تھے کہ الٹا نظر کے گلے پڑ جاتے۔

ہماری سہیلیوں کے ساتھ نانی کا رویہ ایسے ہوتا جیسے وہ ہمارے لیے نامحرم ہوں۔ سکول کے علاوہ سہیلیوں سے ملنا جلنا منع تھا۔ صرف مسکین قسم کی سہیلیوں کو گھر میں قدم رکھنے کی اجازت تھی لیکن اس سے پہلے نانی ان کا پورا شجرہ ازبر کرتیں۔ پسند آتا تو راہداری دیتیں نہیں تو ڈیوڑھی سے ہی واپس کر دیتیں۔

تیز طرار قسم کی سہیلیاں نانی کو سخت ناپسند تھیں۔ ان کے خیال میں اس قسم کی لڑکیاں ایڈونچر کی تلاش میں ہوتی ہیں اور ان کی صحبت ہمارے لیے زہر قاتل تھی۔

جن سہیلیوں کے جوان بھائی ہوتے وہ بھی ہمارے ہاں آنے سے ڈس کوالیفائی ہو جاتیں۔ نانی کے خیال میں جوان بھائیوں والی سہیلیاں سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔

سہیلیوں کے ساتھ ساتھ نانی ٹیلی ویژن سے بھی سخت بیزار تھیں۔ اس زمانے میں ٹی وی نیا نیا آیا تھا۔ اس لیے نانی صدر ایوب کے سخت خلاف تھیں کہ یہ شیطانی چرخہ ملک میں کیوں داخل ہونے دیا۔ جس کمرے میں ٹی وی تھا نانی وہاں قدم نہ رکھتیں۔ نانی اگر آج زندہ ہوتیں تو ٹی وی کی حالت زار دیکھ کر اپنی این جی اَو رجسٹر کرواتیں۔ احتجاجی جلوس منظم کرتیں اور اسے انسانی حقوق کا مسئلہ بنا کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتیں۔

ہمارے خیال میں نانی اگر ٹی وی اور ہماری سہیلیوں کے معاملے میں ہاتھ نرم رکھتیں تو ان کے بارے میں ہماری رائے اتنے کنفیوژن کا شکار نہ ہوتی۔

لیکن ہماری باتوں سے آپ ہماری نانی کے بارے میں کوئی غلط رائے مت قائم کریں۔ جہاں نانی میں تھوڑی بہت بشری کمزوریاں تھیں وہیں ان میں بے شمار خوبیاں بھی تھیں۔ ان کی سب سے اچھی خوبی تو یہ تھی کہ وہ کہانیاں بہت اچھی سناتیں۔ نانی کی خود ساختہ کہانیاں کسی فسانہ عجائب سے کم نہ تھیں۔ جب جی چاہتا کہانی کو نیا موڑ دے کر ایک نئی کہانی شروع کر دیتیں۔ کہانی کا انجام معلوم کرنے کے لیے ہم نانی کے رحم و کرم پر تھے۔ اپنی اس پوزیشن کا وہ خوب فائدہ اٹھاتیں۔ جب کبھی ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو ہم نانی سے ناراض ہو جاتے۔ ہنستے ہوئے کہتیں دیکھو چاند میں رہنے والی پریاں تمہیں دیکھ رہی ہیں۔ اچھے بچے ناراض نہیں ہوتے۔ ہم جل کر جواب دیتے نانی چاند میں پریاں نہیں رہتیں بلکہ وہاں چڑیلیں رہتی ہیں جو ہماری سب باتوں کی رپورٹ تمہیں دیتی رہتی ہیں۔ ہم چاند کو دیکھنے سے بالکل انکار کر دیتے۔ ہماری اس ہٹ دھرمی کا نانی پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر چاند کی طرف اچھال دیتیں۔ گویا چڑیلوں کو بھگا رہی ہوں۔

نانی کے چند معمولات زندگی بھر قائم رہے۔ مثلاً کہانی سنانا، مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا، صدقہ خیرات اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔

مہمانوں کو دیکھ کر یوں خوش ہوتیں جیسے بچے رنگ برنگے کھلونوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں۔ مہمانوں کی بے وقت آمد سے ہماری کہانی میں جو خلل واقع ہوتا وہ ہم سے برداشت نہ ہوتا۔ ہم شکایت کرتے تو ہنس کر کہتیں یہ ہمارے نہیں اللہ کے مہمان ہیں۔ یہ بات ہماری نوخیز عقل میں نہیں سماتی تھی اور ہم منہ بسور کر کہتے اگر اللہ کے مہمان ہیں تو اللہ کے پاس جائیں یہاں کیا کرنے آتے ہیں۔

اللہ کے مہمانوں کا ناشتہ بڑا شاندار ہوتا۔ دیسی سویاں اور انڈوں کا حلوہ ان موقعوں پر بہت اہتمام سے تیار ہوتا۔ خالص دیسی گھی جو ہمیشہ اسٹور میں تالے میں پڑا رہتا اس دن قفس سے آزاد ہوتا۔ مہمانوں سے محبت کا نقطہ عروج دیسی گھی ہی ہوتا۔ اس زمانے میں ڈالڈہ گھی نیا نیا نکلا تھا۔ نانی اس کی سو سو برائیاں کرتیں۔ بناسپتی گھی کی برائیاں سن سن کر ہمیں پورا یقین ہو گیا تھا کہ اسے کھانے والے سب لولے لنگڑے ہو جائیں گے۔ ڈالڈے کا ڈبہ دیکھ کر نانی جھٹ گھونگھٹ نکال لیتیں جیسے کسی نامحرم کو دیکھ لیا ہو۔

صدقہ خیرات دل کھول کر کرتیں۔ فقیروں کا بہت بے چینی سے انتظار کرتیں۔ جیسے ہی کوئی فقیر گلی میں صدا لگاتا، کسی نہ کسی کو دوڑاتیں کہ اسے پکڑو۔ فقیر اگر تیز رفتار ہوتا اور گھر کے دروازے سے آگے نکل جاتا تو نانی کا موڈ خراب ہو جاتا۔ خیرات دینے کے ساتھ ساتھ اس کی خوب خبر لیتیں کہ بھیک مانگنے نکلے ہو یا اولمپک ریس میں حصہ لینے۔ فقیر ہو تو فقیر بن کر رہو۔ اللہ کے نام پر سوال کرتے ہو اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی چل پڑتے ہو۔ ہمیں اس سے شرمندہ کراؤ گے کہ اس کے نام پر کسی نے کچھ مانگا اور ہم دے نہ سکے۔

صحت مند فقیر کو دیکھ کر نانی کی تیوری پر بل پڑ جاتے۔ کہتیں ہٹا کٹا مشٹنڈا بھیک مانگتا ہے۔ کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتا۔ ایسی سرزنش کرتیں کہ وہ فقیر دوبارہ ہماری گلی کا رخ نہ کرتا بلکہ شہر کے دوسرے صحت مند فقیروں کو بھی خبردار کر دیتا کہ فلاں محلے میں مت جاؤ۔ وہاں احتساب ہوتا ہے۔ ذرا دبو قسم کے فقیر تو خاموشی سے چلے جاتے۔ مگر دل گردے والے نانی سے الجھ پڑتے اور کہتے اماں اگر کچھ دینا ہے تو دو ہماری صحت کو نظر کیوں لگاتی ہو۔ ایسے گستاخ فقیر کو نانی تھانے میں رپورٹ کرانے کی دھمکی دیتیں جس پر کبھی عمل نہ ہوا۔

نانی کے اس سکندرانہ سلوک کی وجہ سے صرف مریل قسم کے فقیر ہی ہمارے محلے میں قدم رکھتے۔ ہر جمعرات کو اپنے بزرگوں کا ختم پڑھ کر بہت بے

تابی سے فقیروں کا انتظار کرتیں۔ اگر فقیر لیٹ ہو جاتے تو انہیں باقاعدہ ڈانٹ پڑتی۔ سامنے بٹھا کر کھانا کھلاتیں، پانی پلاتیں اور پھر یوں بھگا دیتیں جیسے وہ بغیر اجازت ڈیوڑھی میں گھس آئے ہوں۔

نانی کے برعکس نانا بہت کم گو تھے۔ نانی کی ساری سرگرمیوں سے لا تعلق اپنی ہی دنیا میں مگن رہتے۔ نانی کو ان کی خاموشی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ جان بوجھ کر وقفے وقفے سے اس پرسکون تالاب میں کنکریاں پھینکتی رہتیں۔ نئی نئی ترکیبیں سوچ کر نانا پر حملہ آور ہوتیں مگر نانا بھی ان کے حملوں سے بچنا خوب جانتے تھے۔

نانی کے مقابلے میں نانا بہت پڑھے لکھے تھے۔ اردو، عربی اور فارسی پر انہیں مکمل عبور تھا۔ ہیروں کے کاروبار میں دنیا گھوم چکے تھے۔ اس عمر میں زیادہ وقت موٹی موٹی کتابیں پڑھنے میں گزارتے۔ ان کتابوں کو نانی زندگی بھر اپنی سوت ہی سمجھتی رہیں۔

نانی تو قبول صورت ہی تھیں مگر نانا اس عمر میں بھی یونانی دیوتا لگتے۔ اٹھی ہوئی راجپوتی ناک، کشادہ پیشانی، ذہین آنکھیں، سرخ و سپید رنگت۔ نانا اگر خوش شکل اور پڑھے لکھے تھے تو نانی کو اپنے اونچے نمبردار گھرانے کا بڑا مان تھا۔ بات بات پر بابل کے گھر کے ست رنگے کبوتروں کا ذکر کرتیں اور آبدیدہ ہو جاتیں۔

جب کبھی نانا چپ شاہ کا روزہ توڑتے اس دن بہت گھن گرج کے ساتھ بارش ہوتی۔ ایک ہی کمرے میں اپنے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر لڑتے۔ بہت سے خاندانی حالات ہمیں ان معرکوں کے دوران ہی معلوم ہوئے۔ نانی لڑتے لڑتے تھک جاتیں تو پانی پی کر لیٹ جاتیں۔ ہم سمجھتے کہ سیز فائر ہو گیا مگر نانی تازہ دم ہو کر پھر گولہ باری شروع کر دیتیں۔ نانی کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ نانا نے آج تک اپنے دل کی گھنڈی نہیں کھولی تھی۔ ہم سمجھتے کہ گھنڈی کوئی چھوٹی موٹی کھڑکی ہوگی جو آج تک نہ کھل سکی۔ یہ دروازہ تو ہرگز نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اگر نانا کے دل کا دروازہ بند ہو جاتا تو نانی پر ان کے گھر کا دروازہ کیسے کھلتا۔

جس دن یہ گھمسان کا رن پڑتا، ہماری کہانی گول ہو جاتی۔ اس دن ہم نانی کے کہے بغیر ہی چاند میں پریاں تلاش کرنے لگ جاتے مگر ہمیں وہاں ہشاش بشاش چڑیلوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا۔ جو ہماری کہانی گول ہونے کی خوشی میں جشن منا رہی ہوتیں۔

خالہ جو ساتھ والے گھر میں رہتی تھیں، اس معرکہ آرائی کے دوران یو۔این۔او بن کر بیچ بچاؤ کی کوشش کرتیں تو نانی کی گولہ باری کی زد میں آ جاتیں۔ نانی کو یو۔این۔او کی طرح خالہ کے کردار پر بھی شک رہتا۔ ان کے خیال میں وہ نانا کی طرفداری کرتی تھیں ایسے میں وہ خالہ کی ثالثی کو پوری حقارت سے ٹھکرا دیتیں اور انہیں اپنے ہاں آنے سے بھی منع کر دیتیں مگر شام ہوتے ہی خالہ کو آوازیں دینے لگ جاتیں اور نانا کی سائیڈ لینے پر انہیں برا بھلا بھی کہتی رہتیں۔ نانی کا واویلا سن کر نانا صرف مسکرا کر رہ جاتے۔

نانی ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے بیٹوں سے ملنے داتا کی نگری ضرور جاتیں۔ عجیب اتفاق تھا کہ یہ سرکاری دورہ اکثر لڑائی کے فوراً بعد ہی پلان ہوتا۔ سفر کی تیاری بہت زور شور سے ہوتی۔ ایک دن پہلے ہی اسٹیشن جا کر قلی بک کروا کر آتیں۔ تانگہ استعمال کرنا فضول خرچی سمجھتیں۔ خوب اہتمام سے غسل ہوتا۔ کہتیں سفر پر انسان کو پاک صاف ہو کر جانا چاہیے۔ کیا پتہ یہ زندگی کا آخری سفر ہو۔ رات کاٹنی مشکل ہو جاتی۔ اٹھ اٹھ کر رات بھر گھڑی دیکھتی رہتیں کہ کہیں ''بابو ٹرین'' نہ نکل جائے۔ بابو ٹرین کے علاوہ کسی دوسری ٹرین کو زندگی بھر گھاس نہ ڈالی۔ صبح چار بجے ہی دیسی گھی کے پراٹھے تلے جاتے۔ گھی کی مہک سے سارا گھر جاگ اٹھتا۔ ہم آنکھیں ملتے ہوئے نانی کے پاس رسوئی میں آ بیٹھتے مگر کیا مجال جو پراٹھا ہمیں دے جاتیں۔ نانی کی بھی عجیب منطق تھی۔ کہتیں یہ سفر کا کھانا ہے۔ صرف مسافر کھا سکتے ہیں۔ دو گھنٹے کے سفر میں ساتھ لے جائے جانے والے پراٹھوں کی تعداد دیکھ کر لگتا کہ یہ ساری ٹرین کا ناشتہ ہے جیسے ہی گاڑی اسٹیشن چھوڑتی، پراٹھوں کی پوٹلی کھل جاتی۔ نہ صرف خود مزے لے لے کر کھاتیں بلکہ پاس بیٹھے ہوؤں کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کر کھانے پر مجبور کرتیں۔ یہ سفرنامہ ہم اس لیے لکھ رہے ہیں کہ ہم نانی کے ایک سفر کے چشم دید گواہ ہیں۔ اس کے بعد ہم نے نانی کی ہمراہی سے توبہ کر لی۔

نانی کی پسندیدہ ہابی خاندان کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے تلاش کرنا تھی۔ آپ ہی آپ جوڑ ملاتی رہتیں۔ نانی کے طے کیے ہوئے رشتے کو رد کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ لیکن دونوں فریقوں کی رضامندی کے باوجود بھی اگر بیل منڈھے نہ چڑھتی تو اللہ کی مرضی کہہ کر خاموش ہو جاتیں۔ شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکے لڑکیوں کی رضامندی معلوم کرنا شان کے خلاف سمجھتیں۔ جہاں کسی لڑکے لڑکی کو آپس میں بات کرتے دیکھا، ان کا تخیل لوٹ پوٹ ہو جاتا اور اسے رضامندی ہی سمجھ لیتیں۔

البتہ خاندان سے باہر آنے والے رشتوں کو بیک جنبش قلم رد کر دیتیں ان کے خیال میں انسانی نسلیں اسی طرح زوال پذیر ہوئی ہیں۔ خالص خون کی اصطلاح بہت شدومد سے استعمال کرتیں، جو کبھی ہمارے پلے نہ پڑی۔ غرضیکہ نانی کا بس نہیں چلتا تھا کہ خاندان کے سبھی لڑکے لڑکیوں کی ایک ہی دن میں اجتماعی شادی کروا کر نگرانی کی مشقت سے بچ جاتیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ نانی کھلی کتاب تھیں۔ اندر باہر سے ایک مگر نانی نے ہم سے زندگی بھر ایک بات چھپائے رکھی یا شاید بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ جس دن نانی کا انتقال ہوا یہ خبر ہم پر ایٹم بم بن کر گری کہ وہ ہماری نانی نہیں بلکہ پرنانی تھیں۔ یعنی گریٹ گرینڈ مدر۔ سچ پوچھئے تو ہمیں زندگی میں پہلی بار خاموش لیٹی ہوئی نانی پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

**سچا پیغمبر**

خدا جب انسان کو اچھا خاصا مضبوط کرنا چاہے تو اس کی طرف اپنا سب سے وفادار خادم، سب سے سچا پیغمبر، یعنی ''دکھ'' بھیج دیتا ہے۔

کیر کیگارڈ

# ایک صدی کا قصّہ

نسیم بانو

دیپک کنول (ممبئی)

جیسے ہی ایک نئی نویلی دلہن اپنے سسرال میں قدم رکھتی ہے تو اُسے اس گھر کے ضوابط اور قوائد سمجھائے جاتے ہیں تا کہ وہ اسی قاعدے کے حساب سے چلے۔ایک نئے ملازم اور ایک نئی دلہن میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔میں نے جب دلیپ کمار صاحب کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تو مجھے بھی گھر کے کچھ آداب سمجھائے گئے۔دلیپ صاحب کا یہ حکم تھا کہ کوئی بھی سائرہ جی کو سائرہ جی، سائرہ بھابی یا سائرہ آپا نہ کہے بلکہ اُسے سائرہ بی کے نام سے بلائے کرے۔دلیپ صاحب کی بہن اختر آصف جسے میں اختر دیدی کے نام سے یاد کرتا تھا، اس قاعدے کے حساب سے مجھے اختر دیدی سے اختر بی کے نام سے مخاطب ہونا پڑا۔گھر میں اور بھی کئی لوگ رہتے تھے جن میں سائرہ بی کی نانی شمشاد بیگم، اُنکی ماں نسیم بانو، اُنکے بھائی سلطان بھائی اور اُنکی بیگم راحت بی بی۔کوئی انہیں اُن کے نام سے نہیں بلا سکتا تھا۔نانی کو اماں جی کے نام سے بلایا جاتا تھا جب کہ نسیم بانو جی آپا جی اور سلطان بھائی کی بیوی راحت بھابی کے نام سے جانی جاتی تھی۔شمشاد بیگم (اماں جی) لوگوں سے بہت کم ملتی جلتی تھیں کیونکہ وہ صاحب فراش تھیں۔میری ایک بار اُن سے روبرو ملاقات ہوئی تھی۔زیادہ تر وہ اپنے بستر پر رہا کرتی تھیں۔وہ چلنے پھرنے سے معذور تھیں اسلئے شام کے وقت نوکر اُنہیں اُٹھا کر چھت پر لے کے جاتے تھے اور پھر اُنہیں ویل چیر پر بٹھا کر گھمایا کرتے تھے۔یہ اُن کی شام کی سیر ہوا کرتی تھی۔آپا جی ہر روز دوپہر کے وقت کھانا کھانے کے لئے نیچے ہال میں آجایا کرتی تھیں۔ہر بار سائرہ جی کو اُن سے میرا تعارف کرانا پڑتا تھا۔وہ جب بھی نیچے آتی تھیں تو پوری آرائش و زیبائش کے ساتھ۔مزے کی بات یہ تھی کہ جوانی ڈھلنے کے باوجود اُن کی خوبصورتی برقرار تھی۔اُن کی موٹی پر ڈھلتی عمر نے کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔

شمشاد بیگم جو کہ نسیم بانو کی والدہ تھیں، ایک مشہور مغنیہ تھیں۔وہ چھمیا بائی کے نام سے مشہور تھیں۔(اسے گلوکارہ شمشاد بیگم سمجھنے کی بھول نہ کریں)۔وہ پرانی دلی میں میراثیوں کے محلے میں رہتی تھیں۔اُس کا ایسا غلغلہ تھا کہ اُس کا گانا سننے کے لئے بڑے بڑے رئیس ذادے اور اُمرا اُس کا گانا سننے آتے تھے اور اُسکی ایک ایک ادا پر اپنی دولت لٹا دیتے تھے۔سوچئے وہ اپنے زمانے میں کتنی موٹی اور دلکش رہی ہوگی۔اُس کے گھر میں ہُن برس رہا تھا۔حسنا پور کا نواب جس کا نام نواب عبدل وحید خان تھا جو کہ ایک خوشحال اور بہت بڑے جاگیردار خاندان کا چشم و چراغ تھا وہ شمشاد بیگم پر لٹو ہوگیا۔اُس کا خاندان بڑا ہی قدامت پسند تھا۔عبدل وحید خان یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کا خاندان شمشاد بیگم کو کسی بھی حالت میں اپنی بہو قبول نہیں کرے گا۔وہ شمشاد بیگم کے پیچھے ایسے دیوانہ ہو گیا تھا کہ اُسنے اپنے خاندان سے بغاوت کی اور شان و شوکت کی زندگی چھوڑ کر وہ دلی چلا آیا اور اُس نے شمشاد بیگم سے نکاح کر ڈالا۔شادی کے بعد وہ پرانی دلی میں اپنی بیگم کے ساتھ رہنے لگا۔یہیں پر اُن کے یہاں ایک بچی نے جنم لیا۔تاریخ تھی چار جولائی اور سن تھا 1916۔اس بچی کا نام روشن آرا رکھا گیا۔وہ بھی اپنی ماں کی طرح کافی خوبصورت تھی۔

روشن آرا نے اپنی ابتدائی تعلیم دلی کے کوئن میری ہائی اسکول سے شروع کی۔وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اُس کی ماں اُسے ہمیشہ پردے میں رکھتی تھی تا کہ اُسے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔اُسے ایک پالکی میں بٹھا کر اسکول پہنچایا جاتا تھا۔شمشاد بیگم اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں۔بیٹی کو ڈاکٹر بننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ایک بار اُس نے فلم اداکارہ سلوچنا (روبی میرس) کی ایک فلم دیکھی تھی۔جب سے اُس کے دل میں بھی فلم اداکارہ بننے کی تمنا جاگ گئی تھی۔جب ایک بار اُس نے اپنی ماں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ کافی برہم ہوئیں۔وہ فلموں میں کام کرنے کے قطعی خلاف تھیں۔روشن آرا کی حسرت دل میں ہی دب کر رہ گئی۔ماں نے اُسے تنبیہ کی کہ وہ فلموں کا خیال چھوڑ کر اپنی پڑھائی پر دھیان دے۔روشن آرا کو پڑھائی میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔وہ بس رات دن فلمی اداکارہ بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔

عنایت دہلوی اُس زمانے کے ایک مشہور صحافی تھے جن کی پہنچ بڑے بڑے فلمسازوں اور سرمایہ کاروں تک تھی۔وہ اکثر شمشاد بیگم کے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔شمشاد بیگم اپنی بیٹی کی اس فلمی دیوانگی سے کافی فکرمند تھی۔ایک بار اُس نے عنایت دہلوی سے اس بات کا تزکرہ کیا۔عنایت دہلوی اُسے فلموں کے بہت بڑے سرمایہ کار سیٹھ کرنانی کے پاس لے کر گئے۔جب سیٹھ نے روشن آرا کو دیکھا تو وہ پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئے۔اُن دنوں وہ ایک فلم بنانے کی تیاری کر رہے تھے جس کا نام ''اللہ کی تلوار'' تھا۔اس فلم کا ہیرو پشاور کا ایک بانکا اختر نواز تھا۔سیٹھ کرنانی سے روشن آرا کا معاہدہ ہوا جس کے تحت وہ کسی باہری فلم میں کام نہیں کر سکتی تھی۔شوٹنگ شروع ہوئی۔روشن آرا اس فلم کے ہیرو اختر نواز کے قریب آنے لگی۔دونوں میں پیار کی پینگیں بڑھنے لگیں۔سیٹھ کرنانی کو جب یہ بھنک لگ گئی تو اُس کو بہت بڑا جھٹکا لگ گیا۔اُس نے اختر نواز کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور اُس سے اس خبر کی حقیقت جاننا چاہی۔اختر نواز پشاوری پٹھان تھا۔اُس کی انا کو یہ گوارہ نہ ہوا کہ کوئی اُس کی ذاتی زندگی میں دخل دے۔اُس نے سیٹھ کرنانی سے دوٹوک لہجے میں کہا کہ اُس کا کوئی حق نہیں بنتا کہ وہ اُس کی ذاتی زندگی کے بارے میں اُس سے کوئی سوال کرے۔سیٹھ کرنانی اُس کے جواب سے ہتھے سے اکھڑ گیا۔اُس نے اُسے فلم سے الگ کرنے کی دھمکی دی۔دونوں میں خوب تکرار ہوئی۔اختر نواز کو فلم سے الگ کر دیا گیا۔اُس نے فلم چھوڑ کر دودھ کی دکان کھول لی۔جب روشن آرہ بیگم کو یہ خبر ملی تو اُس کے دل میں کھلی پیار کی ننھی سی کونپل مرجھا گئی اور وہ

مغموم و بیزار ہو کے سیٹھ کے پاس گئی۔ اُس نے سیٹھ کرنانی سے کہا کہ وہ بھی یہ فلم چھوڑ رہی ہے۔ سیٹھ کرنانی پہلے تو اُس کے جواب سے ہکے بکے رہ گئے لیکن دوسرے ہی پل اُن کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ روشن آرا پر بگڑ گئے۔ جب اس سے بات نہیں بنی تو سیٹھ نے اُسے خوب ڈرایا دھمکایا، معاہدے کا حوالہ دیکر اُس پر قانونی کاراوائی کرنے کی دھمکی دی۔ روشن آرا پر ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ فلم چھوڑ کر اپنے گھر واپس لوٹ گئی۔

اُسکی ماں چاہتی تھیں کہ وہ پڑھائی پر دھیان دے۔ اُس کا من تو پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ ایک طرف اپنے محبوب کی جدائی اُس کے دل کو برما رہی تھی تو دوسری طرف ہاتھ سے فلم جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ اس واقعے کے کچھ مہینے بعد اُس کے ماں باپ نے بمبئی گھومنے کا پروگرام بنالیا۔ جب وہ بمبئی پہنچ گئے تو ایک دن روشن آرا نے شوٹنگ دیکھنے کی ضد کی۔ وہ ایک اسٹوڈیو میں شوٹنگ دیکھنے چلے گئے۔ وہاں پر اُس زمانے کا مشہور فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار سہراب مودی شوٹنگ کر رہا تھا۔ جیسے ہی اُس نے روشن آرا کو دیکھا تو اُس کا حسن دیکھ کر وہ مبہوت ہو کے رہ گیا۔ اُس نے اُسے پاس بلالیا اور پھر اُس کا نام وغیرہ پوچھ کر کہا کہ کیا وہ اُس کی اگلی فلم میں اتھیلو کا کردار ادا کرے گی تو اُس کے جواب سے پہلے ہی اُس کی ماں نے اُس کی پیش کش یہ کہہ کر ٹھکرادی کہ وہ ابھی بچی ہے اور یہ کہہ کر وہ اپنی بیٹی کو اسٹوڈیو سے باہر لے گئی۔ چند روز کے بعد وہ سب واپس دلی لوٹ گئے۔

روشن آرا فلم میں کام کرنے کے لئے بضد تھی۔ اماں تھی کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ جب روشن آرا نے دیکھا کہ اماں پر کچھ اثر نہیں ہو رہا ہے تو اُسنے بھوک ہڑتال شروع کی۔ اب کے اماں پسیج گئی مگر شرط یہ رکھی کہ شوٹنگ ختم ہوتے ہی وہ پھر سے اپنی پڑھائی پوری کرے گی۔ بیٹی نے ماں کی شرط مان لی اور اس طرح اُسے فلم میں کام کرنے کی اجازت مل گئی۔

جس فلم میں وہ کام کرنے جا رہی تھی اُس فلم کا نام ''خون کا خون'' تھا۔ اس کی کہانی ولیم شیکسپیر کے ڈرامے ''اتھیلو'' پر مبنی تھی۔ وہ اتھیلو کا کردار ادا کر رہی تھی۔ وہ بمبئی پہنچی اور اُس نے سہراب مودی کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیا۔ یہ سہراب مودی تھے جنہوں نے روشن آرا کو نسیم بانو کا فلمی نام دیا۔ فلم کی شوٹنگ مکمل ہونے کے بعد وہ جب دلی لوٹی تو اُس کی جیب میں تین ہزار پانچ سو روپے تھے جو اُسے اس فلم میں کام کرنے کے عوض ملے تھے جب کہ اُس کی ماں اس سے زیادہ ایک مہینے میں کمایا کرتی تھی۔ جب اُس کے اسکول کی پرنسپل کو اس بات کی بھنک لگی کہ روشن آرا فلموں میں کام کرنے لگی ہے تو اُسکول میں جیسے بھونچال آ گیا۔ اُن دنوں فلم میں کام کرنے والوں کو عزت کی نظر سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ جب وہ حسب معمول اسکول گئی تو اُسے اسکول میں داخل ہونے سے روکا گیا۔ یہ پرنسپل کا حکم تھا۔ گھر والوں نے پرنسپل کو منانے کی کافی کوشش کی مگر وہ اپنا فیصلہ بدلنے پر راضی نہ ہوئی۔ نسیم بانو کو اداکاری کرنے کی یہ سزا ملی اور اسطرح اُس کی پڑھائی اُدھوری رہ گئی۔

فلم ''خون کا خون'' 1935 میں نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ منیروا موی ٹون جو کہ سہراب مودی کی فلم کمپنی تھی اس بینر کے تحت اُس نے کئی فلموں میں کام کیا جن کے نام تھے ''خان بہادر'' 1937 ''طلاق'' ''میٹھا زہر'' اور ''سنتی'' 1938۔ جس فلم نے اُسے شہرت سے ہمکنار کیا وہ فلم تھی ''پکار'' جس میں وہ ملکہ ''نور جہاں'' بنی تھی۔ یہ وہ فلم تھی جس میں کمال امروہی کو بطور رائٹر پہلا بریک ملا تھا۔ اس فلم کے لئے نسیم بانو کو خوب محنت کرنی پڑی۔ وہ ہر روز صبح کے وقت گھڑ سواری سیکھنے جاتی تھی۔ دن میں اُسے سنگیت کے کلاس میں جانا پڑتا تھا جہاں وہ گائکی سیکھ رہی تھی کیونکہ اس فلم میں اُسے اپنے گانے بھی خود ہی گانے تھے۔ اس فلم کو بننے میں ایک سال لگا۔ یہ فلم 1939 میں ریلیز ہوئی اور اس نے ملک بھر میں دھوم مچادی۔ سہراب مودی نے نسیم بانو کو اس طرح فلم میں پیش کیا تھا کہ اس فلم کی بدولت اُسے بیوٹی کوئن کا خطاب ملا۔ یعنی پری چہرہ نسیم بانو۔ اس فلم میں اُس کا گایا ہوا ایک گانا ''زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے'' کافی مقبول ہوا۔ اسے نسیم بانو نے ہی آواز بخشی تھی۔

اس فلم کی کامیابی کے بعد اُس کے گھر کے باہر پروڈیوسروں کی لائن لگ گئی۔ چونکہ وہ سہراب کے ساتھ معاہدہ بند تھی اس لئے وہ اُس کی اجازت کے بنا کوئی باہر کی فلم میں کام نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے جب سہراب مودی سے اجازت چاہی تو اُس نے اُسے معاہدے سے آزاد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہاں سے ان دونوں کے رشتوں میں کھٹاس پیدا ہوگئی۔ اسی بیچ اُس نے اپنے بچپن کے دوست احسان الحق سے شادی کی۔ وہ پیشے سے آرکیٹیکٹ تھا اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اصل میں اُس کے والد کی جان پہچان شمشاد بیگم سے دلی میں ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑا بلڈر تھا اور اکثر شمشاد بیگم کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ اپنے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ یہیں پر اُس کی دوستی ننھی روشن آرا سے ہوئی۔ جب اُس نے نسیم بانو سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو اُس کا والد بہت ناراض ہوا۔ احسان میاں کے سر پر بھی پیار کا بھوت سوار تھا اس لئے اُس نے والد کی نہ سنی اور والدین کے مخالفت کے باوجود اُس نے نسیم بانو کو اپنی شریک حیات بنالیا۔

جب سہراب مودی نے اُسے باہر کی کسی فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی تو اُس نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر اپنی فلم کمپنی کھولی جس کا نام اُنہوں نے ''تاج محل پکچرس رکھا''۔ اس بینر کے تحت اُنہوں نے کئی فلمیں بنائیں۔ پہلی فلم کا نام ''اُجالا'' تھا جس کی کہانی ایم اے مغنی نے لکھی تھی جب کہ اس کے مکالمے اور منظر نامہ کمال امروہی نے لکھا تھا۔ اس فلم کے مرکزی کرداروں میں نسیم بانو، پرتھوی راج کپور، رتن بائی، مرزا مشرف وغیرہ تھے۔ یہ فلم 1942 میں ریلیز ہوئی۔ دوسری فلم جو اس بینر تلے بنی اُس کا نام ''بیگم'' تھا۔ اس فلم کے اداکار تھے نسیم بانو، پربھا۔ مہر بانو، اشوک کمار، کمد لال گنگولی، شاردا وغیرہ جب کہ اس کے ہدایت کار سوشیل مجمدار تھے۔ یہ فلم 1945 میں ریلیز ہوئی۔ تیسری فلم ''ملاقات'' تھی جس کے اداکار نسیم بانو، پریم ادیب، رما شکلا، شاہ نواز وغیرہ تھے جب کہ اس کے ہدایت کار منشی دل تھے۔ اس فلم کے موسیقار کھیم

چند پرکاش تھے۔اگلی فلم کا نام ''چاندنی رات'' تھا جسے اُن کے میاں احسان میاں نے ڈائرکٹ کیا تھا۔اس فلم کو نوشاد علی نے اپنی مدھر دھنوں سے آراستہ کیا تھا۔ گیت کار شکیل بدایونی تھے۔اس فلم کے مکھیہ کلاکاروں میں شیام،نسیم بانو،ڈیوڈ، اُلہاس،نور جہاں اور ککو شامل تھے۔دوسری فلم جو احسان الحق نے ڈائرکٹ کی تھی اُس کا نام ''عجیب لڑکی'' تھا۔اس فلم کے کلاکار تھے نسیم بانو،رحمان،ششی کلا،جینت ،آغا وغیرہ جب کہ اس کی موسیقی غلام محمد نے ترتیب دی تھی۔یہ فلم 1952 میں ریلیز ہوئی۔یہ اس بینر کے تلے بننے والی آخری فلم تھی۔ان فلموں کی تکمیل کے دوراں اُس کی رسائی ششا دھر مکھر جی تک ہوئی جو کہ فلمستان کے روح رواں تھے۔اُنہوں نے نسیم بانو کو اپنی فلم ''چل چل رے نوجوان'' میں کاسٹ کیا۔اس فلم کے ہدایت کار ششا دھر مکھر جی کے برادر اصغر گیان مکھر جی تھے۔اس فلم کے اداکار اشوک کمار،نسیم بانو،جگدیش سیٹھی ،وی ایچ ڈیسائی وغیرہ تھے جب کہ اس کے لیکھک سعادت حسن منٹو تھے اور موسیقار تھے ماسٹر غلام حیدر۔اُن دنوں فلمستان کی فلم میں کام کرنا اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔

نسیم بانو اپنے زمانے کی سپر اسٹار تھیں۔اُس کی مقبولیت سے متاثر کئی بڑے ہدایت کاروں نے اُسے اپنی فلم میں کام کرنے کی پیش کش کیں جن میں اُس زمانے کے بہت بڑے فلم ساز اور ہدایت کار محبوب خان تھے۔محبوب خان نے اپنی فلم ''انوکھی ادا'' کے لئے اُسے کاسٹ کیا۔نسیم بانو کے مدمقابل دو ہیرو تھے۔سریندر اور پریم ادیب۔ساتھ میں تھے زیب قریشی،آمر بانو اور ککو۔ موسیقار تھے نوشاد۔یہ فلم 1948 میں ریلیز ہوئی اور کافی پسند کی گئی۔

فلم ''شبستان'' جو کہ شیام کی آخری فلم ثابت ہوئی اُس میں بھی ہیروئن نسیم بانو تھی۔یہ وہ فلم ہے جس میں شوٹنگ کے دوران شیام کی گھوڑے کی رکاب میں پاوں پھنسنے سے موت ہوئی تھی۔اس فلم میں ان دونوں کے علاوہ مراد، پن گپتا،سپرو اور ہیلن نے بھی کام کیا تھا۔اس فلم کے ہدایت کار بھوتی مشرا تھے اور اس فلم کے لئے ایک نہیں دو دو موسیقاروں نے سنگیت دیا تھا۔یہ موسیقار تھے، مدن موہن اور سی رامچندر۔یہ فلم 1953 میں ریلیز ہوئی۔

نسیم بانو نے اس کے بعد کئی چھوٹے بجٹ کی فلموں میں کام کیا جو ایکشن اور فینٹسی فلمیں تھیں۔جیسے ''سند باد جہازی''''باغی'' وغیرہ۔فلمی ناظرین نے نسیم بانو کو اس طرح کے کرداروں میں قبول نہیں کیا۔اُن کے دماغ میں اُس کی شبیہ ایک پری چہرہ خاتون کی تھی جس کی وجہ سے ان فلموں کو کوئی پزیرائی نہیں ملی۔ اُس نے سہراب مودی کی فلم ''نوشیرواں عادل'' میں ایک چھوٹا سا کردار ادا کیا۔یہ اُس کی آخری فلم تھی۔یہ فلم 1957 میں ریلیز ہوئی۔اس کے بعد اُس نے فلمی دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔

نسیم بانو کا فلمی سفر 1935 سے شروع ہوا اور 1957 میں جا کے ختم ہوا۔اپنی اس مختصر فلمی زندگی میں اُس نے بائیس ہندی اور ایک پنجابی فلم میں کام کیا ۔فلم ''پکار'' کے بعد وہ اسٹار بن گئی تھی اور اُس کے بعد اُس نے کئی کامیاب ستاروں کے ساتھ کام کیا۔جن میں سہراب مودی،چندر موہن،پرتھوی راج کپور،ترلوک کپور،اشوک کمار،شیام،سریندر،نوین یاگنیک،پریم ادیب اور رحمان قابل زکر ہیں ۔یہ اپنے زمانے کے سب سے کامیاب اور مشہور اداکار رہے ہیں۔

احسان الحق سے شادی کے بعد اُس کے دو بچے ہوئے۔ایک بیٹا اور ایک بیٹی ۔ بیٹے کا نام سلطان احمد اور بیٹی کا نام سائرہ بانو۔سلطان احمد 1935 میں پیدا ہوا جب کہ سائرہ بانو 1944 میں پیدا ہوئیں۔فلموں سے سنیاس لینے کے بعد نسیم بانو اور احسان الحق کے بیچ کچھ غلط فہمیاں پید ہوگئیں۔وہ پاکستان منتقل ہونا چاہتا تھا جب کہ نسیم بانو ہندوستان چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر پاکستان چلا گیا اور اپنے ساتھ اپنی ساری فلموں کے پرنٹ بھی لے کر گیا اور وہاں اُس نے ان فلموں کو ریلیز کیا۔یہ وہی فلمیں تھیں جو اُنہوں نے تاج محل بینرس کے تلے بنائی تھیں۔یہ فلمیں پاکستان میں زبردست ہٹ ہوئیں اور نسیم بانو لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن گئیں۔نسیم بانو اپنے بچوں کو لے کر لنڈن چلی گئی اور وہاں اُن کی پڑھائی کا انتظام کر دیا۔وہ تھوڑے عرصے کے لئے وہاں رکی۔اُس کے بعد بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اُس نے اپنی ماں کو سونپ دی ۔احسان میاں چونکہ شادی سے پہلے کنسٹریکشن کے کام سے منسلک تھے اس لئے پاکستان میں بس جانے کے بعد اُسنے یہی کام شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اُس نے بڑے بلڈروں میں اپنی جگہ بنالی۔میاں بیوی کے بیچ اتنی خلیج پیدا ہوئی تھی کہ برسوں تک وہ ایک دوسرے سے غافل رہے۔سائرہ جی جب سولہ سال کی ہوئی تو اُس کی تمنا بھی فلموں میں کام کرنے کی تھی۔نسیم بانو نے اُس کے شوق کو دبایا نہیں بلکہ اُس کی حوصلہ افزائی کی اور اُسے ڈانس کی اچھی تربیت دلائی۔بہت جلد اُس نے بھارت ناٹیم میں اچھی خاصی مہارت حاصل کی۔نسیم بانو نے ششا دھر مکھر جی سے رجوع کیا۔ایس مکھر جی کے ساتھ اُن کے گھریلو مراسم تھے۔نسیم بانو نے ایس مکھر جی سے کہا کہ وہ سائرہ جی کو فلم میں چانس دیں تو ایس مکھر جی نے اُس کی بات ٹالی نہیں بلکہ سائرہ بانو کو لے کر اُس نے رنگین فلم بنانے کا اعلان کر دیا جس کا نام ''جنگلی'' تھا۔سائرہ بانو کے مدمقابل شمی کپور تھا فلم کی ساری شوٹنگ کشمیر کی حسین وادیوں میں پوری ہوئی۔فلم کا سنگیت شنکر جے کشن نے تیار کیا تھا۔فلم جب ریلیز ہوئی تو اس فلم نے باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔اس فلم سے سائرہ بانو کو بھی بیوٹی کوئن کا خطاب ملا۔

نسیم بانو،سائرہ بانو کی کاسٹیوم ڈیزائنر بن گئیں۔مطلب یہ کہ وہ اپنی بیٹی کی فلموں میں کردار کے حساب سے کپڑے ڈیزائن کرتی تھیں۔بھائی سلطان احمد نے سیکرٹری کا فریضہ انجام دیا۔سائرہ بانو پہلی فلم کے بعد ہی اسٹار بن گئی تھی۔وہ اس فلم کے بعد ٹاپ کی ہیروئنوں جیسا معاوضہ پانے لگی۔اسی بیچ انڈسٹری میں یہ افواہ پھیل گئی کہ اُس کا رومانس ایکٹر راجندر کمار کے ساتھ چل رہا ہے۔راجندر کمار شادی شدہ تھا اور اُس کے کئی بچے بھی تھے۔ماں کو جب اس بات کی بھنک لگی تو اُس کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔اُس کے لئے لڑکے کی تلاش ہونے لگی۔کہا جاتا

ہے کہ نسیم بانو نے ہی دلیپ کمار صاحب کو فون کر کے اُن سے پوچھا کہ کیا وہ اُس کی بیٹی سے شادی کرنے کے لئے تیار ہے۔ قسمت کا کھیل دیکھئے۔ دلیپ صاحب اور وحیدہ رحمان فلم ''دل دیا درد لیا'' کی فلمبندی کے دوراں کافی قریب آ گئے تھے۔ وہ شادی کرنا چاہتے تھے۔ دلیپ صاحب نے ایک دن اُس سے کہا کہ وہ رات کو اُس کے یہاں ڈنر کر لیں گے اور وہیں پر فیصلہ لیں گے۔ وحیدہ رحمان کینڈل ڈنر پر بیٹھ کر دلیپ صاحب کا انتظار کرتی رہی۔ دلیپ صاحب مدراس پہنچ چکے تھے۔ اگلے روز اُنہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ سائرہ بانو سے شادی کرنے والے ہیں۔ وحیدہ رحمان اس فیصلے سے سکتے میں آ گئی۔ دلیپ صاحب اور سائرہ جی کی عمر میں بائیس برس کا فرق تھا۔ اس کے باوجود دونوں نے شادی کر ڈالی۔ نسیم بانو نے فلمی میگزین ''اسٹار ڈسٹ'' کو دئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ یہ خبر سن کر بھونچکی رہ گئی کہ یہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔ ایک بات کا اُسے اطمینان تھا کہ دلیپ کمار ابھی تک کنوارا ہے اور وہ بہت دنوں سے اُس کی بیٹی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اُس کے اس دعوی کو بمبئی کے سب سے مقبول اور موقر انگریزی اخبار نے غلط ثابت کر دیا تھا۔ اس اخبار کی رپورٹ کے مطابق نسیم بانو نے ان دونوں کو ملانے اور ان کی شادی کرانے میں مدد کی تھی۔

شادی کے چند سال بعد دلیپ صاحب اپنے سسرال میں ہی رہنے لگے۔ حالانکہ اُن کا بنگلہ سائرہ جی کے بنگلے سے دو کوس دور تھا۔ وہاں پر تب اُن کے بھائی بہن رہتے تھے۔ سائرہ جی کا بھی بھرا پرا پریوار تھا۔ اُن کی نانی تھی، اُن کی ماں تھی، اُن کا بھائی اور بھابی بھی اُسی بنگلے میں رہتا تھا۔ بڑی رونق رہا کرتی تھی بنگلے میں۔ اماں جی (شمشاد بیگم) سے میرا سامنا بہت کم ہوا جب کہ آپا جی (نسیم بانو) سے ہر روز ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک بجے کے قریب نیچے لنچ کرنے آیا کرتی تھیں۔ ہال سے ملحق ہی ڈائننگ روم تھا اس لئے ساری فیملی ایک ساتھ لنچ کرتے تھے۔ آپا جی کے سامنے جب بھی میں جاتا تھا تو سائرہ جی کو ہر بار میرا تعارف کرانا پڑتا تھا۔ آپا جی پیری کے عالم میں تھی مگر بوڑھاپے میں ہو کر بھی وہ جوان لگ رہی تھی۔ وہ جب بھی نیچے آتی تھی تو اچھی طرح تیار ہو کے آتی تھی۔ اس خاندان کے بارے میں ایک چیز کی تعریف کرنی پڑے گی۔ وہ صحت کے بارے میں ہمیشہ محتاط رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن دلیپ صاحب نے مجھے بنگلے پر بلایا۔ وہ نیچے ہال میں بیٹھے تھے۔ اُن کے سامنے کاغذات کا ایک ڈھیر لگا تھا اور اُن کا سیکرٹری اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ آپ جان (سیکرٹری) کے ساتھ بیٹھ کر ان کاغذات کو دیکھ لیجئے اور ان میں جو غیر ضروری کاغذات ہیں اُنہیں ضائع کر دیجئے۔ ہم دونوں ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر ان کاغذات کو دیکھنے لگے۔ آدھے گھنٹے کے بعد آپا جی نیچے آ گئیں۔ جان نے آپا جی کو دیکھ کر ترت پھرت کاغذات وہاں سے سمیٹ لئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ڈائننگ ہال سے باہر لے گئے۔ ہم دونوں جا کر ہال میں بیٹھ گئے۔ جان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ابھی نوکروں کی فوج آئے گی اور ڈائننگ ٹیبل کو ڈیٹول اور صابن سے دھویا جائے گا۔ میں نے حیران ہو کے پوچھا۔ ایسا کیوں؟ تو جان مسکرا کر بولا کہ ہم دونوں وہاں بیٹھے تھے نا۔ پتا نہیں ہم کیا کیا جراثیم وہاں چھوڑ کے اُٹھے۔ پانچ منٹ بعد سبھی کرسیوں اور ٹیبل کو پہلے ڈیٹول سے صاف کیا گیا۔ پھر صابون کے پانی سے انہیں دھویا گیا۔ تب جا کے وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ اُن کے بنگلے پر ایک لڑکا کام کر رہا تھا۔ ایک بار اُسے کھانسی زکام ہو گیا۔ یہ کرونا کے وجود سے برسوں پہلے کی بات ہے۔ جب وہ زیادہ کھانسنے لگا تو گھر میں آپا دھاپی مچ گئی۔ گھر کے سبھی افراد کمروں میں چھپ گئے اور اُسے یہ کہہ کر گھر بھیج دیا گیا کہ فی الحال وہ گھر پر جا کر آرام کرے۔ جب اُس کی طبعیت ٹھیک ہو جائے گی تب وہ ڈیوٹی پر آ جائے۔ نوکر خوش ہو کے اپنے گھر چلا گیا۔ اُسے اس کھانسی کی بدولت کئی دنوں کی چھٹی مل گئی تھی۔

احسان میاں اور آپا جی کے تعلقات کشیدہ رہے۔ ایک مرتبہ وہ پاکستان سے بمبئی آ گئے۔ وہ جب بنگلے میں وارد ہوئے تو کسی نے اُن کا خیر مقدم نہیں کیا۔ بیوی تو بیوی بچوں نے بھی اُن کی آمد پر کوئی خوشی ظاہر نہ کی۔ معاملہ اتنا گھمبیر ہو گیا کہ دلیپ صاحب کو اسے سنبھالنے کے لئے خود میدان میں اُترنا پڑا۔ اُنہوں نے احسان میاں کی خوب دلجوئی کی اور رات کو اُنہیں اپنے بیڈ روم میں سلایا۔ وہ دل برداشتہ ہو کے ایک دو دن کے بعد واپس لوٹ گئے۔ اس واقعے کے چند سال بعد دلیپ صاحب اور سائرہ جی کا پاکستان جانا ہوا۔ وہاں اُن کی ملاقات احسان میاں سے ہوئی۔ اُن کے ٹھاٹ دیکھ کر سائرہ جی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ احسان میاں نے جس طرح اُن کی خاطر داری کی اور دونوں کو تحفے تحائف سے لادا وہ سب دیکھ کر سائرہ جی کا من پگھل گیا۔ اگلی بار جب وہ بمبئی آئے تو گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ اس بار گھر کے سبھی افراد اُن کی آمد پر چشم براہ تھے۔ اس بار اُن کی خاطر داری میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ دلیپ صاحب اپنی مرسڈیز میں میاں بیوی کو بٹھا کر سیر پر بھیج دیتے تھے۔ اس بار اُن کا گھر ہی نہیں اُنکے دل بھی کھلے تھے۔ پرانے شکوے شکایتیں سب دور ہو گئی تھیں۔ بچوں کے دلوں میں اپنے والد کے لئے پیار کا ساگر اُمڈ پڑا تھا۔

نسیم بانو (آپا جی) بھرپور زندگی جئیں۔ اُنہوں نے بچپن سے لے کے مرتے دم تک ایک خوشحال زندگی گزاری۔ نسیم بانو کا انتقال 8 جون 2002 پچاسی سال کی عمر میں ہوا۔ اُنہیں شانتا کروز قبرستان میں دفنایا گیا۔

''مشورہ''

موجود دور میں ڈپریشن اور فرسٹریشن بہت بڑھ رہا ہے۔۔۔
میرا مشورہ ہے کہ کام کاروبار اور فیملی کو وقت دینے کے بعد جو وقت بچے وہ خبریں اور سیاسی تجزیے و تبصرے سننے کی بجائے کتابیں پڑھنے، شاعری سننے اور میوزک سننے میں گزاریں۔

## رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

**وجیہہ الوقار**

(راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے 'چہارسُو' میرے پسندیدہ مجلوں میں شامل ہے۔ اس کی اشاعت کے ضمن میں آپ کی لگن، محبت اور محنت لائقِ ستائش ہیں۔ آپ کا ذوق بھی قابلِ داد ہے۔ تازہ شمارہ میرے لیے دہری خوشی لایا۔ اس میں آپ نے میری کاوشوں پر مبنی ایک حصہ مختص کر کے جو عزت افزائی کی ہے اس پر میں آپ کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ ناچیز نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی ڈرامے بھی لکھے اور تراجم بھی کیے۔ آپ نے انتخاب کرتے وقت ان تمام کاوشوں کو مدِ نظر رکھا اور عمدگی سے ان کا احاطہ کیا۔

دوسرے حصے میں معتبر لکھنے والوں کی بہت عمدہ تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کا مطالعہ کرتا رہوں گا۔ 'چہارسُو' کے بارے میں یہ صرف میرے تاثرات نہیں ہیں؛ میرے کئی دوستوں نے خاص طور پر فون کر کے یا میسیج بھیج کر تعریفی کلمات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں دو ایک ایسے بھی ہیں جن کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ کبھی ایسا رسالہ شائع کریں۔ ادب دوست احباب کے لیے 'چہارسُو' ایک تحفے سے کم نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ثابت قدمی سے اس کی اشاعت جاری رکھیں گے۔ آپ کے لیے بہت سی نیک خواہشات اور دعائیں۔

باصر سلطان کاظمی

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب، سلامِ احترام۔

اپنے عصر کے منفرد اور باکمال شاعر جناب ناصر کاظمی کے فرزند ارجمند جناب باصر کاظمی کی ہمہ جہت شخصیت سے معمور چہارسو دیکھ کر طبیعت کِھل اٹھی۔ کیا کہنے صاحب بہت عمدہ اور نفیس ادبی دستاویز ہے۔ باصر صاحب کے کمالات کے ساتھ افسانے، ناول، ایک صدی کا قصہ اور شاعری کا انتخاب بھی اعلیٰ معیار کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ہمیشہ کی طرح ''رس رابطے'' کو گزشتہ خاص اشاعت کا تتمہ کہنا چاہیے۔ احباب نے جس محبت سے اس عاجز راقم کو یاد کیا اس سے دل و دماغ مسرور اور سرشار ہے۔

جمیل احمد عدیل (لاہور)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

ابھی ابھی تازہ چہارسو کا تحفہ ہمہ دست ہوا۔ واہ، واہ بہت خوب! آپ کی محنت نے کمال کر دیا مبارک ہو۔ جناب ناصر کاظمی اردو شاعری کا سدا بہار نام ہے۔ شومئی قسمت کہ ہم محترم باصر کاظمی سے اتنا واقف نہیں تھے۔ چہارسو نے ایک بہت بڑے باپ کے بڑے بیٹے کے ہنر اور فن کو جس خوبصورتی سے پیش کیا وہ نہ صرف لائق داد بلکہ لائق قدر بھی ہے جس کے لیے ہماری جانب سے ادارہ چہارسو کے تمام اراکین بالخصوص مدیر مسئول گلزار جاوید صاحب کے لیے زبردست خراج تحسین و عقیدت۔ آپ کی زبردست محنت و معیار کے قائل پہلے بھی تھے مگر زیرِ نظر شمارہ دیکھ کر مزید ہو گئے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے

عذرا پروین (لکھنؤ)

برادرم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

ماہِ رمضان کی مبارکباد۔ گذشتہ دنوں امریکہ سے آئے ہوئے ہمدمِ دیرینہ جمیل عثمان اور ان کے عزیز مظہر امام کے ساتھ آپ سے طویل ملاقات بڑی خوب رہی جس میں ہونے والی گفتگو کی خوشبو تا حال تر و تازہ ہے۔ اس گفتگو میں زیادہ خوشبو آپ کی باتوں اور میزبانی کی تھی اس لیے اس مناسبت سے یہ مصرع آپ کی نذر: ''اُن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو''۔ جی چاہتا ہے کہ زیادہ ملاقاتیں ہوں مگر اس میں سفر کرنا پڑتا ہے جو مرورِ وقت کے ساتھ مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

تازہ شمارہ ''باصر کاظمی نمبر'' موصول ہوا۔ باصر کاظمی بہت اچھے شاعر، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار ہیں مگر ادبی کائنات میں کم کم دکھائی دیتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کا بیرونِ ملک قیام اور ''پی آر'' کے کارِ بیکار میں وقت ضائع نہ کرنا ہو۔ میری خوش قسمتی کہ چند برس پہلے ان سے راولپنڈی میں ایک ملاقات بھی ہو چکی ہے، بہت نفیس اور نستعلیق لگے۔ اب ان کا انٹرویو اور ان کے بارے میں شائع ہونے والے مضامین پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ہمیشہ کی طرح آپ نے ایک جینوئن قلمکار کو قرطاسِ اعزاز کے لئے منتخب کیا ہے۔

امجد اسلام امجد مرحوم کی یاد میں آپ نے اس کی نظم ''اگر کبھی میری یاد آئے'' شائع کر کے اس کی یادیں تازہ کر دی ہیں۔ کیسا زرخیز اور تخلیقی شاعر تھا کہ غزل بھی خوب کہی اور ساتھ ہی ساتھ نظم کو بھی اتنی ہی مقبولیت دی۔

جناب نبیل احمد نبیل کا یہ نعتیہ شعر بہت اچھا لگا:

یہ عجز و فقر کی دولت، سکونِ قلبِ ملول
زہے نصیب کہ اُس بوریا نشیں سے ملا

کچھ غزلوں کے منتخب اشعار بھی داد کے طور پر دُہراتا چلوں:

قہقہے، گفتگو، دھوئیں کے غبار
بھول بیٹھے ہیں چائے خانے لوگ

(ملک زادہ جاوید)

ایوانِ اقتدار سے نکلے تو آ بسے
بے خانماں خراب مضافات کے قریب

(اشرف جاوید)

جو تم یہاں وہاں آنسو بہائے پھرتے ہو
تمہیں نہیں ہے میسّر کسی کا شانہ کیا؟

(خورشید طلب)

زلف بکھرے یا پھر سنور جائے
ذکر تیرا غزل میں آتا ہے
(ارشد سعید)

اس اہتمام سے چارہ گری نہیں ہوتی
جس اہتمام سے میّت اٹھائی جاتی ہے
(سہیل اقبال)

نہ اب وہ فکر و عمل ہے نہ لفظ کی حرمت
وقارِ لوح و قلم کس طرح بڑھایا جائے
(نوید سروش)

چھوڑ کر مجھ کو جا بھی سکتا ہے
یار ہے، یارِ غار تھوڑی ہے
(ندیم راجا)

ممکن ہی نہیں خود کو مَیں کر پاؤں مکمل
اک بار جدا مجھ سے تری ذات ہوئی تو
(صائم بلتستانی)

مکانِ دل تو میاں اپنے انہدام کو ہے
کہاں بٹھائیں گے اس کو اگر مکیں آیا
(علی قائم نقوی)

دوپٹہ لے کے چلنا بھی ہے مشکل
ہوائے شہر کا کیسا چلن ہے
(سبھاش گپتا شفیق)

مجھ میں چودہ چراغ جلتے ہیں
روشنی میرا خاندان ہوئی
(وسیم عباس)

جناب تابش خانزادہ مختصر افسانے میں گہری بات کہنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں، ''ترازو'' میں وہ دو مخلص دوستوں کے جذبۂ ایثار اور قربانی کا پیغام دیتے ہوئے آج کل کی دوستیوں کے عارضی پن کا ذکر بھی کر رہے ہیں۔ اپنے خط میں انہوں نے ایک معروف فلسفی اور مصنف کہلیل جبران کو اردو میں غلط طور پر خلیل جبران لکھنے کی خوب نشان دہی کی ہے، اور کسی کے نام کو بگاڑ کر لکھنے کو بجا طور پر غلط ٹھہرایا ہے۔

''پیرزادہ جی'' کے ناول ''خاکِ شفا'' کی گیارھویں قسط بھی پڑھی اور حیران ہوا کہ ''اُن'' کا زرخیز قلم کیا کیا رنگ بکھیر رہا ہے۔ میں یہ تمام قسطیں جمع کر رہا ہوں کہ پورا ناول پڑھنے کے بعد اس پر کچھ لکھنے کی کوشش کروں، اگرچہ ناول اور افسانوں کے بارے میں میری رائے یا تبصرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ (جلد ۳۲، شمارہ: مئی جون ۲۰۲۳ء) اپنی انفرادیت اور اعلا نگارشات سے آراستہ مطالعے میں ہے۔ اس بار قرطاسِ اعزاز معروف و مقبول شاعر ناصر کاظمی کے صاحبزادے مشہور شاعر و ادیب باصر سلطان کاظمی کے نام ہے۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے منفرد اور تہہ دار سوالات اور باصر صاحب کے تفصیلی جوابات اور کچھ سوالوں کے جواب میں اہلِ قلم کے مضامین میں سے اقتباسات دے کر فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا۔ بیت بازی سے شعر و سخن سے ابتدائی غزلوں کی حوصلہ افزائی، ناصر کاظمی کی ہدایت اور بڑے باپ کا بیٹا ہونے کے سبب اپنی جگہ بنانا مشکل مگر انہوں نے اپنی جگہ بنائی۔

بنانی پڑتی ہے ہر شخص کو جگہ اپنی
ملے اگرچہ بظاہر بنی بنائی جگہ

باصر صاحب کی شاعری کے علاوہ ڈرامے ''بساط'' پر اہلِ قلم و فن نے تعریف کی ہے۔ محمد انعام الحق نے ''تخیل کی سیر'' باصر صاحب کی سوانحی خاکہ سرگرمیاں اور کامیابیوں کی طویل فہرست کو سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ فاری شانے ''موجِ خیال'' سینن کے اعتبار اور مختلف مجموعوں سے خوب صورت انتخاب پیش کیا ہے۔ بارہا تحسین۔

''خاکِ شفا'' کی موجودہ قسط خاص طبقوں کے حوالے سے معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ قسط ۱۸۵۷ء کے بعد کے زمانے کے واقعات کے پس منظر سے شروع ہوتی ہے۔ آسیہ خاتون میواتی المعروف اماں بی کی جدوجہد، ہمت، جرأت اور استقامت پھر گرفتاری کے بعد ضمانت کے لیے ایک ہجوم کا جمع ہونا جس میں بنا رنگ و نسل مذہب و قوم جوق در جوق اپنے گھروں سے نکلنا۔ اُن کے لیے دعائیہ محفلوں کا انعقاد جس میں حمد و نعت، منقبت، سلام، میلاد و قصیدہ شریف اور درود شریف کا ورد اور آخر میں پُر اثر دعا۔ سبیلیں، پانی اور بٹھانے کا معقول انتظام۔ کیا منظر پیش کیا کہ لگتا ہے ہم اسی ہجوم یا محفل کا حصّہ ہیں۔ دوسرا حصہ ہیں۔ دوسرا حصہ شاہ برادران کا عدالتوں کا سامنا۔ نقلی پیران اور آستانوں کا خاتمہ، پولیس بھتہ، خاندان میں اتفاق، محمود میواتی وکیل کی شہرت، صوفی عبد الکریم کی بقراطی اور مولوی علی بخش کی نوک جھونک، آپ نے داغ کا شعر کیا چسپاں کیا ہے:

ہزاروں کام محبت میں ہیں مزے کے داغ
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

اُس عہد کی بارات، منظر اور باراتیوں کے لیے مختلف رنگا رنگ تقریبات، بائیوں کی آمد، گویوں کی آمد اُن کے نام چھمو بائی کلکتے والی، زہرا بائی انبالے والی، خوشتر بائی پٹیالے والی، استاد بنّے خان، استاد مٹھے خان، استاد لسّل خان، استاد چھجو خان اور ہم نوا، مسخروں، بہروپیوں اور جادوگروں کے تماشے، ناشتے، ظہرانے اور عشائیے کے جو کھانوں اور اُن کے ساتھ لوازمات کے نام لکھے ہیں کمال ہے۔ آپ نے اُس عہد کی تہذیب و ثقافت کو اپنے اندر اُتار کر نذر

قرطاس کیا۔ ابصار حسین بمقابلہ نواب شوکت علی خان کی عجیب کہانی اور اس کہانی پر آرٹ فلم بنانی چاہیے۔ اپنے گہرے مطالعے اور مشاہدے کو کس مہارت سے فن پارے میں منتقل کر رہے ہیں۔ بہت خوب۔ زبردست۔

قمر جمالی کا افسانہ ''مدراپی کرمت ناچو سادھو رام'' مختصر زبردست کہانی ہے جس میں طوفانی محبت کے بعد ملاپ، خوابوں کا چکنا چور ہونا۔ ہیرو سے زیرو بننا قبول نہیں۔ سادھو رام شراب میں سکون تلاش کر لیتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں سے فرار جس کا سماج بھی قصوروار ہے۔ رخشندہ روحی کا افسانہ ''بڑا آدمی'' ایک مضبوط اور منفرد افسانہ ہے۔ ارم رحمان کا افسانہ ''ناجائز'' جرأت مندانہ کوشش ہے۔ ایک عجیب کیفیت اور مختلف حقیقت کا افسانہ ہے۔ ساتھ رہنے سے ناپسندیدہ چیز بھی قبول ہو جاتی ہے۔ آخر سطر پوری کیفیت کے ساتھ نچوڑ ہے۔

''حمید صاحب سے کہنا اگلی بار پیسے نہ بھیجیں میں ان سے لینے آؤں گی''ص۔۸۳

اب آگ منتقل ہو گئی ہے۔ حمید کا کردار بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ بہت خوب۔ شکیل احمد خان اور شہناز خانم عابدی کے افسانے بھی متاثر کرتے ہیں۔

معین نظامی تلمیحات سے پُر مکالماتی غزل (جس تشبیہ واستعارہ رمز وکنایہ) لاجواب ہے ہر شعر داد کا مستحق ہے۔

میں نے کہا تھا اب کیا دشمن سر پر آ پہنچا ہے
اس نے کہا تھا غار کے منہ پر لاکھوں جالے تنے ہوئے ہیں
(معین نظامی)

پوری غزل میں فنی مہارت سے ہجرت کے واقعے کو نظم کیا ہے۔ ملک زادہ جاوید، اشرف جاوید، نسیم عزیزی، عادل راہی، طارق تاسی، ڈاکٹر ریشما قمر، شاہد رضوان اور لاریب رحمان کی غزلوں کے اشعار متاثر کرتے ہیں۔ ایک صدی کا قصہ میں دیپ کنول نے اپنے خاص انداز میں دوسری بولتی فلم کے خالق اردشیر ایرانی کی مسلسل محنت اور کامیابیوں کی کہانی بیان کی ہے۔ ماسٹر وٹھل کا کیس محمد علی جناح نے لڑا اور جیتا تو وہ عالم آرا فلم میں کام کرنے کے قابل ہوئے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ جناب ناصر کاظمی کے فرزندِ ارجمند جناب باصر سلطان کاظمی سے منسوب ہے جن کے گھرانہ میں عمدہ ادب اور کلام ایک نسل سے دوسری نسل کو ورثہ میں مزید ترقی پا کر منتقل ہوا ہے۔ باصر کاظمی صاحب کی شاعری اور ادبی خدمات شاندار اور لاجواب ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام کے علاوہ لاتعداد غزلوں اور نظموں کے انگریزی تراجم کیے۔ بیرونِ ملک لاتعداد مشاعروں میں شرکت فرمائی۔ ڈرامے سٹیج ہوئے۔ مجموعہ کلام شائع ہوئے۔ ان کا ایک خاص اعزاز یہ بھی ہے کہ وہ واحد اور پہلے پاکستانی ہیں جنہیں برطانیہ میں رہتے ہوئے ملکہ الزبتھ کی طرف سے ان کی خدمات کے اعتراف پر Member of the Order of the British Empire (MBE) کے اعزاز سے نوازا گیا جو انہوں نے ملکہ کے شوہر ڈیوک آف ایڈنبرا سے بکنگھم پیلس میں برطانیہ کی شاعری Celebrate کرنے کے لیے منعقدہ کردہ تقریب اعشائیہ میں وصول کیا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ موصوف باصر کاظمی واحد شاعر اور ادیب ہیں جنہیں انگریزی کے علاوہ کسی زبان میں کام کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے اعزاز دیا۔ بلاشبہ باصر کاظمی صاحب اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے چہارسو کا شمارہ ان سے منسوب کیا جائے۔

شمارہ میں اچھے افسانے، شاعری اور مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ تابش خانزادہ کا افسانہ ''ترازو'' مختصر مگر دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ کہانی میں ایک مثال کے ذریعہ انہوں نے واضح کیا ہے کہ لازوال دوستی کے لیے کون سے عناصر لازمی ہوتے ہیں۔ ''انا کی قیمت'' رعنا کوثر نے اپنے افسانہ میں مشرقی روایات کا عکس نمایاں کیا ہے۔ یہ روایات عموماً ہمارے ذہنوں میں ایسی رچ بس گئی ہیں کہ ہم مشرق میں زندگی گزار رہے ہوں یا مغرب میں یہی روایات اور ان کے جذباتی نتائج گاہے بہ گاہے دیکھنے اور سننے میں آتے رہتے ہیں۔

رخشندہ روحی کا افسانہ ''بڑا آدمی'' ماں باپ اور اولاد کے درمیان دائمی اور حقیقی محبت اور جذباتی تعلق کا عکس ہے جو عموماً بیان نہیں کیے جاتے لیکن جب والدین ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتے ہیں تو وہ کیفیت ناقابل برداشت اور انتہائی غمناک ہوتی ہے۔ ''تنہائی'' ڈاکٹر شہاب افسر خان نے اپنی کہانی میں حقیقی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور صورتِ حال کی ایک جذباتی اور افسوسناک تصویر بیان کی ہے۔ ایک گاؤں کے خان بہادر صاحب جن کے پاس دولت، زمین اور ملازمین کی کوئی کمی نہ تھی ان کی بیگم جب وفات پا گئیں تو ان کے بیٹے ان کے ساتھ گاؤں میں رہنے کو تیار نہ ہوئے بلکہ انہیں وہیں اکیلا چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شہروں میں منتقل ہو گئے جبکہ خان بہادر صاحب نے تنہائی کے باوجود شہر منتقل ہونا پسند نہ کیا۔

مطمئن ہو دل تو ویرانوں کے سناٹے بھی گیت
دل اجڑ جائے تو شہروں میں بھی تنہائی بہت

خان بہادر صاحب جنہیں اپنی اہلیہ سے بے حد محبت تھی بھرے گاؤں میں مال و دولت ملازمین کے باوجود نجی زندگی میں تنہائی کا شکار تھے۔ ایسی صورت حال میں بیٹوں، پوتے پوتیوں سے دور کرب میں زندگی گزارنا انتہائی تکلیف دہ تھا۔ وہ اکثر دیوار پر اپنی مرحومہ بیگم کی لٹکتی ہوئی تصویر کے سامنے گھنٹوں محوِ گفتگو رہتے اور تصور میں اپنی باتوں کا جواب بھی سنتے رہتے۔ اولاد کو چاہیے کہ اپنے ماں باپ کی پرسکون زندگی کی خاطر ہر طرح سے ان پر آخر دم تک بھرپور توجہ دیں۔

''خاکِ شفا'' پیرزادہ آل انوار صاحب کا ناول نئی قسط میں دلچسپ معلومات اور واقعات لیے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ مزید ارکھانوں کی طویل فہرست جو ہم نے بھی اچھے سے اچھے ہوٹل پر بھی نہیں دیکھی۔ چھمو بائی کلکتہ والی کے دلچسپ قصے پڑھتے پڑھتے قاری ناول میں کھو جاتا ہے۔

شاعری میں نسیمِ سحر، نبیل احمد نبیل، برج نارائن، اشرف جاوید،

خورشید طلب، امجد اسلام امجد، شاہد رضوان، سید انوار زین کا کلام خصوصی طور پر متاثر کن ہے۔اس سارے ادبی مواد کو یکجا کر کے ایک خصوصی انداز میں ''چہارسُو'' میں پیش کرنے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

باصر کاظمی کا شمارہ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔آپ کے سوالات بھی انفرادی نوعیت کے ہوتے ہیں اور باصر کاظمی صاحب نے جواب بھی دلچسپ دیے۔''مانوس اجنبی'' کہانی پڑھ کر اندازہ ہوا کہ مغربی ادب کا کافی اثر اُن کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ناصر صاحب کے سائے میں انہوں نے پرورش ضرور پائی مگر دونوں کا انداز بیان مختلف ہے۔ایک اچھے ادبی شخصیت سے بھرپور تعارف کرانے کا بے حد شکریہ۔

شمارے میں شامل سبھی افسانے الگ الگ رنگ کے ہیں اور سبھی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ اہم سماجی مسائل سے پردہ اٹھاتے ہیں۔شہناز خانم عابدی، قمر جمالی، شکیل احمد خان، پرویز شہریار، رخشندہ روحی، رعنا کوثر، شہاب افسر خان اور ارم رحمان، تابش خانزادہ صاحب کو میری جانب سے دلچسپ افسانے تحریر کرنے کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

امیر مینائی پر لکھا فیروز عابد کا مضمون بھی دلچسپ ہے۔کمال کے اشعار اس میں شامل ہیں۔

''خاکِ شفا'' کی بات کریں تو اس بار کا باب بھی بہت سی نئی باتیں سامنے لے کر آیا ہے۔امّاں بی کا جنگ آزادی میں حصہ اُس وقت کی عورتوں کی ہمت اور دلیری کا ثبوت ہے۔قصیدہ بردہ شریف مجھ سے پڑھا تو نہیں گیا مگر اُسے جتنی بار سُنا ہے، دل کی کیفیت الگ ہی محسوس کی۔زبان و بیان منفرد ہے۔امیر خسرو کا کلام اور نظیر اکبر آبادی کی طویل نظم بھی خوب رہی۔پیری کا دھندہ، شادی کے میلے جیسا ماحول، مختلف اقسام کے لوازمات، مختلف شربت، اتنی تفصیل پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور جانکاری میں اضافہ بھی۔چھمو بائی کا قصّہ جس موڑ پر ختم ہوا اس نے آئندہ قسط کے لیے اشتیاق اور بڑھا دیا۔

اس مرتبہ بھی ایک نہیں دو دو انٹرویو کا لطف اٹھایا۔رنگ کی گفتگو میں سوالات بھی بڑے پُرمعنی تھے اور وشو ہندو پریشد کے صدر کے جوابات بھی لاجواب تھے۔یہ انٹرویو وقت کی پکار تھا اور اُمید ہے اسے پڑھ کر بہت سے لوگوں کے دلوں میں اٹھنے والے شبہات کا سلسلہ لازمی طور پر ختم ہو جانا چاہیے۔

حسب معمول شاعری کا حصہ بھی معیاری ہے۔ایک صدی کا قصہ ابھی پڑھنا ہے۔فلرز اس بار کچھ کم لگے۔وقت سے پہلے شمارے کو منظر عام تک لانے کے لیے بے حد شکریہ۔اللہ تعالیٰ آپ کو صحت یاب رکھے اور آپ کی اس لگن سے نئی نئی نایاب شخصیات سے ہمارا تعارف کراتے رہیں۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو جیسے ہی موصول ہوا فوراً ہی پڑھ لیا کیونکہ رمضان شریف کا مہینہ بہت قریب تھا۔سوچا کہ پھر وقت نہیں ملے گا اور واقعی رمضان میں ایسی مصروفیت ہوئی کہ مکتوب لکھنے کا موقع نہیں ملا۔اب لکھ رہی ہوں جبکہ رمضان کی بائیس تاریخ ہے۔باصر کاظمی جو کہ ناصر کاظمی کے صاحبزادے ہیں ان سے مکمل آگہی حسب معمول براہِ راست کے ذریعے ہوئی۔یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ان کے اشعار لندن میں مینکزی سکوائر میں انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیے گئے ہیں۔اور ملکہ برطانیہ کی جانب سے اعزاز برائے ادب ملا۔پاکستانی قوم کے لیے فخر کی بات ہے۔

ناول ''خاکِ شفا'' بہت دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔اماں بی کا خاکہ ابھر کر سامنے آ گیا اور ان کی مقبولیت اس زمانے میں کیا ہوگی۔ناول نگار نے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔پیروں کے اندر کیوں لالچ آ گیا کیوں نسلیں بدل گئیں۔خاکِ شفا کے ذریعے جو سمجھایا جا رہا ہے وہ مصنف کی تاریخ سے آگہی ہے۔

افسانے جو بھی پڑھے بہت اچھے تھے۔شہناز خانم عابدی کا افسانہ وقت پہ ٹل جائے تو۔۔۔دو بہنوں کی نفسیات کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے پسند آیا۔رخشندہ روحی کا ''بڑا آدمی'' یہ سچ ہے گھر والے ہی بڑے آدمی کو نہیں سمجھ پاتے۔تمام افسانوں پر تبصرہ ممکن نہیں۔پڑھے ہوئے تھوڑا وقت گزر گیا ہے۔

امجد اسلام امجد کا ''اگر کبھی میری یاد آئے'' ان کی وفات کے بعد یہ کلام اداس کر گیا۔

چہارسو اور اس کو نہایت خوبصورتی سے سکرین پر اجاگر کرنے والے ہمیشہ سلامت رہیں۔

رعنا کوثر (نیویارک)

## بقیہ : منزلِ حیات

ادھر آنے پر خیال تھا کہ کچھ آزادی میسر آئے گی مگر یہاں پر تو کوٹھڑی کی دیواروں کو مزید تنگ کر دیا گیا تھا اور اسی پر بس نہ کرتے ہوئے تاریکی میں اضافہ کر کے مشقت بڑھا دی گئی تھی۔

وہ سوچنے لگی پنجرے کی صعوبتوں کی عادی تو میں پہلے بھی تھی۔ شادی سے یہ ہوا کہ ایک پنجرے سے نکل کر دوسرے پنجرے میں آ گئی۔ وہ سوچنے لگی جب قید ہی زندگی ٹھہری تو پھر اس سے گھبرانا کیا۔دوسالہ محکومی میں گود ہری نہ ہو سکی تو کیا ہوا۔گرچہ درد کی راہ لمبی ہے مگر آنے والا وقت یقینی طور پر زندگی میں بہار لائے گا اور اس کی زندگی کے باغ میں پھول کھلیں گے اسی امید پر وہ تازہ دم ہو کر جینے لگی۔اور ایام حیات گزارنے لگی کہ کبھی تو ملے گی کہیں تو ملے گی منزل حیات۔

## ..... معراج کے دروازے تک .....

ان دنوں ابھی ہرایرا غیرا کالم نویس نہیں بنا تھا۔ کالم لکھنے والے گنتی کے لوگ تھے۔ میں قریباً سارے اخباروں کے تمام کالم پڑھ ڈالتا تھا۔ اظہر سہیل جنگ میں کالم لکھتے تھے۔ فارسی تراکیب، ادبی چاشنی لیے ان کے کالم ترجیحاً پڑھتا تھا جن میں بین السطور خبریں اور انکشافات بھی بہت ہوتے تھے۔ ہمارے ساتھی عبدالرحمن جامی، اظہر سہیل کے سیاسی موقف سے اکثر متفق نہیں ہوتے تھے لیکن اچھی نثر کے چسکے کی وجہ سے ان کا کالم ضرور پڑھتے تھے۔

شاید ایک ڈیڑھ سال ہوا ہے کہ اظہر سہیل کے صاحبزادے راحیل اظہر علم میں آئے ہیں اور خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی ہے کہ امریکہ جا بسنے کے باوجود وہ والد جیسی عمدہ نثر لکھتے ہیں، فارسی اور کلاسیکی شاعروں سے بھی واقف ہیں۔

فلسطین اور اسرائیل کا ان کا سفرنامہ "معراج کے دروازے تک!" کئی ماہ پہلے شائع ہوا تھا لیکن رہائش بدلی تو یہ بھی بہت سی دوسری کتابوں کے ڈھیر تلے دبا رہا۔ اب ان کتابوں کی باری آئی ہے۔

بہت کم پاکستانی فلسطین/اسرائیل جا سکے ہیں۔ لاہور سے ایک عالم کے جانے کا سنا تھا۔ قدرت اللہ شہاب بین الاقوامی ادارے کے وفد میں شامل ہو کر گئے ورنہ بیشتر دوسرے ملکوں میں آباد دہری شہریت والے پاکستانی ہی جا سکے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ پہلے اداکارہ ریما اپنے امریکی شہریت والے شوہر کے ساتھ گئی تھیں۔ شہاب ظاہر ہے جس وفد میں گئے تھے، اس کے دائرہ کار تک محدود رہے۔ اپنی مرضی سے آزادانہ اسرائیل جا کر سفرنامہ لکھنے والے پہلے تو فاروق خالد میرے علم میں آئے جو ہیں تو لاہوری لیکن ہالینڈ کے شہری کے طور پر سفر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اسرائیلی یہ درخواست بھی مان لیتے ہیں کہ ہمیں پاکستان بھی جانا ہے اسے پاسپورٹ پر داخل خارج کی مہریں نہ لگائیں۔

راحیل اظہر امریکی شہری کے طور پر دوبار قبلہ اول گئے۔ کہتے ہیں ابن انشا کے سوا کسی کا سفرنامہ پڑھنے میں بھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ اب جو کچھ لکھا ہے وہ بھی روایتی سفرنامہ نہیں، ارض فلسطین کا ایک مطالعہ ہے، لوگوں کے رہن سہن، کھانے پینے، خوف اور تعصّبات کا جائزہ ہے۔ اہم جگہوں کی سیر ایک لائق گائڈ کی طرح کرائی ہے۔ قاری فلسطین اور فلسطینیوں کا مسئلہ اور بڑی طاقتوں کے کردار کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔

کتاب میں کیا کچھ ہے وہ آپ فہرست سے بخوبی جان سکتے ہیں۔ پچاس کے قریب تصاویر اور کچھ نقشے بھی کتاب میں شامل ہیں۔ یہ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور نے شائع کی ہے۔

..... طارق منظور

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
اُردو فکشن
M. R. Publications
ہڑپا